

الحاق کشمیر

اسرار احمد آزاد



الحاقِ کستیر

اسرار احمد آزاد

لالہ رخ پبلکیشنز سری نگر کشمیر

تجلی قلم

قیمت :- تین روپے

علاء الدین

۱۶

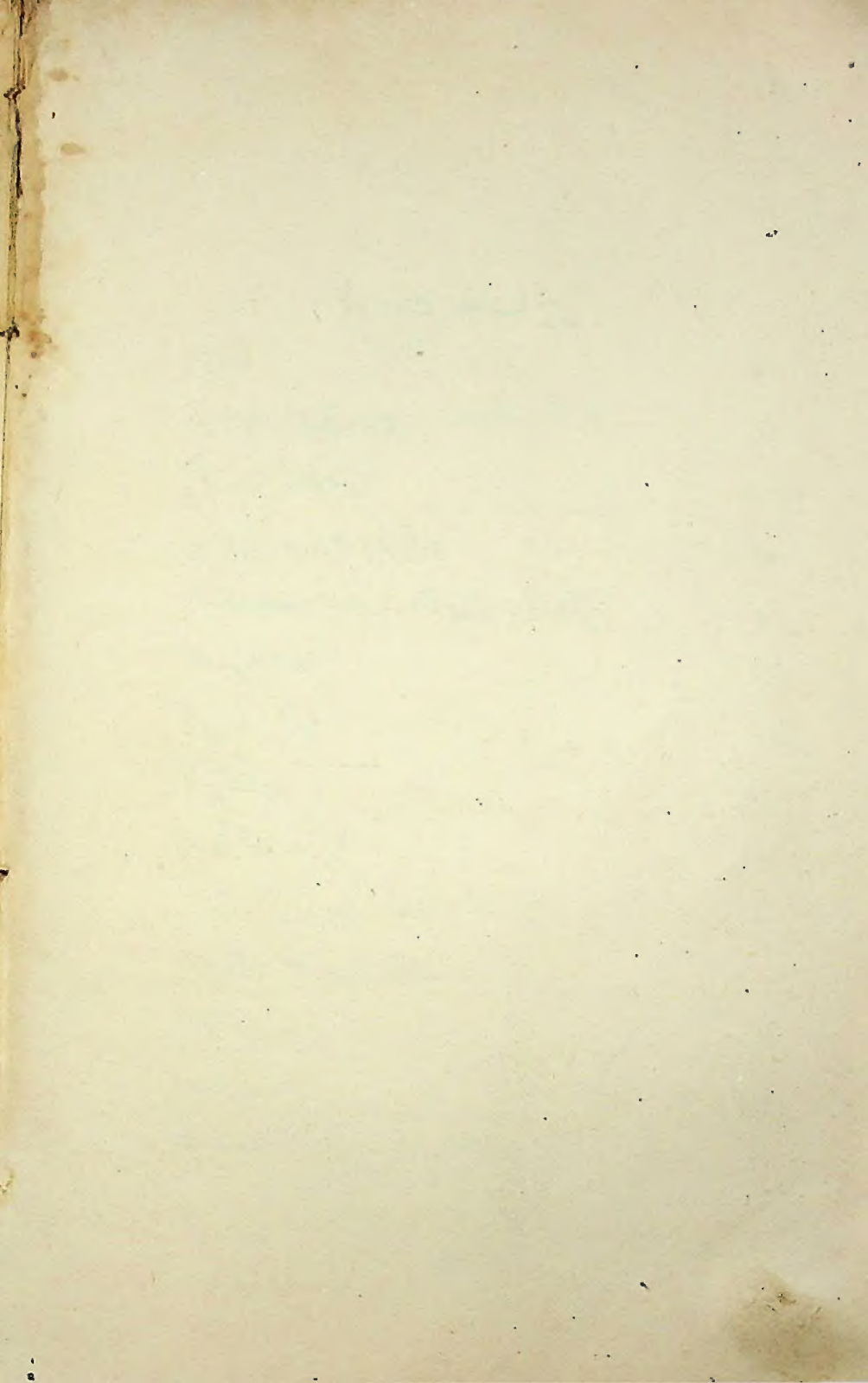
3

100

پبلشر :- لارڈز پبلیکیشنز، ممبئی (مختصر)
پرستار :- ڈوڈلیکس پریس، ممبئی

فہرست مضامین

۵	پیش خط
۱۷	جزا قیائی اور تاریخی حالات
۳۵	سکھ اور ڈوگر اہلومتیں
۵۲	سیاسی بیداری اور عوامی تحریکات
۸۱	پاکستان کا جارحانہ حملہ اور ہندوستان کے ساتھ الحاق
۱۰۸	تنازعہ کی حقیقت
۱۶۷	تصویر کے دور رخ
۱۴۲	مجلس تحفظ میں
۱۵۹	رستانی بحث کے نتائج
۱۷۵	لیکچر کی سرگرمیاں اور جنگ بندی
۲۰۰	عارضی صوبہ کی کوششوں میں ناکامی
۲۲۲	گرگرمیشن
۲۵۴	چار سال کی مدت
۲۹۰	ہندوستان کے موقف کی تصدیق اور استصواب رائے کا سوال



پیش لفظ

ریاست جموں و کشمیر ہندوستان کا ایک لاینفک جزو ہونے کے باوجود اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے ہندیوین کے دوسرے اجزاء میں ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے اور اس کی یہ اہمیت کچھ اسی بات پر منحصر نہیں کہ قسیم ہند کے نازک ترین اور صبر آزمائحات میں اس ریاست کے حکمران، عوامی رہنماؤں اور عوام نے اسے ہندوستان کے ساتھ ملحق کر دیے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کے رہنما اور عوام آج بھی اپنے اس باخ نظرانہ فیصلے پر قائم ہیں یا پھر ہندیوین کے آئین میں اس ریاست کو ایک مخصوص امتیازی درجہ دیا گیا ہے بلکہ اس کی حقیقی اہمیت اس کے اس تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی پس منظر میں پوشیدہ ہے جس نے اسے ہزاروں سال سے مختلف قوموں، تہذیبوں اور مذہبی عقیدوں کا سنگم بنائے رکھا ہے۔ اس کی اسی تاریخی خصوصیت نے اس کے باشندوں کو رواہاری، آزادی، جمہوریت، مساوات اور سکولر ازم کی تعلیم دی ہے اور انھوں نے ہندوستان کے ساتھ لائق کا جو فیصلہ کیا تھا وہ بھی ان کے اسی تاریخی پس منظر پر مبنی ہے۔

کسی ملک کی تاریخ کو اگر اس ملک کے باشندوں کے قومی کردار کو تشکیل اور تعمیر میں کوئی دخل ہو تو ہے تو پھر کشمیر کا تمام تر ماضی اور حال بھی تاریخ کے اسی عمل سے متاثر نظر آتا ہے اور کشمیر کے باشندے پچھلی تین دہائیوں سے اپنے جس قومی کردار کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں اس میں بھی یہی تاریخی عوامل و اسباب کارفرما رہے ہیں۔

کشمیر کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں چار ہزار سال تک خود وہاں کے باشندوں کی حکومت قائم رہی تھی۔ اس مدت میں اس کے بعض حکمران اس دادی ہی پر نہیں بلکہ اس کی سرحدوں کے پار ہندوستان کے دوسرے علاقوں حتیٰ کہ وسط ایشیا، تبت اور چین سے بعض حصوں پر بھی حکومت کرتے رہے تھے اور ولادت مسیح سے ڈھائی سو سال پہلے اشوک اعظم نے اسے فتح کر کے اس پر اپنی حکومت بھی قائم کر لی تھی لیکن حکومت کے ان ہروادوں میں کشمیر ہندوستان ہی کا حصہ رہا تھا۔

پہلے صدی عیسوی میں جب کشمیر کی عنان حکومت اس کے پڑائے حکمرانوں کے ہاتھوں سے نکل کر مسلمانوں کے ہاتھوں میں پہنچی تب بھی اس کی مذکورہ بالا خصوصیت پوری طرح برقرار رہی۔ پٹیا پنچ تاریخ بتاتی ہے کہ سلطانین کشمیر کا مورث اعلیٰ شاہ مرزا شمس الدین برسر حکومت آنے سے برسوں پہلے کشمیر ہی کو اپنا وطن بنا چکا تھا اور اس خاندان کے دور حکومت کے آخری ایام میں چکول کی بوچندوڑہ حکومت قائم ہوئی تھی اس کے بانیوں کا مورث اعلیٰ لشکر چک بھی درہستان سے آ کر کشمیر ہی میں آباد ہو گیا تھا۔ اس طرح چودھویں صدی عیسوی کے تقریباً وسط سے لے کر سولہویں صدی تک اکثر ملک کشمیر چین، سلطان بادشاہوں کی حکومت قائم رہی تھی اول تو وہ سب کشمیر ہی کے باشندے تھے اور دوسرے انھوں نے اسے کسی دور میں بھی ہندوستان سے باہر کی کسی حکومت کے ساتھ وابستہ نہیں کیا بلکہ اس تمام زمانہ میں یہ ریاست بھی ہندوستان کی دوسری ریاستوں کی طرح اپنے معاملات میں آزاد اور خود مختار رہنے کے باوجود ہندوستان ہی کا ایک حصہ رہی اور گذشتہ چار ہزار سال سے تہذیب اور ثقافت کے لحاظ سے باقی ماندہ ہندوستان کے ساتھ اس کا جو تعلق چلا آ رہا تھا اس میں کوئی فرق رونما نہیں ہوا۔ لیکن جب سولہویں صدی عیسوی کے اواخر میں اشوک اعظم کی طرح اکبر اعظم نے اسے فتح کیا تو یہ ریاست از سر نو ہندوستان کی مرکزی حکومت کے ماتحت آگئی۔

اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط میں جب خود ہندوستان میں مغل خاندان کا زوال شروع

ہو چکا تھا اور سلطنت مغلیہ کے مختلف علاقوں کے صوبیدار عملاً خود مختار ہوتے جا رہے تھے

احمد شاہ درانی کی سرکردگی میں افغانوں نے کشمیر پر یورش کر کے اس پر قبضہ کر لیا اور اس طرح

پہلی بار ہندوستان کی اس ریاست میں غیر ملکی حکومت قائم ہوئی لیکن اس غیر ملکی حکومت کی مدت

کچھ زیادہ طویل ثابت نہیں ہو سکی اور جس طرح ۱۷۶۴ء میں قبائلی حملہ آوروں کے مقابلہ کے لئے

کشمیر کے باشندوں نے ہندوستان سے فوجی امداد طلب کی تھی اسی طرح ان کی درخواست پر پنجاب

کے حکمران ہمارا جہ رنجیت سنگھ نے ۱۷۹۱ء میں اپنی فوج بھیج کر کشمیر کی غیر ملکی حکومت کو شکست دی

اور ہزاروں سال کے بعد عارضی طور پر ہندوستان سے اس ریاست کا جو سیاسی اور علاقائی

رشتہ ٹوٹ گیا تھا اسے از سر نو وابستہ کر دیا۔

تاریخی واقعات کی رفت و رومی زندگی کے کسی ایک ہی گوشے کو متاثر نہیں کرتی بلکہ وہ قوموں

کی زندگی کے ہر پہلو پر اثر انداز ہوتی ہے۔ یہ ہی واقعات قوموں کی تہذیب اور ثقافت کے دھاروں

کے رخ بدل کر انہیں نئی نئی راہوں پر ڈالتے ہیں اور ان کے کردار میں نشی و نما اور استقلال پیدا کرنے

کے موجب ثابت ہوتے ہیں۔ اس زاویہ نظر سے بھی کشمیر ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے۔

کشمیر کی طویل تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے دوسرے حصوں کی طرح

وہاں بھی ہزاروں سال تک قدیم مذہبی عقائد فلسفہ اور تہذیب کو فروغ حاصل رہا ہے۔ پھر انوکھ اعظم

کی بدلت واپن بدھ مت کو پہنچنے کا موقع ملا ہے اور اس کے زمانہ نیز اس کے جانشینوں کے

دور حکومت میں وہاں بدھ مت کی تبلیغ بھی ہوتی رہی ہے۔ مسلمان ہندوؤں کے عہد حکومت ہی

میں وہاں پہونچ چکے تھے جن میں سنی اور شیعہ دونوں ہی عقائد کے مسلمان شامل تھے اور انھوں نے

کشمیر ہی کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ پھر اسی قدم نہیں بلکہ مورخ فرشتہ کے بیان کے مطابق عراق کے ایک

پابندہ شمس الدین نے کشمیر میں اقامت اختیار کر کے اپنا نام میر محمد نور بخش رکھ کر مذہب نور بخش کے

نام سے ایک نئے مذہب کی دعوت بھی دی تھی اور قیاس کہتے ہیں کہ کشمیر کی سرزمین ندرت اور کثرت کے مذہبی خیالات سے بھی نا آشنا نہیں تھی اور اس طرح یہ وادی مذہبی عقائد کے دھاروں کا ایک زبردست سنگ بن گئی تھی۔ لیکن جس طرح بہشت میں ہیں پہرچ کر انسانوں کے مذہبی اختلافات باقی نہیں رہیں گے اسی طرح اس بہشت ارضی میں مذاہب عالم کے اس اجتماع نے تصادم کی شکل اختیار نہیں کی بلکہ تیسرے نمبر کی طرح مل جل کر رہے اور اسی لئے اس سرزمین میں اس فلسفہ کو بھی بے حد فروغ حاصل ہوا ہے۔ تصوف کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور جس کا واحد مقصد مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے خیالات میں اعتدال پیدا کر کے انہیں ایک دوسرے کے دوش بدوش معرفت حق اور خدمت خلق کی راہ پر چلانا ہے۔

تصوف کے زاویہ نظر سے بھی کشمیر کے باشندوں نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے کشمیر کی یہ وادی ہی لکھنوی یعنی مل دیدیا لہ عارفہ اور مشہور کشمیری صوفی نذرشتی یا شیخ نور الدین کی جنم بھومی ہے اور جب تیمور لنگ کے جبر و ظلم سے تنگ آ کر وسط ایشیا کے مٹا ندر ویش سید علی ہمدانی رحمتے ترک وطن کیا تھا تو انہیں اسی وادی میں پہرچ کر سکون اور اطمینان حاصل ہوا تھا۔ ان صوفیوں اور درویشوں نے جن میں ہندو سادھو اور رشتی نیز مسلمان صوفی اور پیر و دہلوی ہی شامل ہیں، کشمیر میں مذہبی رواداری اور میل ملاپ کی جو فضا پیدا کی تھی کشمیر کے تمام آیت تک اسی فضا میں سانس لیتے ہیں۔ ان کی زبان پر آج بھی انہیں بزرگوں کے اقوال چڑھے ہوئے ہیں، آج بھی وہ اپنے ان روحانی اولاد خلاق پیشواؤں کو محبت اور عقیدت کے ساتھ یاد کرتے ہیں اور ان کی زندگی میں انہیں بزرگوں کی تنبیہات کا رنگ چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔

کشمیر کی سرزمین پر مذاہب عالم کا یہ اجتماع اور اخلاط ان افراد اور قوموں کی بدولت ہوا تھا جو اس وادی کے ہر چہارہ اطراف سے وڈن آتی رہی تھیں۔ یہ قومیں اپنے مذہب ہی نہیں بلکہ اپنے علوم فنون اور اپنے رواجات اور رسوم بھی ساتھ لائی تھیں لیکن جس طرح وڈن پہرچ کر مذہبی عقائد کی تہذیب

میں اعتدال پیدا ہو گیا تھا اسی طرح ان قوموں کے ہندسی، ثقافتی، علمی اور فنی مزاج میں امتزاج بھی پیدا ہو گیا تھا اور ہر قوم کی ہندسی اور ثقافتی خصوصیات، کثیر کی قدیم تہذیب اور ثقافت پر اپنے تابناک نقوش ثبت کر کے خود اس میں مدغم ہو گئی تھیں۔

اس سلسلے میں زبان، رسم و رواج اور کمزورت کا ذکر بھی بے محل نہ ہو گا۔ یہ امر محتاج بیان نہیں کہ آریہ قوم کی زبان سنسکرت تھی اور آریہ جیب اقصائے عالم میں پھیلے تو ہر ملک میں ان کی زبان بھی ان کے ساتھ گئی تھی لیکن ہر ملک کے مقامی حالات اور ضرورتوں نے اس زبان کی شکل کو بدل دیا تھا۔ مگر ہندوستان میں چونکہ سنسکرت کو ایک مذہبی زبان کی حیثیت سے محفوظ رکھا گیا تھا اور اس کا پڑھنا لکھنا صرف برہمنوں ہی کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا اس لئے اس وسیع ملک کے ہر خطے میں مقامی زبانیں بھی وجود میں آ گئی تھیں جنہیں پراکرت یا عوام کی زبان کہا جاتا تھا اور کثیر بھی اس قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے کثیر میں بھی خاص کی زبان سنسکرت اور عوام کی زبان کثیر تھی لیکن مسلمان جب کثیر میں پہنچے تو ان کے ساتھ وہاں فارسی زبان کا سکہ بھی لایا ہوا۔ چنانچہ آج کی کثیر زبان میں سنسکرت الفاظ کے دوش بدوش فارسی اور اس کے توسط سے ان زبانوں کے الفاظ بھی موجود ہیں جن سے خود فارسی زبان متاثر ہوئی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ سنسکرت کی ترقی میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں پیش آئی۔ چنانچہ ۱۲۰۰ء میں جگدھبٹ نے اسوقت کے غزنوی سلطان ۱۲۰۰ء میں سری گنڈنے بال بدھ، ۱۲۰۰ء میں دلتھ دیو نے پٹنہ اور ۱۲۰۰ء میں شیو بدھ بایس نے دہلیان عہد اور ایسی کتابیں لکھی تھیں اور مسلمانوں ہی کے قریب حکومت میں ملا احمد علامہ نے ہر بھارت اور راج ترنگنی کو فارسی زبان میں منتقل کیا تھا۔

کثیر میں علم اور زبان کی اس ہم آہنگی کی بدولت جہاں مسلمان سنسکرت سیکھنے پر فخر محسوس کرتے تھے وہاں ہندو بھی فارسی زبان کو سیکھنے کی خواہش میں آئے۔ سچے سچے نہیں رہتے تھے۔ چنانچہ اس دور کے فارسی داں ہندوؤں میں نہایت بآرام ترکی بیتاب، نہایت راج کول عرضی گئی اور نہایت

راج کاک دھر فرخ ختمو صیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ بقیاب کا منظوم جنگ نامہ آج بھی فردوسی کے
نشا ہنامہ کو دعوت مبارزت سے رہا ہے اور عرض بگی کا فارسی کلام ادبی زاویہ نظر سے غنی کے بعد بہترین
سمجھا جاتا ہے۔ یہاں منشی بھوانی داس کا چروکا ذکر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ پیدلت بھوانی داس
نے فارسی نظم میں بحر طویل کا ایک بیادھنگ اختیار کیا تھا اور یہ ڈھنگ آج بھی مقبول ہے۔ پھر زبانوں
کے معاملے میں اہل کشمیر کی وسعت نظر اور رسد اداری اسی حد تک ختم نہیں ہو جاتی بلکہ وہ کشمیری زبان کی
ترقی اور ترویج میں بھی اسی طرح مل جل کر حصہ لیتے رہے ہیں اور کشمیری زبان کو ترقی دینے میں جو ہندو
اور مسلمان پیش پیش رہے ہیں ان میں لکھنؤ، شہرہ خاٹون، امیرنول، روپ بھوانی، راجک نشی کاکھڑ
محمود غنی، ولی اللہ ٹٹو، پیر مقبول شاہ کمرلاری، میر رسول، پربانند لکشتن، پرباشن رام، کرنشن داس
عزیز دہلوی، ولاب خان، عبدالاحد آزاد اور غلام احمد بھوجو کے نام ہمیشہ یادگار رہیں گے۔

یہاں اس بات کو بھی سمجھ لینا چاہیے کہ کشمیر کے اہل علم و قلم نے جس زبان میں بھی اہلماہر خیال
کیا ہے انھوں نے نہ صرف اسی زبان کے اعلیٰ امیار کو قائم رکھا ہے بلکہ خود اپنے ماحول اور اپنی قدیم روایات
سے بھی انحراف نہیں کیا اور اس طرح ہمیں کشمیر کے ہندو اور مسلمان شاعروں اور ادیبوں کے کلام اور تحریروں
میں خیالات اور تصورات کی ایک بھرپور انگیزہ ہماری نظر آتی ہے۔

کشمیر کے باشندوں کی سماجی زندگی میں بھی بہت بڑی حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے۔ مثلاً
بہت سے میلوں میں ہندو اور مسلمان مل کر منتر یکا ہوتے ہیں۔ دونوں فرقوں کی مقدس زیارت گاہیں
بھی عموماً پاس پاس ہی واقع ہوتی ہیں اور ان پر سالانہ اجتماع کی تاریخیں بھی عموماً ایک ہی ہیں کشمیری
ہندوؤں اور مسلمانوں کے لباس میں بھی کچھ زیادہ فرق نہیں حتیٰ کہ شادی بیاہ نیز پیدائش اور موت کی
بعض رسمیں بھی تھوڑے تھوڑے اختلاف سے ایک ہی جیسی ہیں۔ مثلاً بچہ کی پیدائش کے موقع پر کشمیری نپت
دونوں زیارت گاہوں پر چلتے اور درویشوں سے دعائیں کراتے ہیں اور دونوں فرقوں کے بچے اور لڑکے
دوڑے رکھ کر اولاد پانے کی دعا کرتے ہیں۔ اسی طرح بچے کی پیدائش کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں میں

زچہ کو ساتویں ہی دن ہلایا جاتا ہے اور اس موقع پر جو رسوم ادا کی جاتی ہیں وہ اپنے مذہبی حصول کو چھوڑ کر تقریباً ایک ہی جیسی ہوتی ہیں۔

سرزمین کشمیر اپنے قدسی حسی کے ساتھ ساتھ اپنی فن کارانہ دیباچات اور فن تعمیر کے لئے بھی مشہور ہے اور اس کی فنی دیباچات اور فن تعمیر میں بھی اس کے باشندوں کی وسعتِ نظر مختلف ممتاز فنونِ تعمیر سے خوشہ چینی کے جذبہ اور بنیادی خیالات و تصورات کی لگاتار اور ہم آہنگی کا اظہار ہوتا ہے۔ چنانچہ ہندوؤں کے عہدِ حکومت کی تعمیراتی توانائی اور بودھ فن تعمیر سے متاثر لگاتی ہیں اور مسلمانوں کے دورِ حکومت کی تعمیرات میں بودھ اور ہندوؤں کے فنونِ تعمیرات کے خدخال اُبھرے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور کشمیر کی تاریخ کے مطالعہ نیز باشندگانِ کشمیر کی زندگی کے مشاہدہ کے بعد یہ نتیجہ اخذ کر لینا کچھ مشکل کام نہیں رہ جاتا کہ کشمیر عمادِ قبل از تاریخ ہی سے ہندوستان کا ایک ایسا حصہ رہا ہے جس میں انسانیت کی اعلیٰ قدریں کامل و پیشانی کے ساتھ کارفرما رہی ہیں۔ اس کے باشندوں نے رواداری، وسعتِ نظر اور موجودہ زمانہ کی سیاسی اصطلاح میں سیکولرازم کو اپنی زندگی کا شعار بنائے رکھلے۔ وہاں کے مسلمان سلاطین نے بھی کسی دور میں اس سرزمین کو ہندوستان سے علیحدہ نہیں سمجھا، اس خطہ ارض کی تہذیب اور ثقافت ہندوستان ہی کی تہذیب و ثقافت کی آئینہ دار رہی ہے اور اس کے باشندے اپنے ہر گز وقت میں ہندوستان ہی کی امداد و اعانت پر بھروسہ کرتے رہے ہیں۔

سکھوں میں ہندوستان کی تقسیم کے وقت کے حالات میں، کشمیر کے باشندوں نے جن کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے، ہندوستان کے ساتھ الحاق کا جو فیصلہ کیا تھا وہ باقی النظر میں ایک عجیب سا فیصلہ معلوم ہوتا ہے لیکن جب ہم اسے کشمیر کی ہزاروں سالہ تاریخ کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ کشمیر کے باشندوں کے لئے اپنے تاریخی راستہ طبعی اور جغرافیائی ماحول، جمہوری نظریہ جیٹا اور مذہبی رواداری کے جذبہ سے انحراف ممکن ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

کشمیر کے بیشتر باشندے مسلمان ضرور ہیں اور ان کے مذہبی عقائد کی بنیاد نیز شاعرِ اسلامی

کے ساتھ ان کی حقیقت اور اعلیٰ لیگی کو دوسرے مسلمانوں کے مقابلے میں کسی طرح بھی کم تر نہیں کہا جاسکتا
لیکن مولانا آزاد مرحوم کے الفاظ میں

”یہ کہنا کہ جو علاقے جزا فیائی، اقتصادی، لسانی اور ثقافتی اعتبار سے مختلف ہیں
انہیں مذہبی مماثلت کی بنیاد پر متحد کیا جاسکتا ہے، انسان کو سب سے بڑے فحش
میں مبتلا کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام نے نسلی، لسانی، اقتصادی اور
سیاسی حدود کو توڑ کر ایک معاشرہ قائم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن تاریخ سے ثابت
ہوتا ہے کہ چند دہائیوں یا زیادہ سے زیادہ ایک صدی کے بعد اسلام بھی محض
اسلام کے نام پر مختلف اسلامی ملکوں کو ایک ریاست میں متحد نہیں کر سکا۔“

کشمیر کے باشندوں کے لئے محض مذہب کے نام پر پاکستان کے ساتھ متحد ہو جانا، ہندوستان کے
ساتھ قائم شدہ اپنے جزا فیائی، تاریخی، اقتصادی، لسانی اور ثقافتی تعلقات کو منقطع کر لینا اور اپنے
سیکولر سیاسی رجحانات کو فراموش کر دینا ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ اور اسی لئے انہوں نے اپنے مستقبل کو
ہندوستان کے ساتھ وابستہ کر کے وہ راہ اختیار کی ہے جو سیاسی اور سماجی طور پر بالآخر نفع اور شہرہ یافتہ
قومیں اختیار کیا کرتی ہیں۔

پھر اسی قدر نہیں بلکہ کشمیر کی سیاسی تبدیلی کی تاریخ بھی ہندوستان ہی کی سیاسی تبدیلی کی تاریخ کے
ساتھ وابستہ رہی ہے۔ بچپان چرائیگریزوں کی حکومت کے اس دور میں جب برطانوی ہند کے باشندے
اپنے وطن کی آزادی کی جدوجہد میں مصروف تھے اور ہندوستانی ریاستوں کے باشندے جیسی کمزوروں کی
مہمت ترین گرفت میں پھنسے ہوئے ہونے کے سبب سے لظاہر اس جدوجہد سے بے تعلق معلوم ہوتے تھے،
ریاست چھوٹی اور کشمیر کے باشندے، برطانوی ہند کے باشندوں کی اس جدوجہد کے نہ صرف حامد ہی تھے
بلکہ خود اپنے عزیز وطن گوداں کی ملحقہ اٹمان حکومت سے نجات دلانے کی جرأت مندا کو ششوں میں بھی
معروف تھے اور دوسری طرف خود ان کی جدوجہد کو پورے قوم پرور ہندوستان کی تائید اور حمایت حاصل

حقّی اور حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی قومی جدوجہد ہی کی بدولت کثیر کے باشندوں کی جدوجہد بھی نہ صرف عالم وجود میں آئی حقّی بلکہ اس جدوجہد کو قوم پرورد ہندوستان ہی نے تقویت بھی پہنچائی حقّی اقل کثیر کے باشندوں نے ہندوستان کے ساتھ والہ رشتہ بننے کا جو فیصلہ کیا ہے اس میں اس امر کو بھی بہت زیادہ دخل حاصل ہے۔

سطور بالا میں کثیر کے باشندوں کے جس قومی کروا کا ذکر کیا گیا ہے اگرچہ وہ بجائے خود ایک سیکولر جمہوری ملک کے ساتھ اس کی وابستگی کے لئے ایک طاقت ور محرک کی حیثیت رکھتا تھا لیکن اسے جن خارجی اسباب و عوامل سے تقویت ملی تھی وہ بھی کچھ کم اہمیت کے حامل نہیں تھے اور یہاں ان کا تذکرہ کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ انڈین نیشنل کانگریس ہمیشہ سے متحدہ قومیت کی علم بردار رہی ہے اور آزادی وطن کے حصول تک ملک کے تمام حریت خواہ اور قوم پرورد عناصر کانگریس ہی کے ساتھ وابستہ تھے۔ ان قوم پرورد عناصر میں ہندوستان کے ممتاز ترین مسلمان علماء دانش ور اور سیاست دان شامل تھے اور قومی آزادی کی جدوجہد میں مسلمانوں نے بھی اس ملک کے دوسرے قوم پرورد عناصر سے کچھ کم قربانیاں نہیں کی تھیں جتنی کہ فرقہ پرستی کے شباب کے اس زمانہ میں جب ایک طرف تو مسلم لیگ، ملک کی تقسیم کے مطالبہ پر اصرار کر رہی تھی اور دوسری طرف وہ 'انڈین نیشنل کانگریس' کو 'ہندو جماعت' کے نام سے موسوم کرتی تھی، ہندوستان کے قوم پرورد مسلمان غیر معمولی جسرات اور استقلال کے ساتھ نہ صرف تقسیم ہند کے مطالبہ ہی کی مخالفت کر رہے تھے بلکہ کانگریس کے ساتھ ان کی وابستگی، کانگریس کے غیر فرقہ وارانہ کردار کا ناقابل تردید ثبوت بھی پیش کر رہی تھی کثیر کے باشندے ہندوستان کے بے شمار قوم پرورد مسلمانوں کے اس اثبات اور استقلال سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے جن کا مظاہرہ وہ ہندوستان کی آزادی، متحدہ قومیت کی تشکیل و تعمیر اور ہندوستان میں سیکولر جمہوریہ کے قیام کے سلسلے میں کر رہے تھے اور وہ اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے تھے کہ مسلم لیگ جو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہونے کی مدعی ہے،

کثیر کے باشندوں کی جن کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے، تحریک آزادی کی مخالفت کر رہی ہے، لیکن انڈین نیشنل کانگریس ہر ممکن طریقہ سے اس تحریک کو کامیاب بنانے کی کوششوں میں مصروف ہے۔ اور کشمیر کے رہنماؤں اور عوام نے ہندوستان کے ساتھ الحاق کا جو فیصلہ کیا تھا اس میں ہندوستان کے قوم پرست مسلمانوں کے اخل و عرم اور استقلال نیز انڈین نیشنل کانگریس کے غیر فرقہ وارانہ کردار کو بھی بہت زیادہ دخل حاصل تھا۔ اس طرح کشمیر کے باشندوں پر ہندوستان کی تمام سیاسی جدوجہد، قوم پرست مسلمانوں کے نظریات اور کانگریس کے غیر فرقہ وارانہ کردار نیز کشمیر کے باشندوں کی جدوجہد میں اس کی غیر مشروط اعانت و حمایت کا جو نتیجہ عمل ظاہر ہوا اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے سیاسی رجحانات کس قدر ترقی پسندانہ اور ہندوستان کے سیاسی رجحانات سے کس قدر قریب تھے اور اس واقعہ سے بھی ہندوستان کی دوسری ریاستوں پر یہی سیاست جموں اور کشمیر کی وقت ثبات ہوتی ہے۔

پھر ۱۹۴۷ء کے فرقہ وارانہ ہنگاموں کے طوفانی دور میں اس سیاست کے باشندوں نے اپنی جس فرقہ وارانہ سالمیت اور یک جہتی کا مظاہرہ کیا تھا وہ بیکار ہو گیا۔ خود اس امر کا ثبوت ہے کہ ہزاروں سال سے ان کی قومی زندگی میں محبت، یگانگت، سماجی و ادارتی اور مذہبی وسعت نظر کے جو عناصر کار فرما رہے تھے وہ برائے نام اور سطحی نہیں بلکہ حقیقی تھے لیکن کیا یہ امر موجب حیرت اور افسوس نہیں کہ ہندو یونین کی ایک ایسی ریاست کے متعلق جس کا ماضی بے حد تلخ و تاریک رہا ہے، جس کی تہذیب اور ثقافت، ہندوستان کی حقیقی تہذیب اور ثقافت کی نمائندگی کرتی رہی ہے، جس کے باشندے ہزاروں سال سے سیکولر ازم کے حقیقی مفہوم کے حامل اور اس پر کاربند رہے ہیں، جس کے حسن خلاقانہ کوششوں نے سلطنت نے سراہا ہے، جس کا دامن ہندو تہذیب کے ماضی و ادوں کی روحانی تانگ و تار کا پسندانہ بنا رہا ہے اور جس کے باشندے اپنے سیاسی اور سماجی رجحانات اور تصورات کی بنا پر آج بھی نہ صرف ہندوستان کے ساتھ وابستہ نہیں بلکہ اس وابستگی پر فخر اور مسرت بھی محسوس کرتے ہیں اور سب

کے بعد ایک ایسی اہم ریاست کے متعلق جس کے محل وقوع نے آج اسے بین الاقوامی اہمیت کا حامل بنا رکھا ہے، اردو زبان میں کوئی ایسی کتاب موجود نہیں ہو ملک کے اردو ادبا باشندوں کو اس ریاست سے متعلق سیر حاصل، ذمہ دار اور اطمینان بخش معلومات ہم پہنچا سکے۔

یہاں اس بات کو بھی ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ ہندوستان کے ساتھ ریاست جموں اور کشمیر کا اطلاق ریاست کے حکمران اور عوامی رہنماؤں کی درخواست اور خواہش پر ۲۶- اکتوبر ۱۹۴۷ء کو اس ریاست کی تاریخ کے ان نازک ترین لمحات میں عمل میں آیا تھا جب کیشو کے ہمسایہ ملک پاکستان کے اشارہ اور اعانت سے قبائلی باشندوں نے صرف پوری قوت سے اس پر حملہ کر دیا تھا بلکہ وہ سری نگر کے قریب بھی آ پہنچے تھے اور اگرچہ ریاست کے باہمت فرزندوں نے اپنی تمام تر لیکن محدود قوتوں کو اپنے عزیز وطن کی حفاظت پر مرکوز کر دیا تھا لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ اگر افس ہندو سے بروقت فوجی اور اخلاقی اعادہ مل سکتا تو آج کشمیر اپنی آزادی پر فخر نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن ہندوستان کے ساتھ ریاست جموں اور کشمیر کے اس اطلاق کی بدولت داخلی اور بین الاقوامی طور پر بعض ایسے سوالات بھی پیدا ہو گئے ہیں جو کشمیر کی تاریخ میں ایک نئے باب کا عنوان بنے ہوئے ہیں اور اس باب میں وہ تمام اقدامات اور تیز رفتاریاں شامل ہیں جو اکتوبر ۱۹۴۷ء کے اواخر سے اس وقت تک عود ریاست کے اندر یا اس ریاست کے نام پر ریاست کی حدود سے باہر پیش آتے رہے ہیں اور جنہیں سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت اور اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن جہاں تک ملک کے بے شمار اردو ادبا باشندوں کا تعلق ہے ان کی اس اہم ضرورت کو پورا کرنے کے لئے بھی کوئی قابل ذکر کتاب موجود نہیں۔

پیش نظر کتاب کی ترتیب اور اشاعت کا مقصد ملک کے اردو ادبا طبقہ کی ان ہی ضرورتوں کو پورا اور اس حلقہ کو پُر کرنا ہے جو کشمیر اور اس کی گونا گوں اہمیتوں کے متعلق پورے ملک میں موجود نظر آتا ہے اور اسی لئے اس کی ترتیب میں اس بات کو مد نظر رکھا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ سے

نہ صرف یہ ریاست جموں و کشمیر کے مافیہ ہی کے متعلق مفید اور دل چسپ معلومات حاصل ہو سکیں بلکہ اس سے متعلق تمام تر موجودہ مسائل کا صحیح صحیح علم بھی حاصل کیا جاسکے اور اس کے مافیہ اور حال کی روشنی میں اس کے مستقبل کا اندازہ بھی ہو جائے۔

اس کتاب کی ترتیب میں جن کتابوں، اخبارات، رسالوں اور دستاویزات سے استفادہ کیا گیا ہے ان کی فہرست بہت زیادہ طویل ہے اور اسے اس کتاب کے ساتھ منسلک کرنا ممکن نہیں ہو سکتا لیکن ان سب کتابوں اور رسالوں کے مصنفین، مقالہ نگار اور مدیران تحریر کے متعلق یہی توقع ہے کہ یہ کتاب اپنے بنیادی مقصد کو پورا کر سکے گی اور اس کی بدولت ملک کا اردو دان طبقہ کشمیر اور اس سے تعلق رکھنے والے تمام تر مسائل سے پوری طرح واقف ہو سکے گا۔

پہلا باب

جغرافیائی اور تاریخی حالات

برطانوی دور حکومت میں جہاں برصغیر ہند، برطانوی ہندوستان، اور ہندوستانی ہندوستان کے نام سے دو حصوں میں منقسم تھا وہاں 'ہندوستانی ہندوستان' بھی ۵۶۲ ریاستوں میں بٹا ہوا تھا اور ان ہندوستانی ریاستوں میں ریاست جموں اور کشمیر کو رقبہ کے لحاظ سے پہلا اور آبادی کے اعتبار سے چوتھا درجہ حاصل تھا۔ چنانچہ برطانوی دور حکومت کی آخری مردم شماری کے مطابق ۱۹۴۱ء میں اس ریاست کی آبادی ۴۰۲۲۰۰۰ - افراد پیشکل تھی اور ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ دس سال میں اس کی آبادی ۸۲۶۸۰۳۴ افراد تک پہنچ گئی تھی۔

ریاست جموں اور کشمیر جو ہندوستان کی تقسیم سے پہلے بھی اپنی تاریخ، تہذیب اور ثقافت کے دائرہ نظر سے غیر منقسم ہندوستان کی ایک اہم ریاست سمجھی جاتی تھی اور تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کے ساتھ الحاق کے فیصلہ کی بدولت آج ہندوستان کے ایک لائیک جزو کی حیثیت رکھتی ہے، ہندوستان کے شمالی مغربی گوشہ میں کہستان ہمارے درمیان واقع ہے۔ اس کا رقبہ ۸۴۴۷۴ مربع میل ہے اور اس کے مشرق میں تبت، شمال میں عوامی چین کا علاقہ

سنگیاب اور افغانستان، مغرب میں پاکستان اور جنوب میں ہندوستان کی دوسری ریاست پنجاب واقع ہے اور اس طرح آج کے ہندوستان کا یہ حصہ ہمیشہ سے مختلف ہندویوں، قوموں، زبانوں اور مذہبوں کا شگم بننا رہا ہے اور اس کے اسی محل وقوع نے آج اسے بین الاقوامی تجربہ کار مرکز بنا رکھا ہے۔

کوہستان ہمالہ کے قلب میں واقع، ہندو چین کی ریاست اپنے گرد و پیش کے برت پوش پہاڑوں، خلیصہ دریاؤں اور آبشاروں، نیلگوں پانی سے لبریز دیسج جھیلوں، قراغ وادیوں نیز پھولوں کی کثرت اور پھولوں کی فراوانی کی بدولت بجا طور پر "جنت ارضی" کہلاتی ہے اور اگرچہ یہ طبی خصوصیات اس ریاست کے بیشتر حصہ میں پائی جاتی ہیں لیکن ان کا حقیقی مرکز کوہستان ہمالہ اور کوہستان قراقرم کے بلند سلسلوں میں گھرا ہوا بلند اور سینوی شکل کا میدان ہے جسے وادی کشمیر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ میدان سطح سمندر سے ۵ ہزار فٹ سے ۶ ہزار فٹ تک بلند ہے اور اس کا عرض ۲۵ میل اور طول ۸۰ میل سے کسی قدر زیادہ ہے اور اس کے ان ہی طبی حالات کی بدولت اس کے مختلف مقامات کی آب و ہوا میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے چنانچہ ایک جانب تو دہان کے پہاڑی علاقوں میں خون کو بخند کر دینے والی سردی پڑتی ہے اور دوسری طرف سری نگر ایسے میدانی علاقوں میں متدل اور خوشگوار موسم بھی ملتا ہے اور اس خطہ ارض کے یہ ہی وہ ظاہری اور باطنی محاسن ہیں جن کی بدولت اس سرزمین پر قدم رکھنے ہی منل شہنشاہ جہاں گیر کی زبان سے بے ساختہ یہ الفاظ نکل گئے تھے کہ۔ "کشمیر بہشت ارضی ہے، داعط جس بہشت کا تذکرہ کرتے اور شہزاد جس بہشت کی تحریرت میں گیت گاتے رہے ہیں وہ کشمیر ہی ہے۔"

وادی کشمیر کا شمار دنیا کے محدودے چند خوب ترین علاقوں میں کیا جاتا ہے اور اس میں ہی تروت مندی اور دل کشی کے اعتبار سے وہ حصہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے جہاں سے دیباے جہلم اور مہارون دریا سندھ اور لدہ ہو کر گزرتے ہیں۔ دیباے جہلم شمال میں کھنڈل سے

کے گرجوں میں یا وہ مولانا کے قابل ہمارا زانی ہے۔ کھنڈیل اور بارہ مولاکا بہ درمیانی فاصلہ تقریباً ۹۰ میل ہے۔ ریاست جموں اور کشمیر اور بیرونی دنیا کے درمیان تجارت اور آمد و رفت کے لئے دریائے جہلم ایک آبی شاہراہ کی حیثیت رکھتا ہے اور غالباً دنیا بھر میں وادی کشمیر کے علاوہ ایسی کوئی دوسری وادی موجود نہیں جو اس قدر بلندی پر واقع ہونے کے ساتھ ساتھ اتنی وسیع بھی ہو اور اس میں جہلم جیسا زبردست دریا کم و بیش ایک سو میل تک بہتا ہوا چلا گیا ہو۔

کشمیر کے حسین قدرتی مناظر، صحت بخش آب و ہوا اور اس کی غیر معمولی زرخیزی اور ثروت مندی کی طرح اس کی تاریخ بھی بے حد دل چاہا اور بولتوں واقعات کی حامل ہی ہے اور کشمیر کے ان ہی طبعی حالات اور تاریخی احوال نے خود کشمیری قوم کے مزاج اور قومی کردار کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

ہندو دیوالائی کہانیوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ وادی کشمیر کسی زمانے میں ایک بہت بڑی جھیل اور سٹی سر کے نام سے موسوم تھی۔ سٹی کشمیری کی دو شیرہ پادستی کا دوسرا نام ہے اور ان روایات کے مطابق وہ اس جھیل کے شمال میں واقع پہاڑ پر رکھ سے اپنی کشتی میں سوار ہو کر جنوب میں واقع جھیل کنسر ناگ تک چلا کرتی تھیں۔ اسی جھیل میں ایک خوفناک دیو ہے خود برہما کی سرپرستی حاصل تھی بہت سے ناگ، بلیں اور پشایح بھی رہتے تھے۔ یہ آبی مخلوق اسل پر اپنے واسے انسانوں کو ذمہ دہت ہلاک ہی کر دیتی تھی بلکہ وہ اس جھیل کے قرب و جوار سے زندگی کے ہر نشان کو بھی مٹا دیتی تھی اور اس طرح جھیل کے گرد و نواح کا تمام تر علاقہ ویران ہو گیا تھا۔

حسن اتفاق سے سابقین موت کے زمانہ میں اس طرف سے رستی پر چار پائی کیشپ کا گذر ہوا وہ مراچی کے فرزند اور یہاں کے پوتے تھے اور جب انھیں اپنے فرزند ندیل ناگ سے اس تباہ کاری کا حال معلوم ہوا جو جل دیو اور اس کے ماتحتوں نے برہما کر رکھی تھی تو انھوں نے اس بات کا اہم کر لیا کہ وہ لوگوں کو اس خبیث آبی مخلوق سے نجات دلانے بغیر چھٹی نہیں لیں گے۔ چنانچہ انھوں نے اسی جگہ

جیت کر تپسیا شروع کر دی اور ایک ہزار سال تک اسی حالت میں رہنے کے بعد جب وہ جل دیو کا مقابلہ کرنے کے لئے آئے تو جل دیو پانی میں جا چھپا۔ رشتی پر چا پتی کیشپ کی اس بے بسی کو دیکھ کر تین دیوتاؤں یعنی 'دھرومن'، 'اوپنند' اور 'دروکرمان' پر بے حد رنج کیا اور ان کی سفارش سے دشنو ہماراج خود رشتی کیشپ کی اطلاع کے لئے زمین پر آئے اور امانوں نے ہمارے قریب پہاڑ کے حاسن میں اپنے ہل کی لوک سے ایک ایسا سوراخ بنادیا جس کے ذریعہ سے جھیل کا تمام پانی خشک ہو گیا۔

دشنو جی کی اس عنایت سے جھیل کا پانی تو زمین میں ضرور جذب ہو گیا تھا لیکن خود جل دیو کا کوئی پتہ ہمیں چل سکا تھا۔ وہ نیلی زمین میں کسی جگہ جا چھپا تھا اور اگر ہم دیتا اپنے ایک ہاتھ میں سولہج اور دوسرے میں چاندنی شعلیں لے کر اسے ڈھونڈنے میں مصروف تھے لیکن وہ کسی کو بھی نظر نہ آتا تھا۔ دیوتاؤں کی اس پریشانی کو دیکھ کر سرلیکا اپنی یاد دہانی جی کو حرم آگیا اور امانوں نے مینا کے قریب میں ظاہر ہو کر اپنی پوچھ میں ایک کنگری لی اور اسے تاک کر جل دیو پر گرا دیا۔ اس طرح اس غیبت دیو نے اس کنگری کے نیچے دیب کر جان دے دی۔ لیکن یہ کنگری آہستہ آہستہ بڑھنے اور پھیلنے لگی اور وہ اس سرلیکا پرست میں تبدیل ہو گئی جو اب 'ہاری پرست' کہلاتا ہے اور اس پر پانچویں جی کی یاد گاہ کے طور پر ایک مندر بھی بنا ہوا ہے۔

ہر حال رشتی کیشپ کی تپسیا کی بدولت جھیل کا پانی خشک ہو کر جو زمین نمودار ہوئی تھی، ابتدا میں اسے 'کیشپ نر' یعنی کیشپ کی قیام گاہ کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا اور 'کشمیر' اسی کیشپ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

ہندو دیوتاؤں کی یہ کہانی اسی جگہ ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ جل دیو کی ہلاکت کے بعد چھوٹے جل دیوؤں کی بہتیں بھی پست ہو گئی تھیں اور امانوں نے انسانوں کو نشانہ چھوڑ دیا تھا اور اسی لئے گرمی کے موسم میں آس پاس کے پہاڑوں سے لوگ دھان جاتے بھی گئے تھے۔ ویسے دوسروں کے ذمے ہیں واپس چلے آتے تھے اور اس طرح اس موسم میں اس

دادی پر دیووں ہی کا قبضہ رہتا تھا۔ لیکن اسے انسان کی خوش نصیبی سمجھنا چاہیے کہ ایک سال موسم ملر
 ہیں ایک خفیہ برہمن کو اس دادی میں رہنے پر مجبور ہو جانا پڑا۔ اور جب ان خبیث دیوؤں نے اس
 کوڑے اور کمزور برہمن کو نقصان پہنچانا چاہا تو ریشی کیشپ کے فرزند نیل ناگ نے وہاں پہنچ کر نہ صرف
 اسے نقصان ہی سے محفوظ رکھا بلکہ اسے نیل مت پران ' بھی عنایت کیا جس کے مطالعہ کی بدولت کثیر
 کے برہمن ان تدابیر سے واقف ہو گئے جن سے ان خبیث دیوؤں کو ہلاک کیا جاسکتا تھا۔ اس طرح ان
 دیوؤں کی ہلاکت کے بعد اس دادی میں انسانی آبادی کا آغاز ہوا۔ پیرس میسوی کی آغاز سے تقریباً
 دو ہزار سال پہلے جنت کی کچھ پریوں اور آکاش کی دیویوں نے اس دادی میں آکر جمیلوں اور دیوانوں کی
 شکل میں وہاں رہنا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ ان ہی جمیلوں اور دیوانوں کے کناروں پر بستیاں بس گئیں
 جن میں راجا حکومت کرنے لگے اور یہ راجا اور ان کی پر جاگرمی کے موسم میں پوری دادی میں گھوم پھر کر
 اس کی قدرتی ثروت مندی اور دلگشی کو دہرایا کرتے تھے۔

دیو مالاک کی کہانی اپنی جگہ درست ہے یا نہیں؟ یہاں اس پر بحث و نظر کی ضرورت محسوس نہیں
 ہوتی لیکن یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اس کہانی کی طرح نہ صرف کثیر کی سرزمین ہی انسانی دہم و تیس
 سے کہیں نہ زیادہ حسن، جا زہین اور دل کش کی حامل واقع ہوئی ہے بلکہ اس کے باشندوں کی امن پسندی،
 وسعت نظر اور معاہداری جہلے خود ان کی روحانی اور اخلاقی تفصیل کی پرتگلی پر حالات کرتی ہے۔

غیر ملکی مؤرخین اور اصحاب علم و علم کو بجا طور پر یہ شکایت رہی ہے کہ پراسے زمانے کے ہندوستانی
 علماء اچھے مؤرخ نہیں ہوتے تھے اور اسی لئے قدیم ہندوستان کی کوئی متبر اور مستند تاریخ نہیں ملتی ہے
 کثیر کی قدیم سرزمین سے متعلق یہ شکایت نہیں کی جاسکتی۔ اس سرزمین کی تاریخ موجود ہے البتہ گہرا
 بارہویں صدی عیسوی کے نصف اول میں شہد کثیر کی مؤرخ کلہن نے مدون کیا تھا لیکن کلہن کی اسی
 ملکی کارنامہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سہم پہلے بھی کثیر میں ایسے لوگ پیدا ہو چکے تھے جنہوں نے
 نہ صرف اپنے ہی زمانے کی تاریخی واقعات کو قلمبند کیا تھا بلکہ ان واقعات کو باضی کے ساتھ بھی بیان کیا تھا۔
 سیدہ الشہداء صفحہ ۲۱۰ پر پیرس میسوی

مربوط کرنے کی دیانت و ارادہ کو شمش بھی کی تھی اور مؤرخ کلہن نے اپنی قابل ذکر کتاب راج ترنگنی کی ترتیب کے وقت ان لوگوں کی تحریرات سے استفادہ کیا تھا۔ بہر حال راج ترنگنی کشمیری ادب اور تاریخ کے ایک ایسے شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے جس نے اس عین مادی کے مافی کو اس کے حال کے ساتھ مربوط کیا ہے اور چونکہ کلہن کے بعد کشمیر کی تاریخ پر ایک بلند کی جاتی رہی ہے اس لئے ہم راج ترنگنی کے وسیلہ سے اس سرزمین کی تاریخ کی راہ پر بہت دور تک پہنچ سکتے ہیں اور اگرچہ ماضی البید کے متعلق کلہن کے تمام بیانات کو حرف بحرف صحیح تسلیم نہیں کیا جاسکتا لیکن بحیثیت مجموعی کشمیر کی تاریخ کی بنیاد ان ہی بیانات پر قائم ہے۔

کلہن نے اپنی کتاب کو ۱۸۴۷ء ق م میں کشمیر کے راجہ گونڈ کے حالات سے شروع کیا ہے لیکن اس نے ابتدا میں اس سے قبل کے زمانہ کے واقعات و حالات کا جو خلاصہ شامل کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء ق م تک کشمیر میں کوئی منظم حکومت قائم نہیں ہو سکی تھی لیکن ۱۸۵۷ء ق م میں راجہ دیبا کرن نے اس عین مادی میں پہلی بار ایک منظم اور باقاعدہ حکومت قائم کی تھی اور دیبا کرن ہی اس سرزمین کا پہلا راجہ ہی تھا اور اس وقت سے آئندہ چاندرا رسالی تک آریہ نسل کے راجا ہی اس مادی پر حکومت کرتے رہے تھے اور اس طویل مدت میں کشمیر کے راجاؤں کے اکیس خاندان پر سر حکومت آئے تھے۔

چاندرا رسالی کی اس طویل مدت میں جن صد راجاؤں نے کشمیر پر حکومت کی تھی ان میں بعض خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ مثلاً راجہ ورنہ کشمیر کا ایک فلسفی اور دولینصت راجہ تھا۔ اس کے باپ کی موت کے بعد جب لوگوں نے اس سے کشمیر کی تختی پر بیٹھنے کی درخواست کی تو اس نے اس درخواست کو جن شرطوں پر قبول کیا تھا ان میں یہ شرطیں بھی شامل تھیں کہ میری حکومت کے زمانہ میں کسی شخص کو بھرت نہیں ہونا چاہیئے، کسی جاتوار کو نہیں ماننا چاہیئے اور کسی کو دھوکا نہیں دینا چاہیئے۔ کشمیر کے اس راجہ نے لشکر چار پر پرست کے واسطے میں ایک چھوٹی سی اہلحد و گودام بنوائے تھے۔ چھوٹی ہی میں وہ غور رہتا اور کھیتی باڑی کر کے اپنی زندگی بسر کرتا تھا۔ اور اس کے مشورہ یا

تجویز کے مطابق کامراجیہ اور ماراجیہ یعنی شمالی اور جنوبی کشمیر کے زمینداروں کا راجہ طہر پانی آمدنی میں سے دسواں حصہ گوداموں میں جمع کر دیتے تھے اور راجہ خود بھی نہایت پابندی کے ساتھ اپنی آمدنی کا دسواں حصہ ریا سنت کے اس خزانے میں جمع کرتا تھا۔

راجہ دسویں دہائی کو اپنی پر جا کی شرافت نفس اور ایمان داری پر اس قدر اعتبار تھا کہ اس نے تمام سرکاری امور کو ملازمت سے علیحدہ کر دیا تھا لیکن غیر ملکی مندوں سے ریاست کی حفاظت اور ملاقات کے لئے فوج کو برقرار رکھا تھا اور اپنے بھائی کو فوج کی نگہداشت کا کام سپرد کر کے ایک گودام کی تالی اس کے حوالے کر دی تھی اور دوسرے گودام کے ذخیرے کو وہ خود در وقت جمع کے وقت غریبوں اور ضرورت مندوں کے درمیان تقسیم کیا کرتا تھا۔ کشمیر کے باشندے آج تک بھی راجہ دسویں دہائی کے نیک نام کو فراموش نہیں کر سکے۔ چنانچہ اب بھی جب بھی کوئی ایسا مالک واقعہ رونما ہو جاتا ہے جسے ہنر سے دیکر یا تنبیہ لگ ہی کے لئے مخصوص تین تین کیا جاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ دسویں دہائی کا گودام۔

کشمیر کے راجاؤں میں سب سے زیادہ مشہور راجہ لیتا دتہ گڈرا ہے۔ لیتا دتہ سولہویں صدی تک کشمیر کا حکمران رہا تھا اور مکتا پور کے نام سے مشہور تھا۔ اس نے پورے ہندوستان کو فتح کرنے کی ہم شروعات کی تھی اور شمالی ہند کے تمام راجاؤں کو شکست دے کر اپنی سلطنت کی حدود کو وسیع تر کر لیا تھا۔ اسی قدر نہیں بلکہ اس نے افغانستان کی راہ سے ترکی تک پہنچ کر اسے اور وسطی ایشیا کے کچھ حصہ کو بھی فتح کیا تھا اور بارہ سال کے بعد تبت کے راستے سے اپنی راجدھانی میں واپس آیا تھا۔ یہ راجہ مہاراجہ ہونے کے علاوہ بہتر بھی تھا۔ اس نے ملک گیری اور حکومت کے ضابطہ اور آداب بھی مدون کئے تھے اور ارتشڈینی سویریدیتا نام کا مندر بھی اسی نے تعمیر کرایا تھا۔

خاندانی کشمیر کی تاریخ صرف اس کے نامور راجاؤں ہی کے کارناموں کے باعث درخشاں نہیں بلکہ اس سے درخشاں کئے جاتے ہیں کشمیر کی رائیوں کا بھی قابل ذکر حصہ ہے حتیٰ کہ کشمیر کی قانون

مکران و دہ رانی کے مقابلے میں سلطان محمد غزنوی ایسے زبردست فاتح کو بھی اس خطہ ارض کو فتح کرنے کی ہم میں ناکامی کا سزا دیکھنا پڑا تھا۔

ولادت مسیح سے کم و بیش ڈھائی سو سال پہلے کشمیر پر اس کے قدیم راجاؤں ہی کی حکومت قائم رہی تھی لیکن ششہ ق۔ م میں اشوک اعظم نے اسے فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا اور اس طرح اس وادی میں پہلی مرتبہ بودھ مت کو پہنچنے کا موقع ملا تھا اور ہندوستان کے اسی نامور شہنشاہ نے موجودہ شہر سری نگر سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر پینڈی تہن میں سری نگری کے نام سے ایک شہر بھی آباد کیا تھا۔ اس دور کے متعلق راج ترنگنی میں جو تفصیلات مذکور ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ — ہندو دھرم اور بودھ مت ایک دوسرے کے دوش بدوش موجود تھے اور مذہب کے معاملے میں کامل بے ادھاری کو مدنظر رکھا جاتا تھا۔ لیکن کشمیر میں بودھ مت اور بودھ راجاؤں کا اثر۔ اقتصاد پانچ سو سال سے زیادہ مدت تک باقی نہیں رہ سکا۔ چنانچہ مشہور صینی تیار جہان ساگک کے بیان کے مطابق جس نے ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں کشمیر کی سیاحت کی تھی وہاں کے باشندوں کی اکثریت بٹیوی کی پرستار تھی اور اس زمانہ میں بودھ خانقاہوں اور دھاروں کے چند آثار ہی باقی رہ گئے تھے۔ بودھ مت کے زوال کے بعد کشمیر کی عنان حکومت چھ گزشتیوں کے ہاتھوں میں آگئی تھی اور اگرچہ چھٹی صدی عیسوی کے آغاز میں سفید ہنوں کے سردار ہرکلا نے کشمیر پر قبضہ کر کے وہاں اپنی حکومت قائم کر لی تھی لیکن اس خاندان کا دور حکومت جلد ہی ختم ہو گیا تھا۔ ہرکلا نے حدنگ دل واقع ہوا تھا۔ چنانچہ کشمیر کے باشندے پر پنجاب کی ایک پہاڑی 'ہستی' واقع کے متعلق یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہرکلا نے اس پہاڑی پر سے ایک سوراختیوں کو نیچے پھینک دے جانے کا حکم دیا تھا اور ان کی جگہ گسادہ چھین کو مین کر خوش ہوتا رہا تھا۔

سفید ہنوں کے بعد کشمیر پر کشمیری کے جو ہندو راجا حکومت کرتے رہے ہیں ان میں نے وہ دور بے شکادہ کے علاوہ پراور سین (ثانی) کا نام بھی ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اسی راجہ نے کشمیر میں

کشیون کا پہلا پل بنوانے کے علاوہ قبضہ اسی جگہ اپنی راجدھانی بھی تعمیر کر لئی تھی جہاں آج مسی نگر آباد ہے۔

کشمیر پر وہاں کے راجاؤں کی چار ہزار سالہ حکومت کے سلسلے میں جوتائی سلووات و ستیا پھرتی ہیں ان کی زندگی میں اس عہد کے مذہبی، اقتصادی اور سماجی زندگی کے متعلق کوئی فکس رائے تو قائم نہیں کی جاسکتی لیکن کہیں انداز کے بعد کے مؤرخین کی تقریرات سے یہ نتیجہ ضرور اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ان میں مذہبی رسوائی موجود تھی اور اپنی ضرورتوں کے متعدد ہونے کے باعث وہ نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ پھر چونکہ عہدِ قدیم کے حکمرانوں کے ذہن میں حکومت اور دیانت کا وہ تصور بھی نہیں تھا جس سے عہدِ وسطیٰ کے حکمرانوں کو عوام سے علیحدہ کر دیا تھا اس لئے اس دور کے راجا اور بادشاہ خود گروہام کے ساتھ وابستہ سمجھتے تھے اور ان کی ضرورتیں بھی عوام کی ضرورتوں سے کچھ زیادہ اور مختلف نہیں تھیں۔ وہ خود بھی عوام کے ساتھ ملے جلے تھے اور لوگوں کو بھی ان تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ اس زمانہ کے متعلق ہومان سنگ نے لکھا ہے کہ — لوگ خوش حال اور امن پسند تھے، ہر پیر اور کشمیر کے مغرب اور جنوب کے علاقے شاہانِ کشمیر کی قلم زد ہیں شامل ہیں — لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں کشمیر کے باشندے آج کی طرح صنعتوں اور دستکاریوں سے واقف نہیں تھے اور ان کی معاشی اور اقتصادی زندگی کا تمام تر انحصار کاشتکاری اور اس کی بدولت حاصل ہونے والی پیداوار ہی پر تھا۔ اس کے باوجود ثقافتی اور علمی ترقی کے میلان میں اس عہد کے کشمیریوں نے اپنے لئے ایک بلند و بالا امتیازی مقام پیدا کیا تھا۔

اس زمانہ میں کشمیریوں کی ثقافتی ترقی کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ علم و فن کی کوئی معلوم شاخ ایسی نہیں تھی جس کا مطالعہ کشمیر کے اہل علم نے نہ کیا ہو اور انھوں نے فلسفہ، مذہب، علمِ ادب، سنگ تراشی، علم نجوم، انجیرنگ نیز زندگی کے دوسرے شعبوں میں جو ترقیاں کی تھیں ان میں سے بعض پر آج بھی فخر و مباهات کا اظہار کیا جاسکتا ہے۔ اس زمانہ کے کشمیری ادبِ عام و علم

نے جو کتابیں لکھی تھیں آج وہ ناپید ہو چکی ہیں۔ لیکن ان میں جو کتابیں انقلاب روزگار کی دست برد سے محفوظ رہ سکی ہیں ان کا مطالعہ کثیر کے تھاق ماضی کی درخشاں کی نشان دہی کرتا ہے۔ مثلاً مذہب میں اس دور کے کثیر علماء نے ایک ایسے نئے فلسفے کا اضافہ کیا تھا جو وحدت وجود کا داعی اور دیانتی فلسفے سے مختلف تھا۔ فلسفہ کثیر شپوائٹ یا 'ترکیا' کے نام سے موسوم اور خود فکر کی گراہیوں اور جدت خیال کا منہر ہے اور حال ہی میں ریاست کے 'ریسرچ ڈیپارٹمنٹ' کی بدولت مغربی دنیا کی توجہ بھی اس فلسفے پر مبذول ہوئی ہے اور یہ وقت کے بہت سے ممتاز مفکروں اور علماء کے لئے دلچسپی کا موجب بنا ہوا ہے۔

کثیر شپوائٹ کے مدد سے خیال کا سبب دنیا دور سو گیتا نے آٹھویں صدی عیسوی میں لکھا تھا اور اسپانڈاکاریکا کے نام سے اس موضوع پر ایک اہم کتاب بھی تلمبند کی تھی جس کے بعد گیارھویں صدی کے ادوار تک متعدد اہل فکر و قلم اپنی محققانہ تقریرات سے اس موضوع کی نزوت مندی میں اضافہ کرتے رہے۔

اس عہد کے کثیر شاعر و ادیب کے زاویہ نظر سے بھی سب حد ترقی یافتہ تھے چنانچہ فن شعر پر دامن بھٹ نے 'کوی الزکار' اور رتن نے 'سرنگر تلک' دھا کا سنہ 'الکار وراستو' اور مہمانا نے 'کوی پرکاش' ایسی کتابیں لکھ کر اپنی صلاحیتوں کا ثبوت دیا تھا اور چپان تلک اپنی ترقی کا تعلق ہے اس کے ثبوت میں بیہم بھٹ کی کتاب 'راولن ارجنہ' دامودر گپت کی تصنیف 'کنچ ماما' رست اکری ہر سچ، نیز کالی داس کی کتابوں پر دلچہ دلہ کے حاشیوں اور قصص و حکایات میں سوم۔ دیو کی دلکھا سرت ساگر کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ اور سوم دیو کی اس کتاب کے مختلف حصوں کا بہت سی دوسری زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ اسی قلم نہیں بلکہ اس دور کے کثیر ادیب علم نے زبان کے اصول اور قواعد کی ترتیب و تدوین میں بھی قابل ذکر حصہ لیا تھا۔ چنانچہ بعض محققین کی رائے یہ ہے کہ ولادت مسیح سے پہلے مشہور قواعد داں پتانی کی ولادت بھی کثیر ہی میں ہوئی تھی اور بعد میں بھی کثیر

ہیں چندرا، کشراسوامی، وامن، اور گیتا جیسے ممتاز قواعد و ان پیدائش ہوتے رہے ہیں۔

عہد قدیم کے کشمیر میں طب اور جراحی کے علم اور فن نے بھی بہت زیادہ ترقی کی تھی چنانچہ اس سلسلہ میں تہری اور چرک نے متعدد کتابیں بھی لکھی تھیں اور طب اور جراحی پر چرک کی لکھی ہوئی کتاب آج بھی اس علم و فن کی کتابوں میں ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ علم نجوم کا مطالعہ کشمیری پندتوں کا ایک محبوب اور مخصوص مشغلہ رہا ہے۔ چنانچہ آج بھی ہندوستان میں علم نجوم کے سلسلے میں بھاسکر اچاریہ، آریہ بیٹ اور رتن کنھ کی کتابوں کو سند کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

کشمیری ادب باب علم و قلم کی پروازِ فکر مذکورہ علوم و فنون ہی تک محدود نہیں رہی تھی بلکہ انھوں نے جنسیات، محبت اور سیاسیات ایسے عنوان پر بھی قلم اٹھائے تھے اور راجہ واسدیو کی 'کام شناسٹر' کوکا پٹنٹ کی 'کوک شناسٹر' نیز سیاسیات میں رام چندر بیٹ اور 'ننڈ کی تحریرات ان مسائل پر ان کی مکمل دسترس اور قدرتِ تحریر کی شاہد ہیں اور اس عہد کے فن تعمیر اور سنگ تراشی کی ترقی کے ثبوت میں 'مارنڈ' اور 'نئی پورہ پٹن' اور 'نگٹ' یا 'نارن ناگ' کے ان آثارِ قدیمہ کو پیش کیا جا سکتا ہے جو صدیوں تک انقلابِ روزگار سے گزرتے رہنے کے باوجود آج بھی اپنے بنانے والوں کی بے پناہ قوتِ عمل، عظمت اور بلندیِ فکر و نظریہ کو اجی دے رہے ہیں۔

چودھویں صدی عیسوی کے آغاز تک پچھلے چار ہزار سال کی مدت میں کشمیر میں جو انقلابِ تاریخی مت برپا ہوتے رہے تھے ان کی بدولت کشمیر کی تاریخ میں کوئی نیا عنصر داخل نہیں ہوا تھا اور اگرچہ اشوک اعظم اور اس کے جانشینوں کے دورِ حکومت میں وہاں بودھ مت کو پہونچنے کا موقع ضرور حاصل ہوا تھا لیکن اسے وہاں تک پہونچانے اور فروغ دینے والے بھی برصغیر ہند کے رہنے والے اور زندگی کی بنیادی قدروں میں کشمیر کے باشندوں کے ساتھ متحد الخیال تھے۔ لیکن چودھویں صدی کے آغاز میں کشمیر کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوا اور کشمیر کی عتباتِ حکومت چار ہزار سال کے بعد مسلمانوں کے ماتحتی میں پہونچ گئی۔

کشمیر کے نامور حکمرانوں میں آخری حکمران دودہ رانی کا نام قابل ذکر ہے۔ یہ رانی سنہ ۱۵۹۹ء سے سنہ ۱۶۰۵ء تک حکمران رہی تھی اور اس کے بعد حکومت پر سلطان محمد غزنوی نے کشمیر پر حملہ کیا تھا لیکن اسے ناکام ہو کر واپس چلے جانا پڑا تھا۔ دودہ رانی کے بعد کشمیر میں جو خاندان برسر حکومت آئے اول تو وہ اپنی جگہ کمزور رہے اور دوسرے کشمیر کے مغتوحہ علاقوں کے باشندوں ہیں انہوں نے کاجڑیہ بیاد رہتا جا رہا تھا اور دودہ رانی کی بنیادوں نے مرکزی حکومت کو کمزور بنا دیا تھا۔ اس پر آشوب دور میں صرف قوت و طاقت کی بنا پر کشمیر میں یکے بعد دیگرے بہت سے خاندان برسر حکومت آئے لیکن ان میں سے کوئی خاندان اور کسی خاندان کا کوئی حکمران بھی مرکزی حکومت کی قوت و طاقت کو بحال کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا اور سب سے آخر میں برسر حکومت آنے والے و امر خاندان کے متعلق تو یہ بات مشہور ہے کہ وہ قتل و غارتگری، آتش زدگی، لوٹ مار اور جنگ و جدل کا ماہر تھا۔

اس کم و بیش دو سو سال کے پر آشوب زمانے کے اواخر میں کشمیر کی عنایتی حکومت راجہ سہما دیو کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ اس کا دور حکومت سنہ ۱۶۰۵ء سے سنہ ۱۶۳۵ء تک قائم رہا تھا۔ اس کے زمانہ میں تبت کے ایک بودھ شہزادہ رپن شاہ، دوستان کے حکمران شکر چک اور سوات کے ایک درویش مکے پہنچے شاہ میر یا شاہ مرزا نے کشمیر میں آکر پناہ لی تھی اور اسی سرزمین کو اپنا وطن بنالیا تھا اور آئندہ چل کر یہی لوگ کشمیر کے تاریخی واقعات کے حوالے سے کافی حد تک بدل دینے کے سوجیت ثابت ہو گئے تھے۔ کشمیر ابھی داخلی بلا یعنی اور افغانوں کی باہمی کشمکش کے دور سے گزری رہا تھا کہ اس کے اس انتشار سے فائدہ اٹھا کر تاتاریوں یا ترکوں کے سردار ذوالقادر خان نے اس پر حملہ کر دیا اور راجہ سہما دیو مقابلہ کا تاب نہ لا کر اپنے وزیر رام چند اور اہل خاندان کے ساتھ فسرار ہو کر گشت و اثر میں پناہ گزین ہو گیا لیکن کچھ روز کے بعد جب تاتاری حملہ آور چلے گئے تو رام چند نے واپس آکر اپنے راجہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ مگر حصول تخت و تاج کی اس کشمکش میں رام چند بھی کامیاب نہیں ہو سکا اور رپن شاہ نے اسے قتل کر کے نہ صرف اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا بلکہ رام چند کی

دختر کوتارانی سے شادی بھی کر لی۔ مگر ملک میں اس کی مخالفت جاری رہی اور اسی مخالفت کے رد عمل کے طور پر ایک روز اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ نہ صرف اپنا مذہب ہی تبدیل کرے گا بلکہ دوسری جمیع کو سب سے پہلے جو شخص اسے نظر آئے گا وہ اسی کا مذہب اختیار کر لے گا۔ چنانچہ دوسری جمیع کو اس کے سامنے سے جس شخص کا گذر ہوا وہ بلبل شاہ نامی ایک مسلمان درویش تھے۔ رہنم شاہ نے ان ہی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور اپنا نام بدل کر صدر الدین رکھ لیا۔ مگر کم و بیش دو سال کے بعد ۱۳۲۶ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

راجہ سہادیو کے ساتھ فرار ہو کر کشت واد چلے جانے والے لوگوں میں اس کا بھائی ادیان دیو بھی شامل تھا۔ صدر الدین کی موت کے بعد ادیان دیو نے واپس آکر اپنی حکومت قائم کر لی اور صدر الدین کی بیوہ کوتارانی سے شادی کر کے پندرہ سال تک کشمیر پر حکومت کرتا رہا اور اس کی موت کے بعد جب کوتارانی نے حنائی حکومت اپنے ہاتھوں میں لی تو شاہ میر نے اسے مغلوب کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ یہی شاہ میر جس نے شمس الدین کا لقب اختیار کر لیا تھا سلاطین کشمیر کے اس سلسلے کا بانی ہے جس کے افسر ائمہ ڈھائی سو سال تک کشمیر پر حکومت کرتے رہے تھے۔

جسٹ منلیہ کے مشہور مؤرخ فرشتہ نے سلاطین کشمیر کے جو حالات قلمبند کئے ہیں ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے کے دو بادشاہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے پہلا بادشاہ سکند تھا۔ سکند تاریخ میں 'بت شکن' کے لقب سے مشہور ہے اس کی مذہبی عدم رواداری سے متاثر ہو کر کشمیری پنڈتوں کے بہت سے خاندان ترک وطن کر کے پنجاب اور یوپی میں آباد ہو گئے تھے جس سے کشمیر کی صنعت اور حرفت کو بھی بے حد نقصان پہنچا تھا۔

سلاطین کشمیر کے سلسلے میں دوسرا قابل ذکر حکمران سلطان زین العابدین تھا۔ زین العابدین کے متعلق اس کے عہد کے مشہور قائل نگار اور راج ترنگنی کی تیسری جلد کے ٹولف سری در نے لکھا ہے کہ — میں اس مختصر تقریب میں اس کی بہ شمار خوبیوں کا احاطہ کس طرح کر سکتا ہوں؟ اس نے

میں اس کتاب میں اس کے محاسن کی اسی طرح تصویر کشی کرتا ہوں جس طرح ہمارے بابتیوں دنیاؤں یا پھر آئینہ میں پڑتے ہوئے سورج کے عکس کو کسی تصویر میں دکھایا جاتا ہے۔ جس طرح تاجر ترازو کے دونوں پلڑوں کو متوازن رکھتے ہیں اسی طرح بادشاہ بھی ملکی منظم و نسق میں عدم توازن اور عدم مساوات کو جائز نہیں رکھتا اور جس طرح شیر ریشیوں کی گچھاؤں کے قریب رہنے والے پُرامن چوپاؤں پر حملہ نہیں کرتا اسی طرح توراسک (ترک) جو پہلے برہمنوں پر ظلم و ستم کرتے رہتے تھے اب انھیں نقصان نہیں پہنچاتے۔ اس بلجگ میں بادشاہ کا بابرکت خزانہ حکومت، ستیہ یگ کے شباب کی کسی حکومت کے مقابلے میں کسی طرح بھی کم نہیں ہے۔

زین العابدین کے دور حکومت میں جو بیس سال کے بعد مسلمانوں میں ختم ہوا تھا نہ صرف بہت سے تارک وطن برہمن ہی واپس آگئے تھے بلکہ جنوب سے بہت سے ہندو فضلاء بھی کثیر چلے گئے تھے۔ اس نے فارسی زبان کی ترویج کے ساتھ ساتھ مسکرت کی سرپرستی بھی کی تھی۔ اس نے ہندوؤں کے لئے ملازمتوں کے دوازے کھول دئے تھے۔ شاہی خزانے سے ہندوؤں کی عبادت گاہوں کی مرمت کرائی تھی جن میں ننگر اچاریہ کا مندر بھی شامل تھا اور اس طرح اس نے ہندوؤں کو از سر نو کشمیر میں آباد کرنے کے لئے ہر ممکن طریقے پران کی ہمت افزائی کی تھی۔

سلطان زین العابدین نے کشمیر کی حسین وادی میں بہت سی نئی صنعتوں اور دستکاریوں کو بھی متعارف اور مقبول بنایا تھا۔ اس نے ایران، ترکستان اور ہندوستان سے متماز صنعت کاڈ کو کشمیر بلا کر اچھن ومان بسایا تھا۔ چنانچہ کاغذ سازی اور گئے ہوئے کاغذ سے مختلف چیزیں بنانے کی صنعت اور لیٹم کے کپڑوں کی پروکشن و پرداخت نیز شمال پانی کی دستکاریاں اسی کے مہار دور کی یادگار ہیں۔ اسی کے زمانے میں بانہ پانی کے فن کو بھی بے حد ترقی حاصل ہوئی تھی اور اس نے وادی میں بہت سے پھل دار درخت لگوائے تھے۔ اسی قدر نہیں بلکہ سلطان نے بنو العابدین کو تعمیرات سے بھی بے حد دلچسپی تھی۔ چنانچہ اس نے تاجروں اور مسافروں کی سہولت اور

ادب آرام کے سلع راستوں پر بہت سی کالواں سرانیں تعمیر کرائی گئیں اور بہت سی نہریں اور پل بنوا کر آبپاشی اور آمد و رفت کے وسائل کو ترقی دی گئی اور اسی کے زمانہ میں حبیل ڈل کے پانی کے نکاس کے اس راستہ کو بند کر کے جو اسے جہلم میں لے جاتا تھا اس حبیل کے پانی کو نہر میں پہنچایا گیا تھا اور اس نہر پر برسات کے لئے پختہ پل تعمیر کرائے گئے تھے۔ سلطان نے وادی میں تانے کی کامیں بھی دیکھتے کی تھیں اور وہ خود ان ہی کی آمدنی پر اپنی زندگی بسر کرتا تھا۔

سلطان زین العابدین کا دور حکومت دراصل کثیر کے میاری ادب کے فروغ اور اس کی روحانی، اخلاقی اور مذہبی فلاح کی نشاۃ ثانیہ کا دور تھا اور اسلام نے ہندو مذہب اور فلسفہ پر اپنے جوتوش قائم کئے تھے زین العابدین کے دور حکومت میں وہ اپنی پوری تابانی کے ساتھ ابھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کثیر میں مسلمانوں کی حکومت کے قیام سے پہلے ہی مسلمان دہاں پھیلنے لگے تھے۔ چنانچہ رچن شاہ کو بھی ایک مسلمان درویش ہی نے اسلام کے دائرہ میں داخل کیا تھا۔ مسلاہین کثیر کے بانی شمس الدین کے سب سے چھوٹے پوتے سلطان قطب الدین کے عہد حکومت میں تیمور لنگ کے دستِ تعدی سے بچنے کے لئے وسط ایشیا کے متنازع درویش سید علی ہمدانی کثیر آئے تھے اور اگرچہ اس وادی میں ان کا قیام بہت ہی مختصر رہا تھا لیکن وہاں ان کے بہت سے متعقد پیدا ہو گئے تھے اور ان کے بعد بھی سدھ بے، شیو یوگی، لال دیہ اور نند رشی ایسے مونی منش بزرگ کثیر کی پُرسکون وادی میں اپنے خیالات کی اشاعت کرتے رہے تھے۔ چنانچہ زین العابدین کے زمانہ میں جو مذہبی تنگ نظری سے پاک تھا ان خیالات کو بے حد فروغ حاصل ہوا اور اسلام اور ہندو دھرم کے فلسفوں کے اخلاط سے جھگڑا، یعنی محبت کے نام سے خدا پرستی کی ایک نئی ترکیب کا ظہور ہوا۔ ان درویشوں اور صوفیوں کے اقوال اور خدا کی عبارت، یعنی نوع انسان کی خدمت اور مخلوق کے ساتھ محبت کی تعلیم کے حامل گیت آج بھی کثیر کی مسندوں میں مقبول اور کثیر کے باشندوں کی زندگی پر اثر انداز ہیں۔ کثیر میں

کی موجودہ سماجی اور سیاسی زندگی بھی ان ہی سے متاثر ہے اور کشمیر کے اس معمولی رہنما کے سلسلے میں
مسلمان زمین العابدین کا نام ہمیشہ یاد گار رہے گا۔ اسی کے بعد حکومت میں ملا احمد کشمیری نے ہماچل
کو فارسی کا جامہ پہنایا تھا اور لیتا دتہ کی طرح اس نے بھی تبت اور پنجاب کو فتح کر کے اپنی قلمرو
کو دست دی تھی۔

زمین العابدین کی وفات کے بعد سلاطین کشمیر کا سلسلہ اس کے بانی سلطان شمس الدین کے
خاندان ہی تک محدود نہیں رہا تھا بلکہ وردستان کے چکوں نے جو مذہباً شیخ تھے اس خاندان کے آخری
نزدیک واکراؤں کو زیر کر کے کشمیر میں اپنی حکومت قائم کر لی تھی لیکن چکوں کی حکومت سے پہلے باہر کے
ایک رشتہ دار اور مشہور تاریخ ریشی کے مصنف مرزا محمد حیدر و غلات نے پہلے تو ۱۳۲۶ء میں
لداخ کی طرف سے کشمیر پر پوروش کی تھی اور دوسری مرتبہ ۱۳۵۷ء میں جنوب کی سمت سے حملہ کر رہا
کہ کشمیر پر قبضہ کر لیا تھا اور ۱۳۵۸ء میں اپنی موت کے وقت تک وہاں ہالیوں کے نام پر حکومت کرتا
رہا تھا اور ۱۳۵۸ء سے وہاں چک شیوں کی حکومت کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ ۱۳۵۸ء میں
شہنشاہ اکبر کے احمقوں آخری چک سلطان یعقوب خاں کی شکست پر ختم ہو گیا تھا اور اس وقت سے
۱۳۵۸ء تک کشمیر ہندوستان کے ایک صوبے کی حیثیت سے مغلیہ سلطنت میں شامل رہا تھا۔
مغلوں کا دور حکومت ہندوستان کے دوسرے حصوں کی طرح کشمیر کے لئے بھی ترقی افزا
اور استعلائی مظہر و نسق کا دور تھا۔ شہنشاہ اکبر کے وزیر مال ٹوڈرل نے وادی کے وسائل آمدنی کا
جائزہ لے کر محاصل کا تہیتی اور ان کی وصولیابی کا ایک مستقل نظام قائم کیا تھا۔ شہنشاہ جہانگیر کو
اس وادی کے ساتھ بے حد شغف تھا۔ اس نے وہاں بہت سے باغات لگوائے تھے۔ موسم گرما میں
قیام کے لئے تفریح گاہیں تعمیر کرائی تھیں اور جمیل ڈل کے کناروں پر پھولوں کے جڑے، باغات لگوائے
تھے ان میں روزانہ گلاب اور پید شک کے زک لاکھ پھول کھلتے تھے اور ان میں سے بعض باغات
آج بھی اپنی دل کشی کی بدولت جہانگیر کی یاد کو تازہ کرتے ہیں۔ سری نگر کی مشہور پتھر مسجد

نور جہاں نے تعمیر کرائی تھی حتیٰ کہ جہاں گیر کا انتقال بھی کشمیر سے لاہور واپس آتے ہوئے کشمیر کی سرحد پر ہوا تھا۔

جہاں گیر کے جانشین شاہ جہاں کے عہد حکومت میں بھی کشمیر کی ترقی اور تعمیر کی رفتار قائم رہی اور وہاں کی خوبصورت عمارات اور حسین باغات میں اضافہ ہوا۔ حتیٰ کہ کشمیر کے محل گورنر یا صوبیدار علی مردان نے ہندوستان سے کشمیر جانے والے اس راستہ پر جو پیہ پنبال کے پہاڑوں سے گزرتا ہے مسافروں کی سہولت اور آرام رسانی کے لئے بہت سی کارواں سرائیاں بھی تعمیر کرائیں اور جہاں تک اورنگ زیب کے دور حکومت کا تعلق ہے ڈاکٹر فرانسس برنیر نے اس دور کے کشمیر کی ترقی کی تصدیق کی ہے لیکن اورنگ زیب کے بعد جب دہلی کی مرکزی حکومت میں ضعف اور انحطاط رونما ہونے لگا تو اٹھارویں صدی عیسوی کے تقریباً وسط میں ہندوستان کا یہ دور افتادہ صوبہ بھی عملاً خود مختار ہو گیا اور اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر ۱۷۵۷ء میں احمد شاہ درانی کی قیادت میں افغانوں نے اس پر حملہ کر کے وہاں افغانوں کی حکومت قائم کر لی۔

کشمیر پر افغانوں کی حکومت کا زمانہ کم و بیش ستر سال ہے۔ اس زمانہ میں ہزاروں سال کے بعد پہلی مرتبہ ہندوستان سے اس سرزمین کا تعلق منقطع ہوا تھا۔ لیکن یہ غیر ملکی حکومت ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے باشندوں کے دلی تعلق کو مستطیع کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ یہ دور مذہب و ملت کے امتیاز کے بغیر کشمیر کے تمام باشندوں کے لئے سعوت ترقی بنانا اور آزمائش کا دور تھا۔ کشمیر کے غیر ملکی حکمرانوں کو کشمیر کی فلاح و بہبود سے کوئی واسطہ نہیں تھا اور اس دور میں یہ چین وادی لوٹ مار اور غارتگری کا میدان بنی رہی تھی۔

یہ دور ہندوستان کی تاریخ کا وہ دور تھا جب دہلی کی محلی حکومت ضعف اور زوال کی آخری منزلیں طے کر رہی تھی۔ ملک پر انگریزوں کی گرفت مضبوط تر ہوتی جا رہی تھی اور پنجاب میں مسالہ رجحیت سکھ کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ اس طرح کشمیر کے قریب تر ایسی ہندوستانی حکومت جو کشمیر پر

کو غیر ملکی حکومت سے نجات دلا سکتی تھی ہمارا جہ رنجیت سنگھ ہی کی حکومت تھی۔ چنانچہ کشمیر کے باشندوں نے جن کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی، افغانستان کی مسلم حکومت سے اپنا رشتہ توڑ کر اسے از سر نو ہندوستان کے ساتھ جوڑنے کی نیت سے پینڈت بیربل دھر کی معرفت ہمارا جہ رنجیت سنگھ سے امداد کی درخواست کی۔ اس طرح سکھ فوج نے پہلی بار پیر پتال کے پہاڑوں سے گذر کر ۱۸۱۷ء میں کشمیر پر یورش کی لیکن یہ ہم کامیاب نہیں ہو سکی مگر ۱۸۱۹ء میں جب ہمارا جہ کے ممتاز ترین جرنل سرری دیوان چندا دیو کے ڈگریہ سردار گلپت سنگھ نے جو ہمارا جہ کے درباریوں میں شامل تھا دوبارہ کشمیر پر حملہ کیا تو آخری افغان صوبیدار کو شکست ہو گئی اور کشمیر سکھوں کی حکومت میں آ گیا اور اس طرح کم و بیش سات دہائیوں کے بعد کشمیر پھر ہندوستان کا ایک جزو بن گیا۔ لیکن اول تو ابھی کشمیر پر سکھوں کی حکومت کو بجائے خود استقلال حاصل نہیں ہو سکا تھا اور دوسرے تقریباً دو دہائیوں کے بعد ہی سکھوں اور انگریزوں کی جنگ کے نتیجے میں پنجاب سے سکھوں کا اقتدار بھی ختم ہو گیا تھا اور اسی آخری واقعہ کے نتیجے میں کشمیر کو ایک نئی حکومت کے ماتحت چلا جانا پڑا تھا، لیکن کشمیر کی تاریخ کے اسی مرحلہ سے ان واقعات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جس کے ساتھ اس کے بعد ضرر کی تاریخ وابستہ ہے اس لئے انہیں جدا گانہ اور کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

دوسرا باب

سکھ اور دوگر حکومتیں

کشمیر پر سکھوں کا تسلط ۱۸۱۹ء میں قائم ہوا تھا اور ۱۸۴۶ء میں ختم ہو گیا تھا۔ اس لئے جہاں تک سکھ حکومت کی مدت کا تعلق ہے اسے کشمیر کی تاریخ میں کوئی خصوصی اہمیت نہیں دی جاسکتی لیکن یہ حکومت اس لحاظ سے ضرور قابل ذکر ہے کہ اول تو اس کی بدولت کشمیر کو افغانوں کی غیر ملکی حکومت سے نجات حاصل ہوئی تھی اور اسے اندر تو ہندوستان کے ساتھ وابستہ ہونے کا موقع ملا تھا اور دوسرے اسی حکومت کے خاتمہ پر وہاں دو گروں کی وہ حکومت قائم ہوئی تھی جس کے دور میں وہاں کے عوام میں وہ سیاسی اور سماجی شعور پیدا ہوا تھا جو انجام کار اس صدی میں کشمیر کی تمام تر سیاسی تحریکات اور ہندوستان کے ساتھ اس کے قطعی الحاق کی بنیاد ثابت ہوا ہے۔ اس طرح کشمیر میں سکھوں کے دور حکومت کو بجا طور پر پدموری دور کہا جاسکتا ہے اور یہی وہ دور ہے جو ایک طرف تو کشمیر کے ماضی کو اس کے حال سے جلا کرتا ہے اور دوسری طرف اسی دور کے توسط سے ماضی اور حال کا تعلق قائم ہوتا ہے۔

داؤدی کشمیر ہندی سمت میں جن برف پوش پہاڑوں سے گھری ہوئی ہے ان کے دامن سے شروع ہو کر پنجاب کے میدانی علاقہ سے مل جانے والا کوہستانی علاقہ دوگر کہلاتا ہے اور اسی علاقہ کے باشندوں کو دوگرہ کہا جاتا ہے۔ دوگرہ ہندو بھی ہوتے ہیں اور مسلمان بھی۔ یہ لوگ دوگرہ

زبان بولتے ہیں اور ڈوگری زبان سنسکرت پنجابی اور فارسی زبانوں کے الفاظ کا مرکب ہے۔

اٹھارھویں صدی عیسوی کے آغاز میں ایک طرف تو ہندوستان کی منلیہ حکومت کا شیرازہ منتشر ہونا شروع ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اس صدی کی چند و بائوں کے بعد ہندوستان کی منلیہ حکومت کے ساتھ کثیر کا تعلق محض رسمی رہ گیا تھا اور مرکزی حکومت کی اسی کمزوری نیز کثیر کے ساتھ اس کے اس رسمی تعلق یا بالفاظ دیگر خود کثیر کی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اسی صدی کے وسط میں احمد شاہ درانی نے اس وادی پر قبضہ کر لیا تھا اور دوسری طرف وادی کے باہر جنوبی سمت کے پہاڑی علاقہ میں ڈوگریوں کی ایک نئی ریاست کی داغ بیل پڑی تھی اور ایک ڈوگرہ سردار راجہ رنجیت دیو اس نئی ریاست کو مستحکم بنا رہا تھا۔ لیکن حالانکہ اس کے انتقال کے بعد اس ریاست کی علاقائی توسیع رک گئی تھی اور آہستہ آہستہ یہ سکھوں کی یا جگرہ زمین گئی تھی حتیٰ کہ ۱۸۱۲ء میں راجہ رنجیت دیو کے خاندان کے ایک فرد گلاب سنگھ نے ہمارا راجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں ملازمت بھی اختیار کر لی تھی۔ گلاب سنگھ حکومت اور اقتدار کے حصول کا خواہش مند ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہادر سپاہی بھی تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی قابل ذکر فوجی خدمات کی بدولت بہت جلد ہمارا راجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں اپنے لئے ایک ممتاز جگہ حاصل کر لی اور جب ۱۸۲۰ء میں اس نے راجہ دی کے راجہ کو جو سکھوں سے برسرِ جنگ تھا گرفتار کر لیا تو ہمارا راجہ نے خوش ہو کر اسے جہوں کا راجہ بنا دیا اور جب ۱۸۳۹ء میں ہمارا راجہ رنجیت سنگھ کا انتقال ہوا تو سکھ فوج میں سب سے زیادہ یا اثر شہسیت راجہ گلاب سنگھ ہی کی تھی۔

ہمارا راجہ رنجیت سنگھ سے راجہ کا خطاب پانے کے بعد ہی گلاب سنگھ نے ریاست جہوں کی تنظیم اور توسیع شروع کر دی تھی اور اپنی انتظامی قابلیت کی بدولت چند ہی سال کی مدت میں اپنی ریاست کو انتظامی اور مالی اعتبار سے مستحکم بنا لیا تھا اور دس سال کے عرصہ میں وادی کثیر اور جہوں نیز جہوں اور پنجاب کے درمیان واقع تمام چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو فتح کر کے انہیں ریاست جہوں

میں شامل کر لیا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے سپہ سالار ڈوگر سنگھ نے ۱۸۴۸ء میں وسطی تبت پر بھی فوج کشی کی تھی لیکن یہی ہم سردی کی شدت کی بدولت اس کی فوج اور خود اس کی موت کا باعث ہوئی تھی مگر اس نے دلایخ، مغربی تبت اور بلتستان کو فتح کر کے ریاست جموں کے ساتھ ملحق کر لیا تھا اور اس طرح سب اتفاق سے یا پھر راجہ گلاب سنگھ کی بیدار مغزی کی بدولت ۱۸۴۲ء تک داوڑی کشمیر ڈوگرہ ریاست کے درمیان محصور ہو گئی تھی۔

انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں دہلی کی مثل حکومت زوال کی آخری منزل میں پہنچ چکی تھی اور ہندوستان پر عملاً انگریزوں کا تسلط قائم ہو چکا تھا کہ ۱۸۴۸ء کے موسم سرما میں سکھوں اور انگریزوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ اس صورت حال کے پیش نظر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے کمزور جانشینوں نے ۱۸۴۸ء میں راجہ گلاب سنگھ کو وزیراعظم مقرر کر کے اسے انگریزوں کے مقابلے پر سکھ افواج کی قیادت کرنے کے لئے لاہور طلب کیا لیکن گلاب سنگھ حالات کی رفتار کے پیش نظر اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ آئندہ ہندوستان پر انگریز ہی حکومت کریں گے اس لئے وہ اس تصادم میں غیر جانبدار رہتا چاہتا تھا۔ پناہ دہ اس کشمکش میں شریک نہیں ہوا حتیٰ کہ ۱۸۴۸ء میں سہراؤں کی مشہور لڑائی میں سکھوں کو شکست ہوئی اور انگریز فوجوں نے لاہور پر قبضہ کر لیا۔

سہراؤں کی لڑائی میں سکھوں کی شکست کے بعد معاہدہ لاہور کے نام سے انگریزوں اور سکھوں کے درمیان ۹- مارچ ۱۸۴۹ء کو جو معاہدہ ہوا تھا اس کی رو سے لاہور کی سکھ حکومت نے ناوان جنگ کے طور پر ایک کروڑ روپے انگریزوں کو دنیا قبول کیا تھا اور اس رقم کے بالموجہ دریائے بیاس اور دریائے سندھ کے درمیان کوہستانی علاقہ ان کے حوالہ کیا تھا اور اس معاہدہ کی ایک دفعہ کے مطابق یہ بات بھی طے ہوئی تھی کہ برطانیہ، راجہ گلاب سنگھ کے ساتھ ایک جداگانہ معاہدہ کی رو سے جو پہاڑی علاقہ دے گا ان میں اسے آزاد اور خود مختار حکمران کی حیثیت حاصل رہے گی۔ چنانچہ معاہدہ لاہور کی اسی دفعہ کی بنیاد پر ۱۸ مارچ ۱۸۴۹ء کو حکومت برطانیہ اور راجہ گلاب سنگھ

کے درمیان وہ مشہور معاہدہ ہوا جو معاہدہ امرت سر کے نام سے موسوم ہے۔ اس معاہدے کی رو سے برطانوی حکومت نے ۵ لاکھ نانک شاہی روپے یعنی ۵ لاکھ پونڈ کی رقم لے کر وادی کشمیر اور گلگت کو ہمارا راجہ گلاب سنگھ کے حوالے کر دیا اور اس طرح انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں جموں اور کشمیر کی وہ ریاست معرض وجود میں آئی جو جموں کشمیر گلگت، لداخ اور بلتستان پر مشتمل تھی اور جس کے ساتھ گلاب سنگھ کے جانشین ہمارا راجہ رنبیر سنگھ نے یاسن اور وادی دیبل کو بھی ملحق کر دیا تھا لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ڈوگرہ حکومت کی ایک سو سالہ تاریخ کے مطالعہ سے پہلے اس ریاست کے باشندوں اور ان کے حالات پر بھی ایک سرسری نظر ڈالی جائے۔

اس باب کے آغاز میں بتایا جا چکا ہے کہ وادی کشمیر کے جنوب میں جو پہاڑ واقع ہیں۔ ان کے جنوب سے شروع ہو کر پنجاب تک پھیلتے ہوئے کوہستانی علاقہ کو ڈوگرہ اور اس کے باشندوں کو ڈوگرہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ آریہ نسل سے تعلق رکھتے ہیں، جفاکش ہوتے ہیں اور بہت سی ذاتوں اور برادریوں میں منقسم ہیں۔ ڈوگرہوں میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی شامل ہیں لیکن ان سب کی مشترکہ خصوصیت محنت اور جفاکشی ہے۔ ان کی قومی غذا چاول، گندم اور دالیں ہے ان کے لباس میں کوئی قابل ذکر فرق نہیں ہوتا۔ یہ لوگ تمام تہوار اور تقریبات مل جل کر مناتے ہیں اور اس سے ان کی غیر معمولی رواداری اور باہمی خیر سنگالی کے گہرے جذبے کا پتہ چلتا ہے۔

جموں کے برہمن عموماً کاشتکار ہوتے ہیں اور مذہبی رسوم کی ادائیگی کے فرائض برہمنوں کے چند مخصوص خاندان انجام دیتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر لوگ راجپوت زمینداروں کی اراضی کو پٹہ پرے کر کاشت کیا کرتے تھے اور نظام کاشتکاری کے بتری کے زمانے میں انھیں بہت زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ لیکن موجودہ حکومت نے اراضی سے متعلق جو اصلاحات نافذ کی ہیں ان کی بدولت انھیں ہی سب سے زیادہ فائدہ بھی حاصل ہوا ہے۔ ڈوگرہ راجپوت مجید ساوہ مزاج نیز برادری اور خاندان کے رسم و رواج کے سختی کے ساتھ پابند ہوتے ہیں اور

ان میں بھٹی اور سہیل برادریوں کے افراد مسلمان ہوتے ہیں اور اپنی بہادری کی بدولت موماؤ قبیلہ ملازم کرتے ہیں لیکن راجپوتوں ہی کا ایک طبقہ کاشتکاری بھی کرتا ہے۔

ہندوستان کے دوسرے حصوں کی طرح جموں کی تجارت اور کاروبار بھی وہاں کے کھترپوں اور ہماچلوں کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ لوگ بہت زیادہ جفاکش تو نہیں ہوتے لیکن ذہین و جہل ہوتے ہیں اور جموں کے دوسرے باشندوں کے مقابلے میں یہ لوگ زیادہ تعلیم یافتہ بھی ہیں ہندوستان کے دوسرے حصوں کی طرح وہاں ہری جنوں کی بھی ایک محفوظ تعداد آباد ہے جنہیں میگھ چاریا و ممب کہتے ہیں۔ ان کے متعلق بہت سی ایسی روایات مشہور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے آباؤ اجداد راجپوت یا برہمن تھے لیکن یا تو بعض حالات سے مجبور ہو کر انھوں نے دستکاری کو اپنا پیشہ بنالیا تھا یا کسی عذر کی بنا پر انھیں برادری سے خارج کر دیا گیا تھا اس لئے انھوں نے میگھ کے نام سے اپنی ایک الگ ذات بنالی تھی۔ یہ لوگ صدیوں تک اپنے بہت سے سماجی اور مذہبی حقوق سے محروم رہے ہیں۔ لیکن اب تعلیم کی بدولت ان کی سماجی حیثیت بلند ہوتی جا رہی ہے۔ ان میں سے بیشتر لوگوں کا پیشہ زراعت ہے لیکن کچھ لوگ جوتے بنانے اور غلات اٹھانے کے کام بھی کرتے ہیں۔ جنہوں کے ان تمام باشندوں کی زبان ڈوگری ہے۔

صوبہ جموں کے بیرونی اضلاع نیز وادی کشمیر کے سرحدی علاقے کو ہستانی ہیں اس لئے وہاں کے بچے داسے پہاڑی کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ بہت زیادہ قوی اور محنتی ہوتے ہیں اور پھیل پہاڑی ڈھلوانوں میں کاشت کر کے گزر اوقات کرتے ہیں اور چونکہ اس علاقہ کے طبعی حالات کی بدولت آمدورفت اور خبر رسانی کے ذرائع بہت ہی محدود ہیں اور وہاں کے باشندوں کے لئے ایک بستی سے دوسری بستی تک پہنچنا بھی مشکل ثابت ہوتا ہے اس لئے وہ اقتصادی طور پر بے حشریب اور سماجی طور پر بے حد پس ماندہ ہیں اور اس علاقے میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ پہاڑی کہلاتی ہے لیکن درحقیقت وہ ہندی پنجابی، ڈوگری اور سنسکرت کا مرکب ہے۔ اس علاقے میں کشمیری آباد کاری

اگر آباد ہو گئے ہیں۔ انھوں نے بھی اسی علاقے کے باشندوں کا لباس اختیار کر لیا ہے اور وہ ایک ایسی زبان بولتے ہیں جو پہاڑی اور کشمیری زبانوں کے اختلاط سے بنی ہے۔

گوجر اور گادی بھی پہاڑی قبائل ہی میں شامل ہیں یہ لوگ مولتی پائے اور نیم خانہ بدوش کی زندگی گزارتے ہیں۔ گوجر مذہباً مسلمان، خوش معاملہ اور خوب صورت ہوتے ہیں اور گرمی کے موسم میں جموں سے کشمیر کے پہاڑوں میں جا کر رہنے لگتے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ان کے آباد اجداد راجستھان سے آکر جموں میں آباد ہو گئے تھے۔ ان کی زبان گوجری کہلاتی ہے اور تحقیقات سے ثابت ہو چکا ہے کہ ان کے قبیلے ہاقی زبان ہی کی ایک شکل ہے۔ یہ لوگ اگرچہ جموں اور کشمیر کے ہر حصہ میں پائے جاتے ہیں لیکن ان کی بیشتر آبادی پونچھ، رائسی اور منظر آباد کے اضلاع میں ہے۔

وادی کشمیر کے اصل باشندے جسمانی ساخت اور خدخال کے لحاظ سے ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ لوگ وحیمہ اور خوش رنگ ہوتے ہیں۔ تفریح اور خوش وقتی ان کے خیر میں داخل ہے اور جیسا کہ کشمیر کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے ان کی ذہانت اور طباعی سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی اصل نسل کے سلسلہ میں متعدد روایات مشہور ہیں جن میں سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ بنی اسرائیل کا جو قبیلہ لاپتہ ہو گیا تھا اسی قبیلہ کے افراد کشمیر وادی کے آباد اجداد تھے۔ لیکن ان کی جسمانی ساخت اور زبان کے پیش نظر اس امر پر اتفاق رائے کیا جا چکا ہے کہ وہ اسی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو ہندوستان میں ہندو ریائی، قسم کی زبانیں لائے تھے۔ لیکن یہ بات ابھی تک اختلاف کا موجب بنی ہوئی ہے کہ یہ لوگ کشمیر میں کب اور کس راستہ سے پہنچے تھے۔ بہر حال اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اب تک اپنی ثقافتی خصوصیات کو قائم رکھتے چلے آئے ہیں اور انھوں نے ماضی میں جس تہذیب کو جنم دیا تھا اگر انھیں جدید قدیم میں اس وادی سے باہر ربط اور تعلق قائم کرنے کی سہولتیں حاصل ہوتیں تو وہ تہذیب دنیا کی تاریخ پر زیادہ گہرے اور درخشاں نقش ثبت کر سکتی تھی۔

کشمیر کے باشندوں میں وہاں کے برہمنوں کو جنھیں کشمیری پنڈت کہا جاتا ہے ایک ممتاز

بلقہ کی حیثیت حاصل ہے اور انھیں وادی میں آکر آباد ہونے والے آریوں کی نجیب الطرفین اولاد یقین کیا جاتا ہے۔ چودھویں صدی عیسوی کے آغاز میں بعض سلاطین کشمیر کی دست درازیوں سے تنگ آکر کشمیری پنڈتوں کے بعض خاندان ترک وطن کرنے پر مجبور ہو گئے تھے لیکن جب سلطان زین العابدین کے دور حکومت میں ان تارکین وطن میں سے بہت سے لوگ واپس چلے آئے تو مقامی برہمنوں کے مقابلہ میں جو مال ماسی کہلاتے تھے یہ واپس آنے والے لوگ بھان ماسی کہلانے لگے لیکن ان کے درمیان شادی بیاہ پر کوئی پابندی نہیں کشمیری پنڈت عموماً صاحب علم ہوتے ہیں اور سرکاری ملازمتوں پر فائز رہے ہیں۔

مسلمانوں کے عہد حکومت میں جن بہت سے کشمیری پنڈتوں نے مسکرت کے مطالعہ سے دست کش ہو کر فارسی پڑھنا شروع کر دیا تھا اور سرکاری ملازمت ہی کو اپنا پیشہ بنالیا تھا وہ کارکن کہلاتے تھے۔ ان میں سے بعض نے مذہبی رسوم اور فرائض کی ادائیگی کا کام اپنے برہمنوں کو سپرد کر دیا تھا اور ان کے بدلے پیچھے بچھڑا کہلاتے تھے لیکن آہستہ آہستہ کارکن اور پچھڑے دو جدا گانہ اور مستقل برادریوں میں منقسم ہو گئے اور ان کے درمیان شادی بیاہ کا رشتہ بھی باقی نہیں رہا۔ کشمیری پنڈتوں میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ اور ترقی پسند سرسوت پنڈت ہیں اور ان کا مخصوص پیشہ سرکاری ملازمت ہے۔

سکھ ریاست جوں اور کشمیر میں ایک اقلیتی فرقہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کے واقعات رونما ہونے سے پہلے ان کی بیشتر آبادی ضلع مظفر آباد میں تھی لیکن اب وہ ریاست کے تقریباً ہر حصہ میں آباد ہو گئے ہیں۔ یہ لوگ معنی ہیں اور عموماً کاشتکاری کرتے ہیں۔ لیکن بہت سے سکھ دستکار بھی ہیں اور اب وہ فوج اور پولیس میں بھی بھرتی ہونے لگے ہیں۔

وادی کشمیر میں مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہے اور ان میں سنی مسلمان بہت زیادہ ہیں اور چونکہ کشمیر کے موجودہ مسلمان ہندوؤں ہی میں سے مسلمان ہوئے تھے اس لئے ان کے ناموں کے

ساتھ ڈار اور پھٹ وغیرہ ایسی ان کی قدیم نسبتیں قائم چلی آتی ہیں۔ مسلمانوں میں شیخ، سید اور پیر زادے قابلِ عزت سمجھے جاتے ہیں۔ مسلمانوں میں جو لوگ مذہبی رسوم اور فرائض کی انجام دہی پر مامور ہیں انھیں ملا کہا جاتا ہے اور ان کی ایک مستقل برادری بن گئی ہے۔ یہ لوگ عموماً نذر و نیاز اور خیرات پر زندگی بسر کرتے ہیں لیکن اب ان میں سے بعض لوگوں نے ذرا عت بھی شروع کر دی ہے۔

کشمیر کے سنی مسلمان وادی کے ہر حصے میں پھیلے ہوئے ہیں اور شیعوں کی آبادی بعض تحصیلوں اور دیہات میں محدود ہے۔ پیرپاشی یعنی کاغذ کو گلا کر اس سے مختلف چیزیں بنانے، نیز نشال باقی کی صنعتوں میں انھیں کافی دخل حاصل ہے۔ وادی میں پٹھانوں اور مغلوں کی چپقلہ بستیاں بھی موجود ہیں جو ان کے دورِ حکومت کی یاد دلاتی ہیں۔ لیکن اب یہ لوگ بھی مقامی باشندوں میں مدغم ہو کر رہ گئے ہیں۔ وادی جہلم کے اس حصہ میں جو بارہ مولا کے مغرب میں واقع ہے کھا کھا اور بلو میا نامی دو ایسے قبیلے آباد ہیں جو مہاراجہ گلاب سنگھ کے دورِ حکومت سے پہلے وادی میں آ کر قتل و غارت گری کرتے رہتے تھے۔ ان قبائل کے افراد اب تجارت اور زراعت کرتے ہیں لیکن آج بھی کشمیری عورتیں اپنے روتے ہوئے بچوں کو خاموش کرنے کے لئے انھیں کھا کھاؤں کے آنے کا ڈراوا دیتی ہیں۔ وادی کشمیری میں رہنے والے دو اور قبیلے ڈوم اور گوان کہلاتے ہیں کسی زمانہ میں ان قبائل کے لوگوں کو دوسروں سے کم تر سمجھا جاتا تھا لیکن اب ان کی اقتصادی حالت کے بہتر ہو جانے کے باعث ان کا سماجی درجہ بھی بلند ہو گیا ہے۔

کشمیر میں چوپاؤں یا چریداروں کو ایک مستقل طبقہ کی حیثیت حاصل ہے یہ لوگ پہار کے موسم میں بھیڑ دل اور دوسرے ٹوٹیشیوں کو چراگاہوں میں لے جاتے ہیں اور موسم سرما میں اپنے اپنے دیہات میں رہتے ہیں۔ چوپان اپنی ہی برادری میں نشادی بیاہ کرتے ہیں اور اس معاملے میں بے حد محتاط واقع ہوئے ہیں۔ انھیں بعض جڑی پوٹیوں کی شناخت بھی ہے اور جب

وہ موسم سرما کے آغاز میں پہاڑوں سے واپس آتے ہیں تو دیہاتیوں کے لئے یہ جسطہی بوٹیاں بھی سامنے لاتے ہیں۔ انھیں ان کی محنت کا معاوضہ فصل پر ملتا ہے اور ان میں سے بعض برائے نام زراعت بھی کرتے ہیں کشتیر میں بھانڈیا جگت کھلانے والے لوگوں کی بھی ایک جماعت موجود ہے۔ ان لوگوں کا پیشہ گانا، ناچنا اور نعلین کرنا ہے۔ یہ لوگ دیہات میں گشت کرتے رہتے ہیں اور انھیں تقریبات کے موقعوں پر بھی بلایا جاتا ہے۔

داؤ کی کشتیر کے باشندوں کا کوئی تذکرہ دہان کے مانجیوں یعنی کشتیر اولیہ کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ مانجی کشتیر کے قدیم باشندے ہیں اور راج ترنگنی میں ان کا تذکرہ تشاد کے نام سے کیا گیا ہے ان میں سے بعض خود کو حضرت نورؑ کی اولاد بتاتے ہیں لیکن عام خیال یہ ہے کہ یہ لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہونے سے قبل راجپوتوں کے قبیلہ کشتیری سے تعلق رکھتے تھے چنانچہ آج بھی جب کوئی نیا شخص کشتی رانی کا پیشہ اختیار کرتا ہے تو وہ اسے شورو کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ مانجی بہت سے طبقوں میں تقسیم ہیں اور یہ طبقے ان کی کشتیوں کی اقسام اور استعمال کے ساتھ منسوب ہیں۔ ان میں ناؤ چلانے والوں نے حال ہی میں غلہ اور شہتیر کی تجارت کا پیشہ اختیار کر لیا ہے اور اس کے سبب سے ان کا میاں زندگی بلند ہو جانے کے باعث انھیں مانجیوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ رانی کشتی ران صاف ستھرے اور زیبین ہوتے ہیں اور ہندوستانی کے علاوہ انگریزی بھی رانی کے ساتھ بول سکتے ہیں۔ بہر حال مانجی طاقت ور اور مشقت پسند ہوتے ہیں اور ان کی معاش کا ذریعہ کشتی رانی اور سیاحوں کی خدمت گزاری ہی ہے۔

کشتیر کے باشندوں کی محبوب خوراک چاول ہے۔ ان کا لباس بھی تقریباً ایک ہی جیسا ہے اور شہتیری اور دیہاتی باشندوں کے لباس کا فرق صرف ان کے پیشوں کی ضرورتوں اور اقتصادی حالات کے اختلافات پر مبنی ہے۔ کشتیری زبان عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے کشتیر کے باشندے ذہین ہونے کے علاوہ بہادر بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ اگر ان کی بہادری کے اُن واقعات کو نظر انداز بھی کر

دیا جائے جن کا ثبوت عہدِ قدیم کی تاریخ سے ملتا ہے تو بھی سنہ ۱۹۹۰ء میں انھوں نے قبائلی حملہ آوروں کے مقابلہ میں جس طرح اپنے وطن کی مدافعت کی تھی وہ ان کی جسرات اور دلیری کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔

وادی کے شمال میں جو علاقہ واقع ہے وہ دروستان کہلاتا ہے۔ اس علاقہ کے باشندے مضبوط اور محنتی پہاڑی ہیں۔ سرچارج گریسٹ نے لکھا ہے کہ — لفظ درو کی تاریخ بہت طویل ہے اور درو کے نام سے موسوم لوگ ایک ایسے قدیم قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں جس کا تذکرہ سنسکرت کی کتابوں میں دروا کے نام سے کیا گیا ہے۔ اوریو نائیو نیز رومیوں نے کوہ ہندو کش اور ہندوستان کی سرحد کے ماہین واقع تمام ترکوہستانی علاقہ کو دروستان میں شامل قرار دیا ہے — قدیم زمانہ میں یہ لوگ وادی کثیر میں آکر قتل و غارتگری کرتے رہتے تھے چنانچہ راج نرنگی میں ان حفاظتی تدابیر کی تفصیل بھی ملتی ہے جو ان کی لوٹ مار کی مہموں کے خلاف وادی کے مختلف حکمران اختیار کرتے رہے تھے۔ یہ لوگ ذہین لیکن غصہ ور ہوتے ہیں اور بہت جلد مشتعل ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر لشر کے بیان کے مطابق جس نے سنہ ۱۸۶۲ء میں دروستان کی سیاحت کی تھی۔ یہ لوگ آریہ نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور اسلام قبول کرنے سے پہلے بودھ مت کے پیرو تھے۔ چنانچہ آج بھی ان کی بیشتر رسموں میں بودھ مت کی جھلک نظر آتی ہے اور یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ قدیم زمانہ میں یہ علاقہ بھی کثیر کی تہذیب سے متاثر تھا۔ اس علاقہ کے باشندوں میں سنی اور شیعہ دونوں ہی شامل ہیں اور اس سے متعلق علاقہ ہنزاکے باشندے بھی اپنی خصوصیات کے لحاظ سے دروستان ہی کے باشندوں کے مطابق ہیں لیکن ان کا مذہب علی الہی مذہب ہے۔ ناگا پریت کے مغرب میں ایک طویل علاقے میں جو چلاسی کے نام سے موسوم ہے ایک ایسا قبیلہ آباد ہے جو اپنی دشت اور برپریت کے لئے مشہور ہے اور سنہ ۱۸۶۲ء تک یہ بھی وادی میں آکر قتل و غارتگری کیا کرتا تھا۔

درہستان کا تقریباً پورا علاقہ جنسہ واقع ہوا ہے اور پہاڑی ندیوں کے آس پاس کی اراضی کے علاوہ وہاں بہت کم زراعت کی جاسکتی ہے اور وہاں گندم، جو اور گرم کے علاوہ جو ایک سخت قسم کا اناج ہوتا ہے اور کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ شہر گلگت میں انگوں کی کاشت کی جاتی ہے اور اس علاقہ کی غذائی قلت کو پورا کرنے کے لئے کشمیر کی حکومت ہر سال وہاں کینڑ مقدار میں غلہ بھیجا پڑتا ہے اور اسے گلاب سنگھ اور اس کے جانیٹس رنیر سنگھ نے فرغ کر کے ریاست جموں اور کشمیر میں شامل کیا تھا۔ اس علاقہ کے باشندوں میں برادریوں کی تقسیم بھی پائی جاتی ہے اور یہ لوگ ریونی حکمران، شن یعنی مذہبی یا لشکر یعنی زراعت پیشہ، کرہیں اور ڈوم یعنی خدمتگار برادریوں میں منقسم ہیں۔ اٹھارہویں صدی تک شن برادری کے لوگ اپنے مردوں کو بودھ دھرم کے طریقہ کے مطابق جسلا یا کرتے تھے لیکن اب انھیں دفن کرتے ہیں مگر تدفین کے وقت آگ روشن کر لیتے ہیں۔

وادی کے شمال و مشرق میں واقع علاقہ بلتستان کہلاتا ہے۔ وہاں تبتی نسل کے لوگ رہتے ہیں اور بالٹس کے نام سے موسوم ہیں۔ لیکن چونکہ یہ علاقہ لداخ اور درہستان کے درمیان واقع ہے اس لئے اس کے باشندوں کو بجا طور پر دونوں نسلوں کا مرکب کہا جاسکتا ہے۔ بلتستانی عموماً شیلہ ہوتے ہیں۔ لیکن وہاں بودھوں کی چند بٹیاں بھی موجود ہیں۔ بلتستان میں خوبانی بحیرت پیدا ہوتی ہے اور اسی لئے کشمیر کے باشندے اس علاقہ کو زیرہ جھوٹاں کہتے ہیں اور اس کے باشندے عموماً کشمیر اور ہندوستان میں آکر مزدوری کرتے ہیں۔

بلتستان کے مشرق میں لداخ واقع ہے جسے دتت صغیر کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ یہاں کے باشندے بھوٹا کہلاتے اور دلائی لاما کے پیرو ہیں اور نسلی اعتبار سے تبتی واقع ہوئے ہیں۔ لداخ کے باشندے خوش مزاج اور ایمان دار ہوتے ہیں اور عموماً محنت، مزدوری اور زراعت پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ لداخ کے باشندے چار برادریوں یعنی گاپو یا راجہ، جرک یا افسر، منگرک یا زراعت پیشہ اور نگن یا خدمتگار پر منقسم ہیں۔ لیکن ان کی اکثریت زراعت پیشہ ہے۔ لداخ کے ہر گاؤں میں

اس کی آبادی اور رقبہ کے لحاظ سے ایک بڑی یا چھوٹی بودھہ خانقاہ ہوتی ہے جسے لادخی زبان میں گمپا کہتے ہیں۔ اس خانقاہ میں بودھ راہب اور راہبات رہتی ہیں۔ عبادت گاہ کے علاوہ یہی خانقاہ گاؤں والوں کے لئے پنچایت گھر کا کام بھی دیتی ہے۔ ان میں بعض خانقاہیں دولت مند بھی ہیں اور بعض میں بودھ دھرم سے متعلق تباہ نوشتے بھی محفوظ ہیں۔ لادخیوں کی مقبول غذا گرم ہے چند سال پہلے تک لادخ ایک دور افتادہ علاقہ تھا لیکن اب اول تو ہند اور لادخ کے درمیان ہوائی جہازوں کی باقاعدہ آمد و رفت شروع ہو گئی ہے اور دوسرے موٹر کے راستہ کی تعمیر نے اسے باقی ماندہ ہندوستان کے ساتھ ملا دیا ہے۔

سلوور بالائیں ریاست جموں اور کشمیر کے باشندوں کے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ موجودہ دور کو نظر انداز کرتے ہوئے جبکہ کشمیر بھی باقی ماندہ ہندوستان کے قدم پر قدم ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ ڈوگرہ حکومت کے قیام کے وقت وہاں کے باشندوں کی اقتصادیات کا انحصار زراعت، ملازمت اور ان دستکاریوں پر تھا جو سلطان زمین العابدین کے زمانہ میں وہاں رائج ہوئی تھیں لیکن جیسا کہ آئندہ صفحات کے مطالعہ سے معلوم ہو سکے گا ڈوگرہوں کے ایک سو سالہ دور حکومت میں ریاست کے منظم و نسق کا جو طریقہ رائج رہا تھا اس کی بدولت کشمیر زمانہ کے قدم پر قدم چلنے کے قابل نہیں ہو سکا تھا اور یہ ہی صورت حالات ریاست کی آئندہ تمام تر عوامی اور سیاسی تحریکات کی بنیاد بن گئی تھی۔

ہمارا راج گلاب سنگھ نے جموں میں جو ڈوگرہ حکومت قائم کی تھی وہ پوری ایک صدی تک قائم رہی لیکن امرتسر میں ہمارا راج گلاب سنگھ اور انگریزوں کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا چونکہ اس کے سلسلہ میں کشمیر کے باشندوں کی رائے دریافت نہیں کی گئی تھی اس لئے وہ معاہدہ کشمیر کے جمہوریت پسند حلقوں میں ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں سخت ترین تنقید کا نشانہ بنا رہا اور موجودہ صدی کی تیسری دہائی میں کشمیر کے باشندوں نے ریاست میں ذمہ دار حکومت کے قیام کی جو جدوجہد

شروع کی تھی اور جس کا انجام ڈوگرہ خاندان کی حکومت کے خاتمہ، جمہوری حکومت کے قیام اور ہندوستان کے ساتھ اس کے الحاق کی صورت میں برآمد ہوا ہے۔ اس میں بھی معاہدہ امرتسر کا یہ ہی غیر جمہوری کردار کام کرتا رہا ہے۔

بہر حال ۱۸۵۸ء میں ہمارا جگلاپ سنگھ کے انتقال کے بعد اس کا فرزند ربیر سنگھ اس کا جانشین ہوا۔ اور تقریباً ۲۹ سال تک حکومت کرتے رہے۔ ۱۸۸۵ء میں اس جہان فانی سے رخصت ہو گیا اور اس کے بڑے بیٹے پرتاپ سنگھ کو اس کا جانشین بنایا گیا۔ ہمارا جہ پرتاپ سنگھ کے کوئی تربیتہ اولاد نہیں تھی اس لیے جب ۱۹۳۲ء میں اس کا انتقال ہوا تو اس کی جگہ اس کے چھوٹے بھائی کے فرزند ہری سنگھ کو راج گدتی کا وارث تسلیم کیا گیا حتیٰ کہ اس خاندان کے اس آخری حکمران کو جون ۱۹۴۹ء میں اپنے فرزند پرتاپ سنگھ کو عارضی طور پر اپنا قائم مقام بنا کر رخصت ہو جانا پڑا۔ لیکن ریاست سے ہمارا جہری سنگھ کی یہ مفارقت دائمی ثابت ہوئی۔

معاہدہ امرتسر کے وقت سے لے کر ریاست جموں و کشمیر میں جمہوری حکومت کے قیام تک اس ریاست کی عنان حکومت جن چار حکمرانوں کے ہاتھوں میں رہی تھی یہاں ان کی ذات پر کوئی تنقید مقصود نہیں۔ اس کے برعکس ہمیں اس بات کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ ہمارا جگلاپ سنگھ نے جن حالات میں جموں و کشمیر کی ریاست قائم کی تھی ان میں ان انتظامی خرابیوں کو دور کرنا ممکن نہیں ہو سکتا تھا جو پچھلی ایک صدی سے چلی آ رہی تھیں۔ پھر جب ربیر سنگھ کا دور حکومت شروع ہوا تو وہ بھی مشکلات سے خالی نہیں تھا۔ مثلاً کئی سال تک وہ اپنی ریاست کی شمالی مغربی سرحد کے باشندوں کی لڑائیوں اور یورشوں کو فرو کرنے میں مصروف رہا۔ پھر ۱۸۷۷ء میں بارش کی زیادتی کے باعث کشمیر کو ایک خوفناک قحط کا سامنا کرنا پڑا اور ۱۸۷۸ء میں جب انگریزوں اور افغانوں کے درمیان جنگ شروع ہوئی تو ہمارا جہ ربیر سنگھ کو اپنے تمام تر وسائل انگریزوں کی امداد کے لئے وقف کر دینے پڑے۔ اسی طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ اپنی حکومت کی اس طویل مدت میں

اسے ریاست کے نظم و نسق کی اصلاح پر خاطر خواہ توجہ مبذول کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ پھر بھی اس نے اپنے دورِ حکومت میں کثیر اور ہندوستان کے درمیان آمد و رفت میں سہولت پیدا کرنے کے لئے جہلم روڈ تعمیر کرائی تھی۔ سفارت اور فارسی کے قیام اور نایاب مسودات پر مشتمل ایک کتب خانہ قائم کیا تھا اور مذہب و مسلک کے امتیاز کے بغیر ہر ضرورت مند کی حاجت روائی کرتا تھا۔ لیکن اسی کے دورِ حکومت میں ہندوستان کے غیر ملکی حکمران اس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے کہ انھیں جوں اور کشمیر ایسی اہم ریاست کو کسی دیسی حکمران کے ماتحتوں میں نہیں چھوڑ دینا چاہیئے اور وہاں ایک برطانوی ریزیڈنٹ ضرور متعین ہونا چاہیئے لیکن وہ ریزیڈنٹ کے دورِ حکومت میں اپنے اس مقصد کو پوری طرح حاصل نہیں کر سکے تھے اور یہ معاملہ ایک ایسے خصوصی افسر کے تقرر پر ختم ہو گیا تھا جو گری کے موسم میں سری نگر رہ کر یورپین سیاستوں کے مفادات کی نگرانی کرتا تھا لیکن ہمارا راجہ رنیر سنگھ کی موت کے بعد جب پرتاپ سنگھ اس کا جانشین ہوا تو یا قاعدہ جانشینی سے پہلے ہی اسے حکومت ہند کے اس ناقابلِ ترمیم فیصلہ سے مطلع کر دیا گیا تھا اور اگرچہ ہمارا راجہ پرتاپ سنگھ نے مجبوراً اس فیصلہ کو منسلک کر لیا تھا لیکن چونکہ یہ منظور بھی برطانوی حکومت کے حقیقی مقصد کو پورا نہیں کر سکی تھی اور وہ ریاست کے نظم و نسق کو پورے طور پر اپنے ماتحتوں میں لے لینا چاہتی تھی اس لئے اس کے کارندوں نے ہمارا جیسے کے خلاف ایک خوفناک سازش کر کے ۱۸۸۹ء میں اسے اختیارات حکومت سے تقریباً محروم کر دیا تھا اور یہ اختیارات ایک ایسی مجلس وزراء کو سپرد کر دیئے گئے تھے جس کے اراکین کو ہمارا راجہ کے خاندان میں سے حکومت ہند نامزد کرتی تھی۔ کونسل کا صدر ہمارا راجہ کے حقیقی بھائی کو بنایا گیا تھا لیکن حقیقی اختیارات برطانوی ریزیڈنٹ کو حاصل تھے اور اس طرح کثیر میں دو علی حکومت قائم ہو گئی تھی۔ پھر جب ہمارا راجہ ہر کی سنگھ کا دورِ حکومت شروع ہوا تو ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد نہ صرف شروع ہی ہو چکی تھی بلکہ کئی منزلیں طے بھی کر چکی تھی اور کشمیر میں اس جدوجہد کا رد عمل محسوس کیا جا رہا تھا۔

مذکورہ بالا حالات کے پیش نظر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ڈوگر حکومت کے ایک سو سالہ دور میں بعض داخلی اور خارجی اسباب کی بنا پر ریاست کے نظم و نسق میں ایسی تبدیلیاں ممکن نہیں ہو سکی تھیں جو عوام کے اقتصادی، سماجی اور سیاسی حالات کو ذرا تو صحیح حد تک بہتر بنا سکتیں۔ پھر سو دور میں زمینداروں کے طبقے کو بھی تقویت حاصل ہوئی تھی۔ اس کے باوجود اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ دور اصلاحات سے بالکل خالی نہیں رہا تھا۔ اس دور میں یہ حیثیت مجموعی کچھ بہتر حالات بھی رونما ہوئے تھے اور اس دور کی سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس میں عوام کا وہ سیاسی اور سماجی شعور پیدا ہوا تھا جس کی بدولت آج ریاست جموں اور کشمیر کا شمار ہندوستان کی ترقی پسند اور ترقی پذیر ریاستوں میں کیا جاتا ہے۔

اس دور کے آغاز میں حکومت کی ذاتی کاشت کا طریقہ بھی رائج تھا۔ اس کام کو انجام دیتے کے لئے جو سرکاری ملازمین متبعی تھے انھیں مصارف کے لئے ضروری رقم دے دی جاتی تھی لیکن وہ اس رقم کو اپنے لئے دیکھ بیٹھتے اور نہ صرف بیگانوں سے زمین کی کشت و زری ہی کرتے تھے بلکہ اس کے لئے بیجا بھی دیہاتیوں ہی سے وصول کرتے تھے۔ سرری نگر میں چاول لانے کی صورت میں اس پر بھاری محصول ادا کرنا پڑتا تھا۔ حکومت خود غلہ کی تجارت کرتی اور اس کی قیمت مقرر کرتی تھی لیکن حکومت کا چاول پوری قیمت پر فروخت ہوتا تھا اور زمینداروں کے چاول کی قیمت میں سے محصول کی رقم کاٹ لی جاتی تھی اور گھوڑوں کی فروخت پر 'زرغاس' کے نام سے ان کی قیمت کا ۵۰ فی صد بطور محصول وصول کر لیا جاتا تھا۔

حکومت کا کوئی شائبہ بھی رشوت رسانی سے پاک نہیں تھا اور اس کی تمام تر ضرب غریب کسانوں پر پڑتی تھی۔ حکومت کی طرف سے اصلاح حالات کی کوشش کئے جانے کے بجائے اس پر براہ روی کی ہمت افزائی کی جاتی تھی۔ اس زمانہ میں کشمیر کے ہر گاؤں میں حکومت کی طرف سے ایک دیلدار یا ہرکارہ متعین ہوتا تھا۔ یہ لوگ افراد کو اپنے اپنے گاؤں کے حالات سے باخبر

رکھتے تھے اور انھیں ان کی خدمات کے صلہ میں ان کے گاؤں کی مجموعی پیداوار کا $\frac{1}{10}$ انی صد دیا جاتا تھا چنانچہ ایک مرتبہ ہمارے ایک وزیر نے محسوس کیا کہ ان ذیلیداروں یا ہرکاروں کو معقول آمدنی ہوتی ہے اس لئے اس نے ہرکارہ یا سنی یعنی صد ذیلیدار کو سالانہ ایک بڑی رقم خزانہ میں داخل کرنے کا حکم دے دیا۔ یہ رقم ایک زمانے میں ۳۴ ہزار روپے تک پہنچ گئی تھی اور اس ایک واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں رشوت ستانی اور لوٹ کھسوٹ کی کس طرح ہمت افزائی کی جاتی تھی۔

پھر اس زمانہ میں بے گار کمونناک رواج بھی موجود تھا۔ اس رواج کے ماتحت ہر سال گرمی کے موسم میں ہزاروں کشمیریوں کو گلگت میں مقیم فوجوں کے لئے رسید پہنچانی پڑتی تھی۔ انھیں غلہ کی بوریاں اپنی پشت پر لاد کر پتے ہوئے طویل پہاڑی راستوں اور برف پوش پہاڑوں سے گزرتا پڑتا تھا اور ان میں سینکڑوں بھوک، پیاس نیز گرمی اور سردی کی شدت کی تاب نہ لاسکے کی بدولت راستہ ہی میں دم توڑ دیتے تھے۔ یہ ہم موسم گرما میں ٹھیک اس زمانہ میں شروع ہوتی تھی جب کشمیر کے باشندے کھیتی باڑی کی تسیاریاں کرتے ہیں اس لئے اس کا اثر زراعت پر بھی پڑتا تھا۔ اس رواج کی بدولت رشوت ستانی کی ہمت افزائی بھی ہوتی تھی اور جو لوگ سرکاری افسروں کو رشوت دے سکتے تھے انھیں بگاریں بچھڑ کر گلگت نہیں بھیجا جاتا تھا اور چونکہ اس رواج کی بدولت زراعت میں کمی واقع ہوتی رہتی تھی اس لئے یا تو سرکاری حاصل وصول ہی نہیں ہوتے تھے یا پھر انھیں وصول کر لینے کے بعد دیہات کے باشندے صرف پھکاری ہی رہ جاتے تھے۔ لیکن ریاست جموں اور کشمیر کے قیام اور استحکام پر جس قدر مدت گزرتی گئی اسی قدر ان برائیوں کا انہاد بھی ہوتا گیا لیکن چونکہ ایک جانب تو ہندوستان کی قومی آزادی کی تحریک روز بروز تقویت حاصل کرتی جا رہی تھی اور دوسری طرف ڈوگرہ حکومت کے زمانہ میں عوام کا جو سیاسی شعور پیدا ہوا تھا اس کی بدولت

وہ اپنے مستقبل کو اپنے درخشاں ماضی کی بنیاد تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس مدی کے
 آغاز اور خصوصاً اس کی تیسری دہائی سے انھوں نے وہ جدوجہد شروع کی تھی جو ریاست
 جموں اور کشمیر سے واپس کی ملحق الخان حکومت کے خاتمہ اور جمہوری حکومت کے قیام پر
 ختم ہوئی ہے۔

تیسرا باب

سیاسی بیداری اور عوامی تحریکات

کثیر کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے اس حصہ کے باشندے کسی دور میں بھی سیاسی شعور سے محروم نہیں رہے۔ لہذا دہائی کی فوجی ہمت اور فتوحات، کثیر کو فوج کرنے میں محمود غزنوی کی، کانگیاہی، زمین الحادین کے ترقی پسندانہ اقدامات، شہنشاہ اکر کی فوجوں کے مقابلے میں اپنے عزیز وطن کی حفاظت اور اسے بڑھانوں کی حکومت سے نجات دلانے کی کوششیں ایسے واقعات، باشندگان کثیر کی مسلسل سیاسی بیداری کا ثبوت سمجھا کرتے ہیں۔ پھر ان کی یہ سیاسی بیداری ملکی فتوحات یا مدافعت وطن ہی تک محدود نہیں تھی بلکہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ملک کے داخلی نظم و نسق اور حکومتوں کے انقلابات میں بھی کارفرما رہتی تھی۔ اور اس مخصوص مقابلے میں بھی کثیر کے باشندے، باقی ماندہ ہندوستان کے باشندوں کے دوش بدوش ہی نہیں بلکہ ان کے نظریات اور ان کی روایات سے متاثر بھی تھے۔

ہندوستان ہمیشہ سے مذہب پسندوں کا وطن رہا ہے اور قدیم ہندوستان کے باشندے اس معاملے میں امتیاز کی بنیاد پر کھٹے تھے۔ مذہب ہمیشہ سے عمل و انصاف کا علمبردار رہا ہے اور اس کی یہی دعوت قدیم ہندوستان کے باشندوں کی آواز خیالی اور ان

کی حکومتوں کی انصاف پسندی کی بنیاد بنی ہوئی تھی۔ کثیرتہیں جو لوگ آکر آباد ہوئے تھے وہ بھی باقی ماندہ ہندوستان کے باشندوں کی طرح آریہ نسل سے تعلق رکھتے تھے اور ان دونوں کے بہت سے بنیادی خیالات خصوصاً مذہبی عقائد میں مماثلت موجود تھی۔ ولادت مسیح سے قبل اشوک اعظم نے کثیر کو فتح کر کے اسے براہ راست ہندوستان میں شامل کر لیا تھا اور تعلق کم و بیش پانچ سو سال تک قائم رہا تھا جس کی وجہ سے ہندوستان کے ثقافتی، سیاسی اور سماجی خیالات اور نظریات کثیر تک پہنچے تھے۔ پھر مختلف زمانوں میں فاتح یا مغتوح کی حیثیت سے کثیر اور باقی ماندہ ہندوستان کا تعلق قائم رہا تھا اس لئے کثیر پر باقی ماندہ ہندوستان کے سیاسی اور سماجی نظریات کا جو نقش قائم ہوا تھا وہ زیادہ گہرا ہوتا چلا گیا تھا۔ چنانچہ کثیر کی تاریخ میں ایسے واقعات بھی ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کثیر کے باشندے قدیم زمانہ میں اپنے راجاؤں کی اصلاح کرنے اور حکومت کے منظم و نسق کو درست کرانے کے لئے خاموش اور پراسن جدوجہد ہی نہیں بلکہ مسلح اقدامات بھی کیا کرتے تھے حتیٰ کہ ایسے موقعوں پر برہمن بھی جن کے تعلقات راجاؤں اور برہمن اقتدار گروہوں کے ساتھ بہت مضبوط اور گہرے ہوتے تھے عوام ہی کے ساتھ رہتے تھے۔ چنانچہ کثیر کے قدیم راجاؤں کے خدات و دواؤں، آئینوں اور نالوں کی مسلح بغاوتیں مشہور ہیں۔ اس قسم کے اقدامات کثیر کی سیاسی بیداری کی نشان دہی کرتے ہیں اور ان کی بدولت اس دور کی حکومتیں بہت سی غلط کاریوں سے محفوظ رہتی تھیں۔ بہر حال جس طرح قدیم کثیر کے باشندوں کی سیاسی بیداری اس دور کے باقی ماندہ ہندوستان کے سیاسی شعور اور نظریات کی آئینہ دار تھی اسی طرح موجودہ دور کے کثیر کی سیاسی بیداری بھی باقی ماندہ ہندوستان کی سیاسی بیداری کے ساتھ وابستہ ہے اور اس بیداری کو پیدا کرنے میں ہندوستان کی سیاسی تحریکات اور ہندوستان کے رہنماؤں نے بے حد اہم کردار ادا کیا ہے۔

زمانہ کے ساتھ ساتھ سیاسی بیداری کے وقت بھی بدلتے رہتے ہیں۔ چنانچہ قدیم زمانہ

میں جب انسانی سماج طبقتوں میں تقسیم نہیں تھا سیاسی بیداری کے مظاہرے ملکی فتوحات یا سرداروں اور راجاؤں کے کسی ناروا فعل کے خلاف مدائے احتجاج بلند کرنے ہی تک محدود رہتے تھے لیکن آہستہ آہستہ جب انسانی سماج میں طبقتوں کا ظہور ہوا تو سیاسی بیداری نے طبقاتی کش مکش کی صورت اختیار کر لی اور اس طرح عوام اپنی اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کو اقتصادی اور معاشی زاویہٴ نظر سے دیکھنے لگے۔

گذشتہ باب میں بتایا جا چکا ہے کہ کشمیر کے باشندوں نے جن کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے انیسویں صدی کے آغاز میں افغانستان کی مسلم حکومت سے قطع تعلق کرنے کے لئے مہاراجہ رنجیت سنگھ سے امداد حاصل کی تھی جس کی وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھی کہ سماج میں جو طبقہ دار کش مکش شروع ہو گئی تھی اس کے ماتحت پٹھان حکمران کشمیر کے تمام باشندوں کے ساتھ جن میں ہندو، مسلمان، بودھ اور سکھ سب ہی شامل تھے ایک ہی جیسا سلوک روا رکھتے تھے۔ پھر جب سکھوں کا دورِ حکومت آیا تو اس میں بھی یہی صورت حال قائم رہی۔ اور اگرچہ سکھوں کے دورِ حکومت میں کشمیر کے دو آخری صوبہ دار شیخ غلام محی الدین اور شیخ امام الدین مسلمان تھے لیکن چونکہ بنیادی طور پر حکومت کا نظم و نسق درست نہیں تھا اس لئے مسلمان صوبیداروں کی موجودگی بھی کشمیر کے باشندوں کو مطمئن نہیں کر سکی اور ان ہی حالات میں ڈوگرہ حکومت کا قیام عمل میں آیا تھا۔

پچھلے باب میں کشمیر کے اس دور کے اقتصادی حالات نیز اس کے نظم و نسق پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ ڈوگرہ خاندان کے پہلے دو حکمرانوں کے زمانہ میں کشمیر کے نظم و نسق کی یہ ابتداء بدستور قائم رہی تھی اور اسی ابتداء کو بہسانہ بنا کر ہندوستان کی انگریز حکومت اپنی فوجی ضروریات کو پورا کرنے کی غرض سے ریاست جموں اور کشمیر کے معاملات میں زیادہ سے زیادہ دخل حاصل کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے انتقال پر ریاست میں سیز پک

کا تقریباً بھی کر دیا تھا۔ اس طرح جب ۱۸۸۵ء میں ہمارا چہرتا پسننگھ کا دور حکومت شروع ہوا تو عوام کی خستہ حالی کے پیش نظر انھوں نے انتظام حکومت میں بعض اصلاحات کا اعلان کیا جس کی رو سے حکومت کی براہ راست کاشتکاری ختم کر دی گئی، چاول کی فروخت کا محصول منسوخ کر دیا گیا۔ ہر کاروں کی تنظیم کو توڑ دیا گیا اور سپاہیوں کو ان کے حق خدمت کے طور پر فائدہ دینے کا رواج ختم کر کے ان کی تنخواہیں مقرر کر دی گئیں۔ پھر ۱۸۸۸ء میں حکومت ہند کے ایک افسر مسٹر وننگٹ کو ریاست کی اراضی کے بندوبست پر مامور کیا گیا اور دو سال بعد مسٹر وننگٹ کی جگہ یہ کام مسٹر والٹر لارنس کے سپرد کر دیا گیا اور انھوں نے ریاست کے پہلے بندوبست کی تکمیل کی۔

پٹھانوں نے اپنے عہد حکومت میں کشمیر کے کسانوں اور کاشتکاروں پر جو ناقابل برداشت زرعی محاصل عاید کئے تھے وہ ڈوگرہ حکومت کے ابتدائی دور میں بھی قائم رہے تھے اس لئے کاشتکاروں نے زراعت کا پیشہ چھوڑ دیا تھا حتیٰ کہ اس بندوبست کے سلسلے میں جب ان کے درمیان زمین تقسیم کی جانے لگی تو وہ اس پیش کش کو قبول کرنے کے لئے بھی تیار نہیں تھے۔ بہر حال اس بندوبست کے ماتحت زمین کو تقسیم کر دینے کے باوجود، وادی کشمیر اور سرحدی علاقوں میں

ہمارا جہاز زمینداروں کی ملکیت برقرار رہی۔ کاشتکار مال گزاری ادا کرتے رہنے کے باوجود، ہمارا جہاز ان زمینداروں کی رضا مندی سے اراضی پر قابض تو رہ سکتے تھے لیکن انھیں اس اراضی کو فروخت کر کے بارہن رکھنے کے حقوق حاصل نہیں تھے۔ اس کے برعکس اس بندوبست کے وقت صوبہ جموں کی تین تحصیلات، رام نگر، لہریلی اور میرپور کے علاوہ جن کے زمیندار مال گزاد کہلاتے تھے اور جنھیں اراضی کو فروخت کرنے اور بارہن رکھنے کے حقوق حاصل تھے، زرعی اراضی جن کاشتکاروں کے قبضہ میں تھی ان کو ہی اس کا مالک قرار دے دیا گیا۔ اس طرح کشمیر کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اس کے باشندے اپنی ہی اراضی کی ملکیت سے محروم ہو گئے۔ پھر اس واقعہ سے

اس امتیاز کا اندازہ بھی ہوتا ہے جو حکومت صوبہ جوں اور کثیر کے باشندوں کے درمیان روا رکھتی تھی۔ پھر مال گزاری کی جو شرح مقرر تھی اور اسے وصول کرنے کے جو طریقے رائج تھے ان کی بدولت کاشتکاروں کو پیداوار کے تیسرے حصہ سے زیادہ نہیں ملتا تھا جس کی بدولت کسٹوں اور کاشتکاروں کے درمیان بے چینی اور بد حالی بڑھتی جا رہی تھی۔ اور چونکہ یہ حالات ریاست کی صنعتوں پر بھی اتنا اندازہ ہوئے تھے اس لئے ان کی ترقی بھی مسدود ہو گئی تھی ہمارا چاہتا ہوں کہ گھٹے کے دور حکومت میں ریاست کے نظم و نسق کو بہتر بنانے کا جو کام شروع ہوا تھا اسے انجام دینے کے لئے تعلیم یافتہ لوگ درکار تھے لیکن ریاست میں تسلیم کے فقدان کی بدولت وہاں تعلیم یافتہ لوگ بھی نہیں مل سکتے تھے۔ اس لئے ریاست کے نئے محکموں اور فزوں کو سنبھالنے کے لئے ہزاروں تعلیم یافتہ افراد کو باہر سے ریاست میں لایا گیا۔ لیکن انہیں ریاست کے مسائل اور اس کے باشندوں سے کوئی واقفیت اور ہمدردی نہیں تھی۔ مگر یہی نووارد، دیسی باشندوں پر حکومت کرتے تھے اور ان کی موجودگی میں ریاست کے باشندے احساس کمتری محسوس کرنے لگے تھے۔ کثیر کے باشندے جو صدیوں سے اپنے وطن پر بیرونی اقتدار کے قیام کی مخالفت کرتے رہے تھے اب ایک نئی شکل میں اس کے زیر اقتدار آ گئے تھے۔ یہ صورت حال عوام ہی کے لئے ناقابل قبول نہیں تھی بلکہ اعلیٰ طبقات کے لئے بھی ناقابل برداشت ثابت ہو رہی تھی اور ان ہی طبقات کی تحریک پر انیسویں صدی کے اواخر میں حکومت ہند نے ریاست کی حکومت کو ہدایت کی تھی کہ اسے ملازمتوں میں ریاست کے باشندوں کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھنا چاہیئے۔ اس طرح ریاست میں ریاستی اور غیر ریاستی کے عزائم سے ایک نئی مکش مکش بھی شروع ہو گئی تھی۔

بیسویں صدی کے آغاز میں، مسٹر ایچ بیٹنٹ، صاحب نامی خاندان کے ایک فرد

پیٹنٹ بالاکول اور بعض دوسرے روشن خیال حضرات کی کوششوں سے سری نگر میں ایک

کالج کا قیام عمل میں آیا۔ اسی زمانہ میں جموں میں بھی ایک سرکاری کالج کھولا گیا اور ریاست میں تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ اور اس کے ساتھ ہی ان تعلیم یافتہ نوجوانوں میں غیر ریاستی عناصر کے دفتری اقتدار کو ختم کرنے کا جذبہ بھی بیدار ہونے لگا۔

ریاست جموں اور کشمیر کے ان عمومی حالات کے روشن بدوش بے چینی کا ایک دوسرا مظاہرہ عنصر بھی پرورش پاتا تھا اور وہ تھا مسلمانوں کے درمیان اپنی پس ماندگی کا احساس۔ ریاست جموں اور کشمیر کی مجموعی آبادی میں مسلمانوں کا تناسب تقریباً ۷۷ فی صد اور ہادی میں ان کی آبادی کم و بیش ۹۶ فی صد ہے۔ اس طرح ریاست کی انتظامی خرابیوں کا اثر بھی مسلمانوں ہی پر زیادہ پڑ رہا تھا۔ وادی میں حکومت نے زرعی اراضی کے سلسلے میں جو حکمت عملی اختیار کی تھی اس سے بھی مسلمان ہی زیادہ متاثر ہوئے تھے اور چونکہ وہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے سے گریزاں رہے تھے اس لئے انھیں ملازمتوں میں بھی اپنے لئے کوئی گنجائش نظر نہیں آتی تھی اور ان اسباب نے مسلمانوں میں ان کی پستی اور پس ماندگی کا احساس پیدا کر دیا تھا اور اگرچہ ریاست کے منظم و نسق کو ریاست سے باہر کے لوگوں سے پاک کرنے کا نعرہ ریاست کے تعلیم یافتہ ہندوؤں نے بلند کیا تھا مگر مسلمانوں نے اس کی مخالفت نہیں کی تھی۔ لیکن وہ چاہتے تھے کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے وہ بھی اپنی تعلیمی پس ماندگی کو دور کر کے ریاست کے انتظام میں حصہ دار بن جائیں۔

اس سلسلے میں کشمیر کے مسلمان ریاست سے مناسب سہولتیں حاصل کرنے کے خواہش مند تھے لیکن انھیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی تھی حتیٰ کہ ۱۹۴۷ء میں جب ہسٹریا چوکی درخواست پر حکومت ہند کے کثیر تعلیم سرشار پرنس نے کشمیر کا دورہ کر کے مسلمانوں کی تعلیمی ضرورتوں کا جائزہ لے کر اپنی رپورٹ پیش کی تو ان ہی غیر ریاستی عناصر نے جو اس وقت ریاست کے منظم و نسق پر چھائے ہوئے تھے اس رپورٹ کو بھی گلدستہ طاق لٹیاں بنا دیا۔ اس صورت حال نیز اس بات کو دیکھ کر کہ کشمیری پبلک تعلیم میں ترقی کرتے اور سرکاری ملازمتوں پر فائز ہوتے جا رہے ہیں

مسلمانوں میں عظام ریاست کے خلاف تلخی میں امانہ ہوتا چلا گیا حتیٰ کہ جب ۱۹۲۲ء میں ہندوؤں کے گورنر جنرل اور فائسر نے لارڈ ریڈنگ نے کننیر کا دورہ کیا تو مسلمانوں نے انہیں اپنی شکایات اور اپنے مطالبات پر مشتمل ایک عرضداشت بھی دی لیکن ایک سرکاری کمیٹی نے جو ایک ایک مسلمان ہندو اور بورہین پر مشتمل تھی اس عرضداشت کو بے معنی قرار دے کر مسترد کر دیا اور جن لوگوں نے اس پر دستخط ثبت کئے تھے ان میں سے بعض کو جلاوطن کر کے ان کی جائداد کو ضبط کر لیا گیا۔ یہ تھے ریاست جموں اور کشمیر کے وہ حالات جن میں ۱۹۲۵ء میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے انتقال کے بعد مہاراجہ ہری سنگھ برسر حکومت آئے۔

۱۹۱۲ء میں جب ریاست میں ریاستی اور غیر ریاستی کا سوال اٹھا ہوا تھا پہلی بار ریاست کے شہری کی ایک تحریف مدوں کی گئی تھی لیکن وہ تحریف اپنی جگہ اس درجہ معمولی تھی کہ اس سے ریاست کے باشندوں کو کوئی قابل ذکر فائدہ نہیں پہنچ سکا تھا اس لئے ۱۹۲۵ء میں ریاستی شہریت کی ایک جامع اور واضح تحریف مدوں کی گئی جس کی وجہ سے ریاست میں غیر ریاستی باشندوں کے برسر اقتدار آنے کا سلسلہ تو مسرود ہو گیا لیکن ریاست کی انتظامی اور فوجی اسمیاں راجپوتوں اور ڈوگرہوں کے لئے مخصوص ہو کر رہ گئیں۔ اس طرح ایک جانب تو حکومت پر صوبائی عصبیت کی حکمت عملی اختیار کرنے کا شبہ کیا جانے لگا اور دوسری طرف، صوبہ جموں کے غیر ڈوگرہ باشندے بھی ڈوگرہوں کے اس عروج کو اپنی حق تلفی سے منسوب کرنے لگے۔ اسی زمانے میں ڈوگرہ سبھا کے نام سے جموں میں ڈوگرہوں کی ایک سیاسی تنظیم بھی قائم کی گئی جو عوام کے نام پر ڈوگرہوں کے اعلیٰ طبقہ کے مفادات کا تحفظ کرتی تھی۔

صوبائی عصبیت اور ڈوگرہوں کے اعلیٰ طبقوں کو لڑنے کا سلسلہ اس درجہ طویل ہو گیا تھا کہ اس کی وجہ سے ایک طرف تو کشمیر کے غیر مسلموں میں بھی حکومت کی اس حکمت عملی سے بیزاری کا اظہار کیا جانے لگا تھا اور دوسری طرف جموں کے غیر ڈوگرہ باشندوں حتیٰ کہ خود ڈوگرہ عوام میں بھی

بے چینی پیدا ہونے لگی تھی۔ اس طرح موجودہ صدی کی تیسری دہائی کے اختتام پر وہ تمام اسباب اور عناصر مرجع ہو گئے تھے جو قوموں کی سیاسی بیداری کے محرک ہوتے ہیں۔ اور ان ہی اسباب و علل کی بنا پر ابتدا ہی سے ایک زبردست قومی تحریک چلائی جاسکتی تھی۔ لیکن جب یہ تحریک شروع ہوئی تو ابتدا میں بعض ناگزیر وجوہ کی بدولت یہ فرقہ وارانہ شکل میں نمودار ہوئی مگر چونکہ اس کے بنیادی عوامل و محرکات عمومی اور عوامی تھے اس لئے اس نے بہت جلد قومی تحریک کی صورت اختیار کر لی۔

گذشتہ سطور میں بتایا جا چکا ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں مسلمانوں نے مغربی تسلیم حاصل کرنی شروع کر دی تھی اور وہ ہندوستان کے تعلیمی مرکزوں میں تعلیم پاپا کر کشمیر واپس جا رہے تھے لیکن حکومت کی صوبائی عصبیت کی بدولت ان کے لئے ملازمتوں کے دروازے بند تھے اور وہ اس سوال پر غور کرنے لگے تھے کہ انہیں اپنے جائز حقوق حاصل کرنے کے لئے کیا قدم اٹھانا چاہیئے اس زمانے میں انگریزی حکومت کے خلاف ہندوستان کی قومی جدوجہد بہت آگے بڑھ چکی تھی حتیٰ کہ ۱۹۲۹ء میں انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے اجلاس لاہور میں جو پنڈت جواہر لال نہرو کی زیر صدارت منعقد ہوا تھا، ہندوستان کے لئے کامل آزادی حاصل کرنے کی قرارداد منظور کر لی تھی اور اس ملک کی انگریز حکومت کے پاس اس قرارداد کو لیے افریٹانے کے لئے فرستے والے جذبات کو مشتعل کرنے کے علاوہ اور کوئی ذریعہ موجود نہیں تھا اور چونکہ ہندوستان کی انگریز حکومت کشمیر کی بعض خصوصیات کے پیش نظر اس پر اپنا تیرا وہ سے زیادہ دخل قائم کرنے کے لئے جہاں جہاں گلاب ٹکھ ہی کے زمانہ سے وہاں کی اکثریت سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی اور اب کشمیر کے حالات نے اس کے لئے ایک ذریعہ موقع فراہم کر دیا تھا اس لئے اس نے ان غیر ریاستی عناصر کی معرفت جن میں سے بعض تو ریاستی اور غیر ریاستی کے سوال پر اپنے مفادات سے محروم ہو جانے کے باعث دیا

ایک طرف تو انگریزوں کو خوش کرنا چاہتے تھے اور دوسری طرف خود اقتدار حاصل کرنے کے خواہش مند تھے، ریاست کے باشندوں کی اقتصادی بے چینی اور سیاسی بیداری کو فرقہ دارانہ کی راہ پر لگادیا اور چونکہ ریاست میں پروپیگنڈا کے وسائل مفقود تھے اس لئے بیرون ریاست کے فرقہ پرست اختیارات کو ریاست میں پہنچا کر ان سے فرقہ داریت کا ذہر پھیلانے کا کام لیا جانے لگا۔ اس طرح کثیر میں اس فرقہ دارانہ تحریک کا آغاز ہوا جو چند سال کے بعد ہی عوامی تحریک میں تبدیل ہو گئی۔ لیکن اس دور میں بھی کثیر ایسے لوگوں کے وجود سے خالی نہیں تھا جو وقت کے سمالات کو فرقہ پرستی کے راویہ منظر سے نہیں دیکھتے تھے چنانچہ جب ۱۹۲۹ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس کے ساتھ ساتھ لاہور میں ریاستی باشندوں میں سیاسی کام کرنے والوں کا ایک کنونشن منعقد ہوا تو اس میں کثیر کے نمائندے بھی شامل تھے اور اس کنونشن میں کثیر کی حکومت اور عوام سے متعلق بعض مخصوص قراردادیں بھی منظور کی گئی تھیں۔

بہر حال مسلمانوں کے تعلیم یافتہ اور نوجوان طبقہ میں اپنی بے روزگاری اور خستہ حالی کا جو احساس پیدا ہو گیا تھا اس نے انھیں عمل پر آمادہ کر دیا تھا۔ انھوں نے سری نگر میں 'فتح کول ریڈنگ روم' قائم کر کے باہم تبادلہ خیالات کے لئے ایک مستقل پیدا کر لیا تھا اور جموں میں بھی 'ینگ منز مسلم ایسوسی ایشن' کے نام سے مسلمان نوجوانوں کی ایک ایسی ہی تنظیم قائم ہو گئی تھی اور کچھ مدت کے بعد ان دونوں کو باہم ملحق کر دیا گیا تھا۔

یہاں اس بات کو بھی ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ ۱۹۳۹ء میں لندن میں جو 'راؤنڈ ٹیبل کانفرنس' منعقد ہوئی تھی اس میں مہاراجہ ہری سنگھ بھی شریک ہوئے تھے اور انھوں نے اپنی تقریروں میں 'ہندوستان کے قومی مطالبات کی تائید کی تھی۔ اس لئے ہندوستان کے فرقہ پرست عناصر کی طرح برطانوی حکومت بھی ان کی مخالفت ہو گئی تھی اور اس نے مسلمانوں کی اقتصادی بے چینی کو اپنی اغراض کے لئے استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ایک جانب تو ریاست کے اندر عوامی بیداری کے اسباب و علل پرورش اور تقویت پارہے تھے اور دوسری طرف ریاست سے باہر بھی چند ایسے عناصر موجود تھے جنہاں ہستہ آہستہ ریاست کے اس ماحول پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ مثلاً اس صدی کی تیسری دہائی کے وسط سے لاہور میں آل انڈیا کثیر مسلم کانفرنس کے نام سے جو جماعت قائم ہوئی، اگرچہ ابتداء میں وہ کثیر کے ضرورت مند مسلمان توجہ انوں کو ان کی تعلیم میں مدد دیتی تھی لیکن اب اس نے سیاسیات میں دخل دینا شروع کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ ۱۹۲۶ء میں اس نے ہمارا جہ کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کرنے کی اجازت بھی طلب کی تھی لیکن اس کی یہ درخواست مسترد کر دی گئی تھی۔

ریاست سے باہر لیکن اس کے ساتھ دلچسپی رکھنے والا دوسرا عنصر ان فرقہ پرست مسلمانوں پر مشتمل تھا جو کثیر کی مسلم اکثریت کو مختلف طریقوں سے اپنے فرقہ وارانہ مقاصد کے لئے استعمال کرتا چاہتا تھا اور اس کے لئے کثیر سے ہمارا جہ کی حکومت کے خاتمہ کو ضروری سمجھتا تھا۔ لیکن یہ عنصر دو گروہوں میں منقسم تھا اور ان کا ہونٹمند گروہ محسوس کرتا تھا کہ برطانوی حکومت کی بالادستی کی موجودگی میں ہمارا جہ کی حکومت کو ختم کرنا تو ممکن نہیں ہو سکتا لیکن اگر ریاست میں ذمہ دار ایسی حکومت قائم کرائی جائے تو اس سے ان کے مقاصد کی تکمیل میں بہت زیادہ مدد ملے گی۔ معاملہ کو اس زاویہ نظر سے دیکھنے والوں میں آل انڈیا مجلس احرار کے رہنما اور احمدی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں لیکن اگر مجلس احرار کثیر کے مسلمانوں کی جدوجہد میں شریک ہو کر اپنے وقار اور اثر کو بڑھانا چاہتی تھی تو احمدی کثیر کو اپنے عقائد کی تبلیغ کا میدان بنانے کے متمنی تھے۔ ان کے علاوہ آل انڈیا مسلم لیگ اور آل انڈیا مسلم کانفرنس ایسی جماعتیں بھی، ریاست کے داخلی معاملات کے ساتھ دل چسپی کا اظہار کرنے لگی تھیں اور چونکہ ۱۹۲۹ء میں کانگریس کے اجلاس منعقدہ لاہور کے بعد ہندوستان میں قانون شکنی کی تحریک شروع ہو گئی تھی اور اس تحریک میں مسلمانوں نے پوری قوت کے ساتھ حصہ نہیں لیا تھا نیز ۱۹۳۰ء کی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں ہمارا جہ ہر ہی مسئلہ کے لئے قوم پرورانہ رجحانات کا اظہار

کیا تھا اس لئے اب برطانوی حکومت نے ان ہندوستانی مسلمانوں کو جو ان کی تحریک سے علیحدہ رہے تھے انعام اور ہمارا جو ان کے قوم پرورانہ خیالات کی سزا دینے کے لئے ان عناصر کو جو ریاست میں فرقہ وارانہ تحریک شروع کرنے اور کرنے کے خواہش مند تھے ہتھ کی امداد دینے کا فیصلہ کر لیا اور یہ وہ حالات تھے جن میں مسلمانوں کی جدوجہد شروع ہوئی تھی۔

۱۹۳۱ء شروع ہوا تو ریاست کے مسلمان جدوجہد کے لئے تیار ہو چکے تھے لیکن ابھی وہ یہ بات طے نہیں کر سکے تھے کہ انھیں اپنی جدوجہد کس طرح شروع کرنی چاہیئے۔ اس زمانہ میں ریاست کے اندر تقریباً تیسری کی آبادی مفقود تھی اس لئے مسلمان نوجوانوں نے پنجاب کے مسلم اخبارات میں ایسے مضامین شائع کرنے شروع کئے جن میں حکام پر سخت تنقید کے علاوہ ہندو راجہ اور ہندو فرقہ کی مذمت بھی ہوتی تھی اور جب ریاست میں ان اخبارات کا داخلہ بند کر دیا گیا تو انھوں نے مختلف عنوانات سے کتابچے طبع کر کے خفیہ طور پر انھیں ریاست میں لانا اور تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ کشمیر کے مسلمانوں میں سری نگر کی جامع مسجد کے امام اور خانقاہ مولیٰ کے سجادہ نشین کو جنھیں میر داغ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے ہمیشہ احترام اور عقیدت کی نظر سے دیکھا جاتا رہا ہے لیکن یہ دونوں مذہبی رہنما ہمیشہ ایک دوسرے کے حریف رہے ہیں مگر فرخ کوئل ریڈنگ ٹم کے ساتھ تعلق رکھنے والے نوجوانوں کی کوششوں سے اس زمانہ میں ان دونوں نے بھی مسلمانوں کی جدوجہد میں ان کی ہمتوائی پر اتفاق کر لیا تھا۔ اس زمانہ میں جموں میں چند اور بھی ایسے واقعات پیش آئے جنھیں مذہب میں مداخلت کا نام دیا گیا اور جنھوں نے جلتی ہوئی آگ پر تیل کا کام کیا اور ان واقعات کی مذمت کرنے کے لئے سری نگر کی جامع مسجد میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس کے خاتمہ پر حاضرین نے جلوس کی شکل میں شہر کا گشت کیا جس کے پیش منظر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے جو جامع مسجد کی مجلس تعمیر کا صدر بھی تھا صدر کی حیثیت سے جامع مسجد میں اجازت حاصل کئے بیٹھ کر سیاسی تقریریں کرنے کی ممانعت کر دی لیکن 'ریڈنگ ٹم' سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں

نے اس حکم کی خلاف ورزی کرنے کا فیصلہ کر کے دوسرے دن درگاہ حضرت بل شریف میں ایک بہت بڑا جلسہ منعقد کیا جس میں پچاس ہزار مسلمان شریک ہوئے تھے اور چونکہ اس روز جمعہ بھی تھا اس لئے یہ سب ریلینگ روم' گردہ کی رہنمائی میں جامع مسجد گئے اور وہاں جلسہ منعقد کر کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے حکم کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوئے۔

جنوں میں پیش آنے والے جن واقعات کو مذہب میں مداخلت کے نام سے موسوم کیا گیا تھا ان کی تحقیقات کے لئے ریاستی کابینہ کے رکن مسٹر ویکیفیلڈ جنوں گئے تھے اور وہاں انھوں نے مسلمانوں کی شکایات سن کر یہ مشورہ دیا تھا کہ جنوں اور کثیر کے مسلمانوں کے ایک مشترکہ وفد کو سری نگر 'اگر حکومت سے گفت و شنید کرنی چاہیئے۔ اس مشورہ کے مطابق مجوزہ وفد کے کئی سری اراکین کے انتخاب کے لئے ۲۱۔ جون ۱۹۳۱ء کو خانقاہ معلیٰ میں ایک عام جلسہ منعقد کیا گیا جس میں ہریجنال کے مسلمان شریک ہوئے لیکن اراکین وفد کے انتخاب کے بعد جب رہنما جلسہ سے جا چکے تھے سرحد کے ایک باشندہ عبدالقادر نے جو ایک یورپین کے خاندان کی حیثیت سے سری نگر آیا ہوا تھا ایک اشتغال انیجر تھری کی اور اس تھری کی بنا پر ۲۵۔ جون کو اسے گرفتار کر لیا گیا اور جب جولائی کے پہلے ہفتہ میں عبدالقادر کا مقدمہ شروع ہوا تو اس کے ساتھ مسلمانوں کی عام ہمدردی اور راستہ پران کے اجتماعات کے پیش نظر اس بات کا اندیشہ پیدا ہو گیا کہ وہ عبدالقادر کو پولیس کے قیدخانہ سے نکلانے سے بھی گریز نہ کریں گے۔ اس اندیشہ کی بنا پر خفیہ طریقہ سے یہ ہدایت جاری کی گئی کہ عبدالقادر کے مقدمہ کی سماعت جیل میں کی جائے۔ لیکن یہ ہدایت خفیہ نہیں رہ سکی مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد جیل کے سامنے جمع ہو گئی اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے حکم سے اس مجمع کے بعض رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا اور اس طرح حکومت اور مسلمانوں کے درمیان وہ خونیں تصادم برپا ہوا جس میں پولیس کی گولیوں سے ۲۱۔ آدمی ہلاک ہوئے۔ یہ تصادم ۱۳۔ جولائی کو واقع ہوا تھا۔ اسی لئے جولائی کی یہ تاریخ کثیر کی سیاسی تاریخ میں بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور

کشمیر نشینوں کا تفرس کی طرف سے اسے 'قوی ہندوؤں کی حیثیت دینی گئی ہے۔ بہر حال اس حادثہ کے بعد مسلمانوں کے تقریباً تمام رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا لیکن ان باتوں کے باوجود عوام خوفزدہ نہیں ہوئے اور وہ ہڑتالوں، جلوسوں اور جلسوں کی شکل میں اپنی بے اطمینانی کا مظاہرہ کرتے رہے اور حاکم کے خلاف اظہارِ ناراضگی کا یہ سلسلہ کشمیر کے ہر گوشہ میں پھیل گیا۔

دوسرے ہی دن ہمارا جنرل نے اپنے ایک فرمان کے ذریعہ ۱۳ جولائی کے حادثہ کی تحقیقات کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی اور اس میں غیر سرکاری رکن کی حیثیت سے ایک مسلمان کو بھی شامل کرنا چاہا لیکن کوئی مسلمان اس کمیٹی میں شرکت پر رضامند نہیں ہوا۔ یہ کمیٹی ریاست کے چیت جسٹس سر پرچور دلال کی قیادت میں قائم کی گئی تھی اور اسی لئے دلال کمیٹی کے نام سے مشہور ہے۔ اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ ریاست کے باشندوں کا سیاسی شعور بیدار ہوتا جا رہا ہے اور اس کی تحقیقات سے معلوم ہوا تھا کہ کاہلیہ کے دور رس مسٹر وکیل فیڈ اور مسٹر کل اپنے طرزِ عمل سے فرقہ پرست عناصر کی بہت افزائی کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ جولائی کے اختتام پر ان دونوں کو اپنے عہدوں سے مستعفی ہو جانا پڑا۔ جولائی کے آخری ہفتے میں حالات کی نزاکت کے پیش نظر ہمارا جنرل نے راجہ ہری کشن کول کو اپنا وزیرِ حضور مقرر کیا تھا جو بودیہ، ریاست کے وزیرِ اعظم بنا دیئے گئے تھے اور انھوں نے حالات کو سازگار بنانے کے لئے اس امر کا وعدہ لینے کے بعد کہ وہ فرقہ وارانہ جذبات کو مشتعل کرنے والی تقریریں نہیں کریں گے جولائی کے اواخر میں مسلم رہنماؤں کو چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اپنے رہنماؤں کی رہائی کے بعد مسلمان اجتماع کی جدوجہد کی قوت کو بھی محسوس کرنے لگے تھے۔

جولائی ۱۹۳۱ء میں پیش آنے والے واقعات کے بعد ریاستی عوام کی سیاسی بیداری سننے ایک مستقل حیثیت حاصل کر لی تھی اور اگرچہ اس بیداری کا مظاہرہ فرقہ وارانہیت ہی کی صورت میں ہو رہا تھا لیکن اس کی یہ ہی شکل دوسرے فرقوں کی بیداری کا موجب بھی بنی جو اس ہی تھی۔ یہ ہمسایہ جولائی کے بعد کے واقعات کی تفصیل بیان کرنا ممکن نہیں مگر اس قدر ضرور سمجھ لینا چاہیے کہ

اگست میں مسلمانوں کے ایک وفد نے ہماراجہ سے مل کر ان کی خدمت میں ایک یادداشت پیش کی جس میں ۱۳ جولائی کے ہنگامے کے اسباب و علل بیان کرنے کے علاوہ یہ شکایت بھی کی گئی تھی کہ دلال کیٹی کی رپورٹ واقعات کی صحیح تحقیقات پر مبنی نہیں اور اس بات کا مطالبہ کیا گیا تھا کہ راجہ ہری کشن کو ان کے ہمدے سے برطرف کر دیا جائے لیکن ہماراجہ نے اس مطالبہ کو منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ دوسری طرف ۱۳ جولائی کے ہنگامہ کے بعد پنجاب میں کشمیر کیٹی کے نام سے ایک جماعت قائم کر لی گئی تھی۔ یہ کیٹی حالات کے مطالبہ کے لئے اپنا ایک وفد کشمیر بھیجا چاہتی تھی لیکن اس کی یہ درخواست مسترد کر دی گئی تھی اور اس نے ۱۴ اگست کو دلال کیٹی یا کشمیر ڈسٹے' منانے کا اعلان کیا تھا۔ اور اس دن کشمیر میں بھی منایا گیا تھا۔ اس طرح مسلمانوں میں بے چینی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ ان ہی آیام میں مولانا ابوالکلام آزاد اور سرتاج بہادر سپرد کشمیر گئے تھے۔ مولانا آزاد نے کشمیر کے مسلم رہنماؤں کو فرقہ وارانہ زاویہ نظر ترک کر دینے کا مشورہ دیا اور سرسپرہ نے حکومت کو اس امر پر توجہ دلائی کہ اسے کشادہ دل ہونا اور عوام کی شکایات پر ہمدردانہ زاویہ نظر سے غور کرنا چاہیئے اور اس مشورہ کے نتیجہ میں فریقین کے درمیان ۲۴ اگست کو ایک سمجھوتہ ہو گیا۔ یہ سمجھوتہ 'عارضی صلح' کے نام سے مشہور ہے اور اس کے باعث ایک طرف تو مسلمان رہنماؤں نے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ تحریک کو بالکل بند کر دیں گے، حکومت اور دوسرے فرقوں کے خلاف اشتعال زبانی نہیں کریں گے اور اپنے داخلی معاملات کو بیرونی اثرات سے پاک رکھیں گے۔ اور دوسری طرف حکومت نے اس امر کا یقین دلایا تھا کہ اس نے اس تحریک کو دبانے کے لئے جو سخت قانونی اقدامات کئے ہیں وہ انہیں واپس لے لے گی، ملزمین کو ضمانت پر رہا کر دیا جائے گا۔ اور جن افسروں کو اس تحریک سے تعلق رکھنے کے الزام میں درخواست یا موصول کیا گیا ہے ان کے معاملات پر۔

نظر ثانی کی جائے گی۔ مگر یہ عارضی صلح کثیرہ عوام کو مطمئن نہیں کر سکی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ عوام انسانی حدود پر روزگاری سے تنگ آکر حکومت کے مقابلے کے لئے میدان میں آتے تھے اور اس حکومت کو ختم کر دینا چاہتے تھے اور جس بل تک اس سمجھوتے کا تعلق تھا اس میں ان کے حصول مقصد کی کوئی گنجائش موجود نہیں تھی۔

عارضی صلح کے اس کو کھلے پھل کے باوجود اگر حکومت اس پر عمل درآمد کر سکتی تو کچھ مدت کے لئے عوامی جدوجہد کا متری ہو جانا ممکن ہو سکتا تھا لیکن وہ اس میں بھی تساہل سے کام لیتی رہی حتیٰ کہ مسلمانوں کی طرف سے حکومت کے اس رویہ کے خلاف پھر چلے ہونے لگے اور ان ہی حالات میں ۱۲- ستمبر کو بعض مسلم رہنماؤں کو ازمیر نو گرفتار کر لیا گیا۔ دوسرے روز جب سلطان جامع مسجد سے ایک اجتماعی جلوس نکالنا چاہتے تھے ان پر گولی چلائی گئی جس سے تین افراد ہلاک اور متعدد زخمی ہو گئے اور شہر کے ایک دوسرے حصے میں بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ ۲۳- ستمبر کو کم و بیش پچاس ہزار مسلمان جامع مسجد میں ان لوگوں کی تدفین کے لئے جمع ہوئے جو پولیس کی گولیوں سے ہلاک ہوئے تھے لیکن حکام نے انہیں جامع مسجد سے نکلنے کی اجازت نہیں دی اور جب دوپہر کو دہرا عظم کی ہدایت کے مطابق ان مسلمانوں کو جلوس نکالنے کی اجازت دی گئی تو وہ مرحومین کی تدفین کے بعد پرامن طریقے پر منتشر ہو گئے۔ اسی شب کو بخشی ظلام محمد اور چند دیگر رہنماؤں کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔

کثیرہ کی تاریخ میں ۲۴- ستمبر ۱۹۴۷ء کو ایک خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اس تاریخ کو پہلی بار کشمیر کی جدوجہد اپنی حقیقی شکل میں ظاہر ہوئی تھی اور اسی تاریخ کو کشمیر کے عوام اور اعلیٰ طبقوں نیز قوم پرست اور فرقہ پرست عناصر کے درمیان ایک امتیازی خط قائم ہوا تھا۔ ۲۴- ستمبر کو کشمیر کے ہزاروں باشندوں نے لاکھوں اور ہزاروں وغیرہ سے مسلح ہو کر سری نگر میں ایک تاریخی مظاہرہ کیا تھا اور پولیس کو اپنی قیام گاہ سے نکلنے کی جرات تک نہ ہو سکی

تھی۔ لیکن اس روز پورے سری نگر میں فرقہ وارانہ نوعیت کا کوئی ایک واقعہ بھی پیش نہ آیا تھا۔ اس کے برعکس ایسی شہادتیں موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے ہندو غواتیں کی مخالفت کی تھی اور اس طرح یہ بات ثابت کر دی تھی کہ ان کی جمہوریت نظام حکومت کے خلاف ہے کسی فرقہ کے خلاف نہیں۔ اس وقت تک اعلیٰ طبقے کے مسلمان مسلمانوں کی سیاسی بیداری کو اپنے مفادات حاصل کرنے کی غرض سے حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لئے استعمال کرتے تھے لیکن ۲۰ ستمبر کو جب انھیں اندازہ ہوا کہ اب عوام خود اپنے مفادات کو سمجھنے لگے ہیں تو اسی روز اس لمحہ کے نمائندوں نے ہمارا جہ کو اس امر کا یقین دلانا ضروری سمجھا کہ وہ عوام کی اس تحریک سے بے تعلق اور حکومت کے وفادار ہیں۔ دوسرے ہی دن حکومت نے ایک آرڈی نینس نافذ کر کے سری نگر کو فوج کے زیر انتظام دے دیا۔ سری نگر میں فوجی حکومت کے زمانہ میں دہلی کے باشندوں کو جن مصائب اور فتنوں کا سامنا کرنا پڑا انھیں بیان کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی لیکن مختصراً اس قدر سمجھ لینا چاہیے کہ یہ دور سری نگر کے باشندوں کے لئے سخت ترین آزمائش کا دور تھا لیکن انھوں نے اس دہلی میں غیر معمولی صبر و استقامت اور ثبات برداشت کا ثبوت دیا تھا۔ ان ہی دنوں میں شہر ہیاں میں بھی فوجی حکومت قائم کر دی گئی تھی لیکن واوی کے باشندوں کے جذبات کو دبا یا نہیں جاسکا تھا۔

چارچہ اکثر کو ہمارا جہ نے اپنے یوم پیدائش کی تقریب پر سری نگر میں دوبار منعقد کر کے آرڈی نینس کو فوراً واپس لے لینے، دوسرے سخت قوانین کو جلد از جلد منسوخ کر دینے، سری نگر سے فوجی حکومت ختم کر دینے جانے، سیاسی نظریہ دلوں کو را کر دینے اور زیر سماعت مقدمات واپس لینے کا اعلان کیا۔ ۱۹۔ اکتوبر کو گزشتہ ہفتہ میں ان کے اسباب و ملکی کی تحقیقات کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی گئی لیکن ۱۰۔ نومبر کو اس کمیٹی کا کام حکومت ہند کے ایک افسر مسٹر مل ٹن کے سپرد کر دیا گیا۔ مسٹر مل ٹن کی رپورٹ سے کثیر کے اس دور کے سیاسی حالات کے بعض دل چسپ اور اہم گوشوں پر روشنی پڑتی

ہے اور اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ اس جلد و جہد کے بعض رہنما ۱۹۳۱ء ہی سے اس کے فرقہ وارانہ کردار کے مخالف تھے اور وہ اس میں غیر مسلموں کو شرکت کی دعوت دینے رہتے تھے لیکن ایک طرف تو اس وقت خود ان کی آواز کمزور تھی اور اس تحریک پر اعلیٰ طبقہ کے مسلمانوں کا اثر تھا اور دوسری طرف دوسرے فرقوں کے اعلیٰ طبقوں کے رہنما بھی اپنے عوام کو اس تحریک میں شامل ہوتا ہوا دیکھنا نہیں چاہتے تھے اس لئے اس وقت یہ تحریک عوامی تسمیک نہیں بن سکی تھی۔

وادئ میں جو واقعات پیش آ رہے تھے۔ صوبہ جموں اور پنجاب میں بھی اس کا ردِ عمل محسوس کیا جا رہا تھا۔ جموں میں سرکاری مال گزاری ادا نہ کرنے کی تحسینیک متروک کر دی گئی تھی لیکن نافوں شکنی کے طریقوں سے ناواقف اور جاہل کسٹوں کے طریقہ عمل کی بدولت اس نے بھی فرقہ واریت کی صورت اختیار کر لی تھی۔ دوسری طرف مجلس احرار نے ستمبر سے اپنے رضاکار ریاست میں بھیجے متروک کر دیے تھے اور ۲۔ نومبر تک کم و بیش پانچ ہزار احرار ریاستی رضاکار گرفتار کئے جا چکے تھے۔ ان حالات میں حکومت نے ۲۔ نومبر کو جموں کا انتظام بھی فوج کے حوالہ کر دیا۔ دوسرے دن فوج نے گوئی چلائی اور ۵۰ مسلمان اور ہندو زخمی اور ۲ ہلاک ہوئے۔ ان حالات میں ریاست کی حکومت نے حکومت ہند سے امداد کی درخواست کی۔ چنانچہ ۵۔ نومبر کو برطانوی فوج نے شہر کا انتظام اپنے ماتحتوں میں لے لیا اور چند روز کے بعد وائسرائے نے ایک آرڈی نینس نافذ کر کے ریاست میں احراری رضاکاروں کے داخلہ کو ممنوع قرار دے دیا لیکن ان واقعات سے جموں کا پورا صوبہ متاثر ہو چکا تھا۔

۱۹۳۲ء کے آغاز میں وادی میں دوبارہ ہنگامے برپا ہوئے اور حکومت نے دوبارہ آرڈی نینس نافذ کر کے اس کے ماتحت بعض رہنماؤں کو گرفتار کر لیا اور جب حکومت کے اس اقدام کے خلاف ہڑتالوں، جلسوں اور جلوسوں کی شکل میں مظاہرے کئے گئے تو صدر افسر اور

کو گرفتار کر لیا گیا اور بعض مقامات پر گولیاں بھی چلائی گئیں لیکن موسم سرما کی شدت کے باعث اجتماع اور تشدد کا یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا۔

۱۹۳۱ء میں مہاراجہ نے سیاسی اسیروں کے لئے عفو عام کا اعلان کرتے ہوئے اس بات کی یقین دہانی بھی کی تھی کہ وہ رعایا کے ہر طبقہ کی شکایات کو مستحق اور ان پر ہمسودہانہ غور کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اس یقین دہانی کی بنیاد پر ریاستی باشندوں کے مختلف فرقوں نے اپنی شکایات اور اپنے مطالبات پر مشتمل عرضداشتیں مرتب کر کے مہاراجہ کی خدمت میں پیش کی تھیں۔ سکھوں نے مطالبہ کیا تھا کہ انھیں انتظامی اور فوجی ملازمتوں میں ۳۳ فی صدی حصہ دیا جائے اور ایک سکھ وزیر کو کابینہ میں شامل کیا جائے، اور کشمیر کے سکھ شہری اپنی تعداد کے لحاظ سے ملازمتوں کے مطلوبہ تناسب کو پورا نہ کر سکیں تو اسے ریاست کے باہر کے سکھوں سے پورا کیا جائے۔ کشمیری پنڈتوں نے ریاست کی سیاست کو فرقہ واریت کے اثر سے پاک رکھنے کی شرط پر دستوری حکومت کے قیام کا مطالبہ کیا تھا اور ملازمتوں کے سلسلہ میں کسی قسم کی رعایت کے بغیر اہلیت کی بنیاد پر انتخاب کا مشورہ دیا تھا۔ راجپوتوں نے تمام حالات کی ذمہ داری حکومت کی گزشتہ پیر عاید کی تھی اور اس توقع کا اظہار کیا تھا کہ وہ آئندہ ایسے واقعات کو روکنے کے لئے سخت اقدامات کرے گی۔ اور مسلمانوں نے اپنی عرضداشت میں دستوری حکومت کے قیام اور مذہبی معاملات، نیز اخبارات، اجتماعات، تقریرات، تحریک اور ریاست کے تمام باشندوں کو مساوی شہری حقوق دے جانے کا مطالبہ کیا تھا اور ملازمتوں میں مسلمانوں کے لئے ۲۰ فیصد اسامیاں مخصوص کر دینے، جلفے پہنزدور دیا تھا۔ اور اس تناسب کو قائم رکھنے کے لئے انھوں نے بھی حسب ضرورت جبر ریاستی مسلمانوں کو ملازمتوں میں لئے جانے کی تجویز پیش کی تھی۔ ہندوؤں کے ایک طبقہ نے بھی اسی قسم کا مطالبہ کیا تھا۔ اسی عرضداشت میں پہلی بار یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ مہاراجہ جہاد کو اپنے ذاتی مصارف کے لئے ریاست کی مجموعی آمدنی میں سے چند فیصد حصہ

مخصوص کر لینا چاہیے۔ ان عنداشتوں پر فوراً کرنے کے لئے ہمارا جرنل سرنی، اسی مجلس کی سرکردگی میں ایک کمیشن مقرر کیا تھا جو مجلس کشمیر، کہلاتا ہے۔ اس کمیشن کی رپورٹ کی بنا پر ریاست کے بہت سے ضوابط میں ترمیم کردی گئی۔

کشمیر کے باشندوں کی سیاسی بیداری کا آغاز ۱۹۳۱ء کے وسط میں ہوا تھا اور اگرچہ اس وقت اس نے پورے طور پر فرقہ وارانہ رنگ اختیار نہیں کیا تھا لیکن ۱۹۳۲ء جولائی کو حکومت کے ساتھ جو تصادم ہوا تھا اس میں مسلمان ایک فریق کی حیثیت رکھتے تھے اس لئے ایک جانب تو حکومت اس بیداری کو فرقہ پرستی کی راہ پر ڈال کر اسے آسانی کے ساتھ چلی سکتی تھی اور دوسری طرف مسلمانوں کے اعلیٰ طبقے اسے اپنے دائرے کے لئے استعمال کر سکتے تھے اور انہیں دونوں عناصر نے اس بیداری کو فرقہ وارانہ رنگ کی شکل دے دی تھی لیکن ٹیلن رپورٹ میں اس امر کا اعتراف کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کا یہ دعویٰ کہ ان کی تحریک فرقہ وارانہ نہیں تھی تحریک کی ابتدائی منزلوں کے متعلق بالکل درست ہے۔ لیکن ۱۹۳۱ء کے ختم ہونے سے پہلے ہی مسلم رہنماؤں کا ایک گروہ، حکومت اور اعلیٰ طبقہ کے مسلمانوں کے اس نظریے کو اچھی طرح سمجھ گیا۔ یہ گروہ اس وقت کے تنگ حالات میں بھی مسلمانوں کی اس بیداری کو اقتصادی اور معاشی مسائل حل کرانے کے لئے استعمال کرنا چاہتا تھا اور اسی لئے مسلم لیڈر شیب دو گروہوں میں منقسم ہو گئی تھی۔

۱۹۳۲ء میں مجلس کشمیر کی رپورٹ کی اشاعت کے بعد ریاست کے اعلیٰ طبقوں کے مسلمانوں نے محسوس کیا کہ انہیں ریاستی مسلمانوں کی ایک تنظیم قائم کر کے بدلے ہوئے حالات میں اپنی لیڈر شیب کو قائم رکھنا اور انہیں حالات سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اسی نظریے کے تحت ۱۹۳۲ء میں اسی جوں اینڈ کشمیر مسلم کانفرنس کا قیام عمل میں آیا۔ لیکن اس تنظیم کی پوری تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۳۸ء تک اعلیٰ اور وسط طبقوں کے مسلمانوں ہی کے مفادات کے حصول کا ذریعہ بنی رہی تھی اور مسلمان عوام بھی کسی نہ کسی حد تک اس حقیقت

کو سمجھنے لگے تھے۔ اس کے باوجود ابھی وہ اعلیٰ طبقہ کے مسلمانوں کی گرفت سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ اس زمانہ میں 'جوں اینڈ لکشیئر مسلم کانفرنس' کو اس بات کی شکایت تھی کہ گلشن کمیٹی نے سرکاری ملازمتوں میں مختلف فرقوں کی نمائندگی کی جو سفارشات کی ہیں ان پر مروج طریقے سے عمل نہیں کیا جاتا۔ اس معاملہ پر ۱۹۳۳ء کے اواخر میں سری نگر میں مسلمانوں کی طرف سے کمیٹی کے چیئرمین کا اظہارِ ہوا لیکن وہ وزیرِ اعظم اور وزیرِ خزانہ کی مداخلت کی بدولت بہت جلد ختم ہو گیا۔ جنوری میں سری نگر میں 'ینگ منز ایسوسی ایشن' کا قیام عمل میں آیا اور اس کی طرف سے سری نگر کے حکام کو تبدیل کر دیے کا مطالبہ کیا گیا مگر حکومت نے نہ صرف اس مطالبے ہی کو مسترد کر دیا بلکہ بعض رہنماؤں کو گرفتار کر کے جلا وطن بھی کر دیا گیا جس کی وجہ سے وادی میں اندیشہ بہت سے ناخوش گوار واقعات پیش آئے۔ ان حالات کے پیش نظر مسلم کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی نے سیال کوٹ میں اپنا اجلاس منعقد کر کے کانفرنس کا آئین مسئلہ کر دیا اور مسلمانوں کے مطالبات منظور کرانے کے سلسلے میں مزدوری اقدامات کرنے کا اختیار اپنے صدر چودھری غلام عباس کو دے دیا۔

یہاں اس بات کو بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اگر ایک جانب مسلمانوں میں آئی جوں اینڈ لکشیئر مسلم کانفرنس موجود تھی تو دوسری طرف ہندوؤں میں یوگ سمجھا اور ڈوگرہ راجپوتوں میں ڈوگرہ سمجھا ایسی جماعتیں بھی موجود تھیں اور یہ سب جماعتیں اپنے اپنے فرقوں کے اعلیٰ اور متوسط طبقوں کے مفادات کے لئے جدوجہد کر رہی تھیں۔ پھر جہاں تک مسلم کانفرنس کا تعلق تھا اس میں مسلم رہنماؤں کا دیگر وہ بھی شامل تھا جو ابتدا ہی سے معاملات کو غیر فرقہ وارانہ زاویہ نظر سے دیکھتا تھا۔ چنانچہ ان رہنماؤں کی تقریروں میں اس بات کی یقینی دہائی کی جاتی رہی تھی کہ کثیر کی قومی قوم کے اندر انہیں بلکہ کثیر کے تمام باشندوں کی شکایات کو دور کرانے کے مقصد پر مبنی ہے اور ہم دوسرے فرقوں کے حقوق کے تحفظ میں ان کی امداد بھی کرنا چاہتے ہیں۔

اور اس قسم کے خیالات و دونوں فرقوں کے عوام کو حقیقت حال سمجھنے میں مدد سے رہے تھے۔ پھر ۱۹۳۷ء میں پنڈت جواہر لال نہرو کی قیادت میں 'دیاستی عوام کی تنظیم' اسٹیٹس بیلڈ کانفرنس' کا قیام بھی عمل میں آیا تھا۔ اس انجمن کے کارکنوں کی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل تھی اس کے باوجود یہ انجمن جنوں اور کثیر کے عوام کے مطالبات کی جن کی اکثریت مسلمان تھی، تائید کرتی تھی اور انڈین نیشنل کانگریس بھی ہر موقع پر ان مطالبات کی حمایت میں اواز بلند کرتی رہتی تھی اس سے غیر فرقہ پرست مسلمان رہنماؤں کے علاوہ جواہر لال نہرو سے پنڈت جواہر لال نہرو کے اظہار اور اعلیٰ خیالات سے متاثر تھے عام مسلمان بھی ان تمام باتوں سے متاثر ہو کر فرقہ پرستانہ نظریہ کو ترک کرنے لگے تھے اور اسی لئے جب ۱۹۳۷ء میں چودھری غلام عباس نے قانون شکنی کی نزدیک شروع کی اور انھیں اور ان کے چند رفقاء کو گرفتار کر لیا گیا تو مسلمانوں کی طرف سے کسی قابل ذکر جوش کا اظہار نہیں کیا گیا اور انھیں حالات میں ۱۹۳۷ء میں کانفرنس کی روکنگ کی گئی تھی۔ ریاست کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کرنے کے وسائل دریافت کرنے کی غرض سے ایک سبب کھینچی بھی مقرر کی تھی۔

مسلمانوں کے نظریہ کو تبدیل کرنے میں اس بات نے بھی بہت زیادہ کام کیا تھا کہ ابتدا ہی سے انہیں بتایا جاتا رہا تھا کہ ان کی تمام ترجیحتوں کا سبب حکومت میں غیر مسلم حاکم اور اہلکاروں کی موجودگی ہے۔ لیکن جب گھنسی کمیشن کی سفارشات کی بنا پر مسلمان ملازمتوں میں لئے جانے لگے اور ان میں سے بہت سے اعلیٰ عہدوں پر بھی نامور ہو گئے اور عام مسلمانوں کی مشکلات میں کوئی کمی نہ دیکھا گئی تو وہ محسوس کرنے لگے کہ اصلاح حالات کا صحیح طریقہ فرقہ دارانہ مطالبات کو تسلیم کرنا نہیں بلکہ نظام حکومت کی بنیادی غرابیوں کو دور کرنا ہے۔ پھر جب ۱۹۳۷ء میں ریاست کی پہلی مجلس قانون ساز قائم ہوئی اور چند روز کے بعد بات واضح ہو گئی کہ یہ مجلس بھی ہمارا جی رضی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی اور جب تک ریاست میں ایسا نظام حکومت

قائم نہیں ہو گا جو عوام کے رویہ و جواب دہ ہو۔ اس وقت تک عوام کی حالت درست نہیں ہو سکتی تو کانفرنس کی ایڈیشنپ کے غیر فرقیہ پرست گروہ کو تقویت حاصل ہونے لگی اور وہ کشمیر کے مسلمانوں کی اس تحریک کو متحدہ عوامی تحریک بنادینے کی کوششوں میں مصروف ہو گیا۔

دوسری طرف ریاست کے ان عام حالات سے ہندو عوام بھی کہہ کم متاثر نہیں تھے اور ان کے سامنے بھی کم و بیش وہی عام مشکلات موجود تھیں جس سے مسلمانوں کو گزرنا پڑ رہا تھا۔ پھر ان میں شریعہ ہی سے ایک ایسا قابل ذکر گروہ موجود رہا تھا جو مسلمانوں کی بہت سی شکایات کو جائز سمجھتا اور ان کے ساتھ ہمدردی رکھتا تھا، مگر چونکہ مسلمانوں کی تحریک پر فرقہ پرست عناصر چھاپے ہوئے تھے حتیٰ اگر اس پوری مدت میں ترقی پسند اور غیر فرقہ پرست مسلمان رہنما بھی خطرات پر قابو پانے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکے تھے اس لئے ہندو عوام اور خصوصاً ہندوؤں کا یہ وسیع النظراور صاف ذہن طبقہ بھی خاموشی اختیار کرنے پر مجبور رہا تھا لیکن

اب جبکہ حالات کا رخ بدلتا جا رہا تھا ہندو بھی پیچھے نہیں رہ سکے تھے۔ پھر ریاستی اسمبلی کے بعض غیر مسلم اراکین عوام کے حقوق کے تحفظ کے معاملے میں بسا اوقات کانفرنس کے نمائندوں سے بھی پیشین پیش رہتے تھے۔ حتیٰ کہ ایک مرتبہ چرائی کے ٹیکس کے سوال پر جب اسمبلی کے ایک غیر مسلم رکن نے استغفار سے دیا تو کانفرنس کے تمام نمائندوں کو بھی مستغفی ہو جانا پڑا تھا اور ۱۹۳۷ء میں ایک ممبر کے علاوہ اسمبلی کے تمام ہندو مسلمان اور سکھ اراکین مختلف

مسائل پر برابر واک آؤٹ کرتے رہے یہاں تک کہ انھوں نے بحث پر بحث میں حصہ لینے سے بھی انکار کر دیا۔ اس طرح عوام میں مشترکہ اقدام کا جذبہ ترقی کرنے لگا اور جب ۱۹۳۶ء

کو مسلم کانفرنس کی طرف سے ذمہ دار حکومت کے مطالبہ کا دینا گیا تو ریاست کے ہر گوشہ

میں نہ صرف جلیے ہی منعقد ہوئے بلکہ انھیں کامیاب بنانے میں ہندوؤں اور سکھوں نے

بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

اب ریاست جموں اور کشمیر کے باشندوں کی رواداری، دراندیشی اور قومی یکجہتی کی روح بیدار ہو چکی تھی اور عوام اپنے اور اعلیٰ طبقات کے مفادات میں امتیاز کرنے لگے تھے اس لئے سلسلہ ۱۹۳۱ء میں ایک ایسی قومی تنظیم کے قیام کا سوال پیدا ہوا جو کشمیری قوم کے مفادات کا تحفظ اور اس کی قومی غماہشات کی نمائندگی کر سکے اور ایسی تنظیم کا آئین ہندوستان کی قومی تنظیم انڈین نیشنل کانگریس کے آئین ہی کے خطوط پر مرتب کیا جاسکتا تھا۔

یہاں اس حقیقت کو بھی ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ فرقہ پرستی اور اغراض پروردی کے مذمت شدہ دور میں بھی کشمیری قوم پرورد طاقتیں برابر موجود رہی تھیں۔ لیکن حالات ان کی ترقی کی راہ میں حائل تھے۔ مگر اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان صحت مند طاقتوں نے بھی کشمیر کے روایتی قومی اتحاد کو واپس لانے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ مثلاً بعض نوجوانوں نے ۱۹۳۳ء میں کشمیر نیشنل کانفرنس کے قیام کی غرض سے ایک عارضی مجلس قائم کی تھی لیکن حالات کی ناسازگارابی نے اس تحریک کو آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ پھر ۱۹۳۵ء میں کشمیری وفد لیگ کے نام سے ایک اور جماعت قائم ہوئی جس کے مقاصد میں وطن کی خدمت کے لئے ہر مذہب اور وقت کے نوجوانوں کو منظم کرنا، ریاست میں ذمہ دار حکومت کے قیام کی جدوجہد اور عوام کے اقتصادی، سماجی اور ثقافتی میدان کو بطور تاشملی تھا اس کے بعد ۱۹۳۵ء ہی میں کشمیر میں کانگریس کمیٹیاں بھی قائم کی گئی تھیں۔ اسی سال کشمیر میں اسٹوڈنٹس کانفرنس بھی منعقد ہوئی تھی اور ۱۹۳۷ء میں مزدور اور کسان سمجھا بھی عالم وجود میں آئی تھی۔

بہر حال سلسلہ ۱۹۳۷ء کے آغاز میں مسلم کانفرنس بھی کا جو اجلاس جموں میں منعقد ہوا اس میں کانفرنس کے نام اور آئین کو تبدیل کر دینے کی قرارداد پیش کی گئی، لیکن بعض اصطلاحی اعتراضات کی بنا پر اس وقت اس کام کو ملتوی کر دیا گیا۔ مگر جون کے اواخر میں کانفرنس

کی ورکنگ کمیٹی نے مسلم کانفرنس کو ایک ایسی تنظیم بنا دیے کا فیصلہ کر لیا جسے صحیح معنی میں قومی تنظیم کہا جاسکتا تھا۔ اس اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے شیخ محمد عبداللہ نے کہا تھا کہ — سب سے پہلی بات قریہ ہے کہ ہم سیاست میں ہندو اور مسلمان کے فرق کو دخل نہ دیں اور دوسری بات یہ ہے کہ حق رائے دہندگی اور انتخابات دونوں مخلوط ہوں اور ان دونوں باتوں کے بغیر جمہوریت بے معنی سمجھا ہے۔ اس طرح ۱۹۳۹ء میں مسلم کانفرنس کشمیر نیشنل کانفرنس میں تبدیل کر دی گئی۔ اس کے دروازے ہر فرقہ کے عوام کے لئے کھول دیئے گئے اور یہ تنظیم آج بھی بدستور اپنے لائحہ عمل اور نصب العین پر قائم ہے۔

۱۹۴۷ء میں پنڈت جواہر لال نہرو نے سرحدی گاندھی خان عبدالغفار کے ساتھ کشمیر کا کاؤ ورہ کیا۔ پنڈت نہرو کا ہر جگہ بڑا شان دار استقبال کیا گیا۔ ایسا کہ جو کشمیر کی تاریخ میں کسی کو دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ پنڈت جی کی تقریروں سے ایک نئی جان پڑ گئی اور یہاں کے عوام نے یہ محسوس کیا کہ ان کی مشکلات کو سارے ہندوستان کی اور ہندوستان کی سب سے بڑی جماعت کانگریس کی حمایت حاصل ہے۔ اس کے بعد ہندوستان کی سیاست میں انفرادی ستیگرہ اور سن بلا لیس کے اندولن کی وجہ سے تمام لیڈر جیل چلے گئے۔ اگرچہ سن بلا لیس کا اندولن ریاستوں میں نہیں چلایا گیا تھا پھر بھی جگہ جگہ چلے اور جلوس نکالے گئے۔ باقی ہندوستان کے بہت سے کارکن یہاں آکر رہے اور یہاں نئے خفیہ طور پر تحریک چلاتے رہے۔ ریاستی تحریک دھیرے دھیرے چلتی رہی۔ بالآخر ۱۹۴۷ء میں وزیراعظم کاک کے زمانے میں پرجا سبھا (قانون ساز اسمبلی) کے دو ممبران وزیر بنائے گئے۔

۱۹۴۷ء میں مسٹر محمد علی جناح بھی کشمیر آئے۔ نیشنل کانفرنس کی قیادت نے ایک محاذ پر ہندوستانی مہمان کی حیثیت سے ان کا استقبال کیا اور ان سے گفتگو میں ان کے فرقہ پروراد رجحانات کے خلاف مضبوط دلائل پیش کئے اور ان کو یہ صلاح دی کہ وہ کشمیر میں اپنی

فرق پرستانہ کاروائیوں کا آغاز کریں لیکن سر جراح نے مسلم کانفرنس کے کھٹے اجلاس میں نیشنل کانفرنس کو 'ٹھکانوں کی جماعت' اور شیخ 'عبداللہ کو گنڈا' کہا۔ اس پر شیخ عبداللہ کو غصہ آیا اور انہوں نے سر جراح کو یہ چیلنج دیا کہ وہ کشمیر کے مسلمانوں سے اعتماد کا دوث لیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر نیشنل کانفرنس کے خلاف بیانات کا یہ اشتعال انگیز سلسلہ بند نہیں ہوا تو وہ یوٹیڈ ریڈر کی حفاظت کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ چنانچہ سر جراح بارہ مولا میں اسی طرح کی تقریر کرتے کھڑے ہوئے تو ان کے مسلمانوں نے ان پر پتھر برسائے۔ سر جراح کو زندگی بھر کشمیر کا یہ دودھ کبھی نہیں بھولا اور ان پر یہ اچھی طرح واضح ہو گیا کہ کشمیر میں مسلم لیگ کی دال نہیں لگی سکتی اور ان پر یہ بھی روشن ہو گیا کہ کشمیر کی اصل جماعت نیشنل کانفرنس ہے اور رجوت پسند میر دا عظمیٰوسف شاہ کی مسلم کانفرنس ایک فریب سے زیادہ بیثبات ہے۔ یہیں رکھتی۔ اسی لئے سر جراح نے اسے 'سڑے اندھے' کا خطاب دیا تھا۔

سنہ ۱۹۵۹ء میں ہڈت بھارالال تہرو دوبارہ کشمیر کے دورے پر آئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور خان عبدالغفار خاں بھی ساتھ تھے ان کی موجودگی میں سو پور میں نیشنل کانفرنس کا عظیم الشان اجلاس ہوا۔ اسی اجلاس میں 'نیا کشمیر' کا ردیو شوق پاس ہوا جس میں ریاستی عوام کی آئین اور اقتصادي منزلتیں کی گئی تھیں۔ اسی اجلاس میں شیخ عبداللہ نے کہا تھا کہ "ہماری قسمتیں اور ہماری آزادی ہندوستان کی آزادی سے بندھی ہوئی ہے۔" سنہ ۱۹۵۹ء میں کانفرنس نے کشمیر چھوڑ دیا کا نعرہ لگایا۔ اس میں کلک انجیل لائٹ کی مانگ کی گئی اور ہمارا جہ سے کشمیر چھوڑنے کو کہا گیا۔ ظاہر ہے کہ ہمارا جہ بھی کشمیری تھے۔ ذمہ دار حکومت کے قیام کی مانگ تو بامعنی تھی لیکن ہمارا جہ کے کشمیر سے جانے کی مانگ کا کوئی مفہوم نہیں تھا۔ اس غلطی کا احساس شیخ کو بعد میں ہوا اور انہوں نے دوران مقدمہ میں اپنی صفائی میں یہ صاف اعلان کیا کہ وہ ہمارا جہ کے خلاف نہیں ہیں بلکہ انہیں کے زیر سایہ حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ

کشمیر کو کشمیریوں کے حوالے کر دیں۔ اس تحریک کا فیصلہ یکایک کیا گیا۔ لیکن تحریک چل پڑی پھر بھی تحریک کا آغاز جس انداز سے ہوا اس سے کچھ غلط فہمیاں بھی پیدا ہو گئیں اور ۱۸- مئی ۱۹۴۷ء کو امیر اکمل میں قتل و اسراف بھی ہو گیا۔ اس کے بعد آگے کا پروگرام ملتوی کیا گیا۔ شیخ عبداللہ پنڈت، جواہر لال نہرو سے مشورے کی غرض سے دہلی کے لئے روانہ ہوئے لیکن وہ راستے ہی میں گرفتار کر لئے گئے۔ اس کے بعد دوسرے دن کانفرنس کے تقریباً ۳۰۰ لیڈر گرفتار کر لئے گئے۔ اس کے بعد مظاہرے ہوئے اور پولیس اور فوج نے لامٹی چارج کیا۔ دو ایک جگہ فائرنگ بھی ہوئی جس میں کئی افراد ہلاک اور متعدد اشخاص زخمی ہوئے۔ پریم ناتھ بڑاڑی کسان مزدور کانفرنس اور غلام عباس کی مسلم کانفرنس نے اس تحریک آزادی سے علیحدگی کا اعلان کیا۔ چودھری غلام عباس نے تو اخلافت اس بنا پر کیا کہ یہ تحریک کانگریس کے چیمبر دابرو کے اشاروں پر چلائی گئی تھی۔ یہ جتنی میرزا عظیم و سفت شاہ اور چودھری غلام عباس کی مسلم کانفرنس جو ریاست میں عوامی حکومت کے قیام کی مخالفت تھی اور مہاراجہ کے اشاروں پر تاج رہی تھی۔ اگرچہ آزادی کا فائدہ سب سے زیادہ مسلم عوام کو پہنچنے والا تھا۔ مسلم لیگ صاحب دستور خاموش ہی نہیں بلکہ بالکل الگ تعلق تھی اور منظر عالم کی ریاستی عوام کی مسلم کانفرنس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ بس انڈین نیشنل کانگریس اور اسٹیشن پیلیز کانفرنس جس میں بخشی غلام محمد اور شیخ عبداللہ نے نمایاں جگہیں حاصل کر لی تھیں، ہر موقع پر کام آئی۔ اسی زمانے میں اسٹیشن پیلیز کانفرنس نے ایک تجویز میں ریاستوں میں آئینی اور عوامی حکومتوں کے قیام کی تجویز کی۔ اس سے بھی تحریک کشمیر کو بڑا سہارا ملا۔ یہی نہیں بلکہ شیخ عبداللہ کے مقدمے کی پیریدی کانگریس نے اپنے دسے لی اور دہلی سے مشہور قومی رہنما اور بیرسٹر صف علی کو مقدمہ کی پیروی کے لئے یہاں بھیجا گیا۔ پیروی میں مشہور مقامی ایڈووکیٹ پنڈت جلال لال کھن نے بھی نمایاں حصہ لیا۔

اس تحریک کی تیاریاں پہلے ہی سے ہو رہی تھیں اور تحریک کی ابتدا ہی میں نیشنل کانفرنس

کی تنظیم کے راجہ رانا اور خاموش کارکن بخشی علام محمد کو ریاست کے باہر اس غرض سے بھیج دیا گیا تھا کہ اگر یہاں کے کارکن گرفتار ہو جائیں تو وہ اس تحریک کو باہر سے چلاتے ہیں بخشی صاحب شریخ سے نیشنل کانفرنس کی تنظیم کو سنبھالتے تھے۔ وہ ٹھوس کام کرتے تھے اور نمائش کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ تنظیم کے ایک ایک فرد کو جانتے تھے اور صرف وہی باہر کر ہی تحریک چلا سکتے تھے۔ بخشی علام محمد نے تمام ہندوستان کا دورہ کیا اور پہلی بار ہندوستان کے عوام و خواص کو کشمیر کی تحریک کی حقیقت و اصلیت سے آگاہ کیا۔ اخباروں کے ذریعے تحریک کے موافق فضا پیدا کرائی اور باہر کر تحریک کو کامیابی چلاتے رہے۔ بخشی صاحب نے پنڈت جواہر لال نہرو کو صوبہ حال سے آگاہ کیا اور انھوں نے ۲۷ مئی ۱۹۳۱ء کو ایک ذریعہ بیان جاری کیا جس میں ریاست کے مظالم کا پردہ فاش کیا۔ پھر ۱۸ جون کو انھوں نے خود وادی میں آنے کا فیصلہ کیا۔ راولپنڈی اور مری سے تقریباً تین سو کانگریسی رضا کاران کے ہمراہ ہوئے۔ لیکن کوہا کے مقام پر پنڈت نہرو کو روکا گیا۔ نہرو اس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اگلے بڑھے۔ اس طرح پنڈت نہرو ڈومیل پہنچے اور وہاں ڈاک ہنگے میں مقیم ہوئے یہاں ان پر وارنٹ گرفتاری کی تعمیل کی گئی۔ اس گرفتاری سے ملک کے طول و عرض میں آگ لگ گئی اور ہندو اور مسلمانوں میں تو صحیح پر ناؤ رنگ ہوئی جس میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ایک ہلاک اور سات مجروح ہوئے۔ پنڈت نہرو اور ڈی کے ڈاک ہنگے میں مقیم رہے۔ اسی زمانے میں کانگریس اور حکومت برطانیہ کے مابین آزادی سے متعلق تباہیت مزوری گفتگو چلی رہی تھی۔ اور مولانا آزاد صدر کانگریس نے ایک ضروری مشورہ کے لئے پنڈت نہرو کو دہلی طلب کیا۔ پنڈت نہرو واپس دہلی روانہ ہوئے۔ لیکن یہاں کر کے گئے تھے کہ وہ پھر واپس آئیں گے۔ چنانچہ وہ ۲۴ جولائی کو پھر وادی میں فاتحانہ داخل ہوئے امداد کے حکومت کو روکنے کی ہمت نہ ہوئی۔

اور کانگریس اور کانگریسی قائدین کشمیر کی عوامی تحریک کی اس طرح ولس اور سے اور

قدے بدو کر رہے تھے اور ادھر سرٹ جناح اور مسلم لیگ و صوفیہ کے مخالف تھے بلکہ سرٹ جناح نے یہ اعتباری بیان دیا کہ کشمیری مسلمان کشمیر چھوڑ کر کشمیر کے مخالف ہیں۔ لیکن یہاں پر دوسری علامت اس نے دیکھا کہ مسلم کانفرنس اپنے اس عوام دشمن رویے سے بالکل ہی ملموع ہو چکی ہے اس لئے انہوں نے اپنے خیال میں اپنی قیادت کی گرتی ہوئی عمارت میں تھوئیں لگانے کے لئے خود کو ایک نفی تحریک کے لئے پیش کیا۔ لیکن حکومت کشمیر نے ان کی گزارشات کا بھی کوئی خیال نہیں کیا اور انہیں بھی جیل میں بند کر دیا۔ لیکن جہاں نیشنل کانفرنس کو اپنی تحریک سے جو عوام کی امداد سے چل رہی تھی، مزید تقویت ملتی چلی گئی، مسلم کانفرنس کے لیڈر کے قید ہوتے ہی یہ سیاسی بدو جہد میرا علی پور سٹاٹ اور دوسرے افراد کی باہمی رقابتوں کی خدمت ہو کر بالکل ہی ختم ہو گئی۔ اس کے بعد وزیر اعظم لاک نے بی حضوریوں کا ایک سیاسی ادارہ قائم کیا اور ایم ایچ اے کے پیروں نے دو دفعہ سیاسی پالیسی اختیار کر کے قوم پرستوں کی صفوں میں اخلال پیدا کرنا چاہا۔ لیکن قوم پرست طاقتیں سیاسی مظلوم چھاپ چکی تھیں انہیں عوام کی پوری ہمدردی حاصل تھی اور ان کے ارادوں کو متزلزل کرنا ناممکن تھا۔

اس ساری فضا میں ہمارا جو اور وزیر اعظم لاک کی ناقابل اندیشی سب سے بڑا ورثہ تھا۔ ادھر باقی ہندوستان میں دھڑلے سے تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ کیبنٹ مشن جس زمانے میں ہندوستان کی آئینی صورت کا نقشہ تیار کرنے میں مصروف تھا۔ اس وقت شیخ عبداللہ نے بھی ایک میمورنڈم بھیجا تھا جس میں ریاست کشمیر میں باقی ہندوستان کی طرح مکمل سیاسی آزادی کی مانگ کی تھی۔ کیبنٹ مشن کی سفارشات کے مطابق ملک کے ہمارے اور آزاد کا اعلان کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ برطانوی ہند کی آزادی کا اثر دیباستوں پر پڑنا لازمی تھا لیکن یہاں کشمیری حکومت خواب خرگوشہ میں پڑی ہوئی جبروت شمشاد کا بازار گرم کئے ہوئے تھی۔ اس لئے

۱۷۔ مئی ۱۹۴۷ء کو آچاریہ کرپلائی کشمیر آئے کہ معاملات کو سلجھائیں اور قوم پرستوں پر جو مظالم

توڑے جا رہے ہیں ان کا خاتمہ کرائیں۔ انہوں نے یہاں ایک ہفتہ تک قیام کیا اور مہاراجہ سے بھی ملے۔ ادھر شیخ برٹلڈ نے بعددوا جیل سے جہوں میں اپنے ایک دوست کو لکھا کہ ”مہاراجہ کو فوراً ہندوستان سے الحاق کر لینا چاہیے اور مہاراجہ کے اشاروں پر رقص کرنے والی مسلم کانفرنس کے اُن اعلانات کے چکر میں نہیں پھنسنا چاہیے جس میں مہاراجہ کو آزاد رہنے کا مشورہ دیا جا رہا ہے۔“ اس کے بعد اگست میں ہاتما گاندھی سری نگر گئے اگرچہ ان کا مشن سیاسی نہیں تھا پھر بھی مہاراجہ سے گفتگو کے دوران میں کچھ سیاسی بات چیت چلی تو مہاراجہ نے ہاتما گاندھی کو یقین دلایا کہ وہ حوام کی خواہشات کا پورا احترام کریں گے۔ اور اس میں شک نہیں کہ وزیر اعظم کاکا اسٹیفی اس کے فوراً ہی بددوا، جو یقیناً نیشنل کانفرنس کی ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔

یوم آزادی یعنی ۱۵- اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے کشمیر انہیں سیاسی حالات سے دوچار تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ کشمیر میں سلطانی جمہور کا زمانہ آگیا ہے اور اسے کوئی طاقت روک نہیں سکتی ہے۔

پہنچا تھا باب

پاکستان کا چارہانہ حملہ اور ہندوستان کے ساتھ الحاق

پاکستان اور ہندوستان کی آزادی کا اعلان علی الترتیب ۱۴ - ۱۵ - اگست ۱۹۴۷ء

کو ہوا تھا اور جیسا کہ گذشتہ باب کے مطالعہ سے واضح ہو چکا ہے اس وقت کثیری عوام کی جدوجہد اس مرحلہ پر پہنچ چکی تھی جہاں اس کی کامیابی میں کوئی شک اور شبہ باقی نہیں رہا تھا لیکن ابھی 'سلطانی' جمہور کے قیام میں ایک رکاوٹ بھی موجود تھی۔

برصغیر ہند کی تقسیم سے قبل 'برطانوی ہند' کے علاوہ یہاں ۵۵ ہندوستانی ریاستیں موجود تھیں۔ ان ریاستوں کا مجموعی رقبہ 'ہندوستان' کے مجموعی رقبے کا ۵۴ فی صد تھا اور ان کے باشندوں کی مجموعی تعداد کم و بیش 'انڈیا' کے برابر تھی۔ یہ تمام ریاستیں داخلی معاملات میں تقریباً خود مختار تھیں اور ان کے درمیان برطانیہ کی اقتدار اعلیٰ کی حیثیت حاصل تھی۔ لیکن برصغیر ہند کی آزادی کے فیصلہ کے بعد چونکہ برطانیہ کی مذکورہ بالا حیثیت قائم نہیں رہ سکتی تھی، اس لئے اس نے 'کینیڈا' میں 'میرزہ' می ۱۹۴۷ء ہی میں اعلان کر دیا تھا کہ 'برصغیر ہند' کی آزادی کے بعد ملک منظم کی حکومت، اقتدار اعلیٰ کی حیثیت سے اپنے اختیارات کو استعمال کرنے سے دست کش ہو جائے گی۔ چنانچہ جب ۳۰ جون ۱۹۴۷ء کو سرکاری طور پر

تقسیم ہند کی تجویز کا اعلان کیا گیا تو اس میں بھی یہ الفاظ موجود تھے کہ — ملکِ معظم کی حکومت اس بات کو واضح کر دینا چاہتی ہے کہ اس نے ہندوستانی ریاستوں سے متعلق 'کینٹ مشن میمنڈم' میں اپنی جرِ حرکتِ عملی کا اعلان کیا تھا اس میں کوئی ترمیم نہیں کی جائے گی — اس طرح بات واضح ہو گئی تھی کہ تقسیم ہند کی بدولت برصغیر ہند میں ہند اور پاکستان کے نام جو دو ملکیتیں عالم وجود میں آئیں گی برطانوی حکومت کی طرف سے جہاں انھیں اختیاراتِ حکومت منتقل کئے جائیں گے وہاں وہ ان حقوق و اختیارات نیز فرائض سے بھی دست کش اور بری ہو جائے گی جو ہندوستانی ریاستوں کے سلسلہ میں اسے حاصل تھے یا اس پر عائد ہوتے تھے جس کے بعد یہ ریاستیں بھی آزاد اور خود مختار ہو جائیں گی لیکن چونکہ برصغیر ہند کی تقسیم بن حالات کے ماتحت عمل میں آنے والی تھی ان کے پیش نظر — برصغیر ہند میں ان آزاد ریاستوں کی موجودگی سے حالات میں مزید الجھنیں پیدا ہو سکتی تھیں۔ اس لئے یہ بات بھی طے کی گئی تھی کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے قبل ہندوستانی ریاست کو یا تو ہند اور پاکستان میں سے کسی ایک ملک کے ساتھ وابستہ ہو جانا چاہیئے یا اسے آزاد رہنے کا فیصلہ کر لیتا چاہیئے۔ پھر یہ بات بھی طے کی گئی تھی کہ اگر کوئی ریاست ۱۵ اگست تک اپنے مستقبل کے متعلق کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکے تو وہ دونوں ملکوں کے ساتھ حالات کو ہوں کا توں باقی رکھنے کا معاہدہ بھی کر سکتی ہے لیکن مستقبل کے متعلق کوئی فیصلہ کرنے کا حق ہر ریاست کے عوام کو نہیں بلکہ حُکمران کو دیا گیا تھا۔ اور ان تمام عظیم تبدیلیوں کے باوجود جہاں تک ریاستی باشندوں کا تعلق تھا ان میں کمی خوشتر کو اور غیر کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔ انھیں ان کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے حق سے محروم کر دیا گیا تھا۔ ریاستوں کے آزاد رہنے کی صورت میں وہ پرانے جاگیردارانہ نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے اور کسی ملک کے ساتھ وابستگی کی صورت میں بھی اس بات کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ یہ وابستگی جلد ہی ان کے حالات پر اثر انداز ہو سکے گی۔

متحدہ ہندوستان کے نقشہ پر ایک نظر ڈالنے ہی سے۔ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تقریباً تمام ہندوستانی ریاستیں آج کے ہندو یونین ہی میں واقع تھیں اور سم یگ کے برعکس، انڈین نیشنل کانگریس جے ۱۵- اگست ۱۹۴۷ء کو تمام تر اقلیتوں کی حکومت منتقل کئے جانے والے تھے، ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کے آغاز ہی سے ہندوستانی ریاستوں میں ذمہ دار حکومتوں کے قیام کا مطالبہ کرتی رہی تھی۔ حتیٰ کہ ۱۹۳۹ء میں ایسٹس پیپلز کانفرنس نے 'انڈین نیشنل کانگریس' کے نظریات کی روشنی میں ریاستی حکمرانوں کے مخصوص حقوق میں تخفیف اور برطانیہ اور ان کے درمیان طے شدہ معاہدات کو وقت کے متغیروں کے منافی قرار دیتے ہوئے ان کی تیسرے کا مطالبہ بھی کیا تھا اور نیپٹ جواہر لال نہرو نے ریاستی عوام کی کانفرنس کے اس اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے کہا تھا کہ — یہ معاہدے جن کی رو سے ریاستی حکمرانوں کو مخصوص حقوق حاصل ہیں آزاد ہندوستان میں تسلیم نہیں کئے جائیں گے — اور یہ بات ظاہر ہے کہ آزاد ہندوستان میں برسرِ حکومت آنے کے بعد انڈین نیشنل کانگریس اپنے نظریات کو فراموش اور ریاستی عوام کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ ان حالات میں جولاہی سکھ واد میں ہندوستان کی عبوری حکومت نے سردار بدھ بھائی پٹیل کی سرکردگی میں 'ریاستی وزارت' قائم کر کے اس پیمائش سوال کو حل کرنے کی کوشش کی تھی جس کے نتیجے میں ۱۵- اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے ہی تین ہندوستانی ریاستوں کے علاوہ جن میں ریاست جموں اور کشمیر بھی شامل تھی باقی ماندہ تمام ریاستیں ہندیا پاکستا کے ساتھ وابستہ ہو گئیں اور جہاں تک ہندوستان کے ساتھ وابستہ ہونے والی ریاستوں کا تعلق ہے یہ امر محتاج بیان نہیں کہ اس وابستگی کی بدولت ان ریاستوں کے باشندے ہر اعتبار سے ہندوستان کے باشندوں کی سطح پر آگئے تھے۔

سطر بالا میں یہ بات بتائی جا چکی ہے کہ ریاست کے مستقبل کے فیصلہ لاحق اس کے حکمران کو دیا گیا تھا اور تین ہندوستانی ریاستوں کے علاوہ جن میں ریاست جموں اور کشمیر بھی شامل

مقی باقی ماندہ تمام ہندوستانی ریاستیں ۱۵۔ اگست سے قبل ہی ہندیا پاکستان کے ساتھ وابستہ ہو چکی تھیں۔ اس وقت کشمیر کے تمام عوامی رہنما قید خانوں میں بند تھے۔ ہمارا جہری سنگھ نے ۱۱۔ اگست ۱۹۴۷ء تک ریاست کے متنبین کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا اور ریاست کے باشندے تقسیم ہند کے فیصلہ کی بدولت روٹا ہونے والے اندوہناک نتائج کے ساتھ اس بات کو بھی دیکھ رہے تھے کہ ہندوستان کے ساتھ وابستہ ہونے والی ریاستوں کے باشندے کس طرح 'سلطانی جمہور' میں حصہ دار بن چکے ہیں۔ اور انہیں اس بات کی توقع تھی کہ ہندوستان کے ساتھ ریاست جموں اور کشمیر کی وابستگی کے نتیجہ میں انہیں بھی 'دوسری ہندوستانی ریاستوں' کے باشندوں کے مساوی حقوق حاصل ہو سکیں گے۔ لیکن جب ۱۲۔ اگست کو ہمارا جہری سنگھ نے ہند اور پاکستان کے متعلق سربراہوں کو بذریعہ تار اپنے اس فیصلہ کی اطلاع دی کہ وہ فی الحال حالات کو 'جوں کا توں' رکھنے کا معاہدہ کرنا چاہتے ہیں تو ریاست کے باشندوں نے موسس کیا کہ ابھی انہیں اپنی منزل مقصود پر پہنچنے کے لئے کچھ اور جدوجہد کرنی پڑے گی۔ اس طرح جب برصغیر ہند میں آزادی کی پہلی صبح نمودار ہوئی تو ریاست جموں اور کشمیر کے باشندے بدستور اس کی برکتوں سے محروم تھے لیکن خود ریاست برطانوی اقتدار اعلیٰ کی کثرت سے آزاد ہو چکی تھی اور مہاراجہ نے 'اسٹینڈرٹل اگرمینٹ' کے ذریعہ سے اپنی اور ریاست کی اس وقت کی حیثیت اور حالت کو بظاہر محفوظ کر لیا تھا۔

ہندوستان کی تقسیم سے پہلے کشمیر سے متعلق حکومت ہند کی ذمہ داریوں میں ریاست کے ڈاک خانوں کا انصرام بھی شامل تھا اور چونکہ سری نگر کو راولپنڈی سے ملانے والا واہی جہلم کا راستہ پورے سال آمدورفت کے لئے کھلا رہتا تھا اس لئے تقسیم ہند کے بعد باشندگان کشمیر کی ضروریات زندگی کی ہم رسانی کی ذمہ داری بھی پاکستان پر عاید ہو گئی تھی اس لئے 'مہاراجہ' نے پاکستان کے ساتھ جو 'اسٹینڈرٹل اگرمینٹ' کیا تھا وہ ریاست

کی اس وقت کی حیثیت کو برقرار رکھنے کے علاوہ 'رسل و رسائل' ضروری اشیاء کی فراہمی اور لوگ غلو پڑتار گھروں کے انتظام اور انصرام سے بھی متعلق تھا۔

کشمیر اور پاکستان کے درمیان مذکورہ بالا معاہدہ ہو جانے کے بعد پاکستان بعض اسباب کی بنا پر اب محسوس کرنے لگا تھا کہ اس کے ساتھ کشمیر کی وابستگی یقینی اور لازمی بات ہے لیکن وہ اس معاملہ میں تاخیر کو اپنے لئے نقصان رسائی سمجھتا تھا اور اسی لئے اس نے معاہدہ کی کیسلی کی تاریخ سے ریاست جموں اور کشمیر پر قبائل کے حملہ کے وقت تک ایسے کسی اقدام سے گریز نہیں کیا جس کے ذریعہ سے ہمارا جو کہ پاکستان کے ساتھ اپنی ریاست کی وابستگی کے اعلان پر مجبور کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ اس نے اشیائے خور و معی کی ہم رسانی بند کر دی، یہاں کوٹ سے جموں تک جانے والی ریلوے لائن پر گاڑیوں کی آمد و رفت کو معطل کر دیا اور اس طرح ریاست کی اقتصاد دی ناکہ بندی کرنے کے علاوہ ریاست کے مغربی حصوں میں اپنے مسخ ہنڈیوں کی بھیج کر مقامی باشندوں کو خوفزدہ کرنے اور ریاست میں فتنہ اور فساد برپا کرانے کی کوشش بھی کرتا رہا اور معاہدہ کی براہ راست خلاف ورزی نیز دوسرے معاہدہ اذامات پر مہاراجہ کی طرف سے متواتر احتجاج کے چاتے رہنے کے باوجود پاکستان نے اصلاح حالات پر کوئی توجہ مبذول نہیں کی۔ چنانچہ پاکستان کے وزیر خارجہ نے کشمیر کے وزیر اعظم کے نام ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو جو تار روانہ کیا تھا اس میں ذیل کے الفاظ میں اس بات کو تسلیم کیا تھا کہ پاکستان معاہدہ کی پابندی سے قاصر رہا ہے۔ اس تاریخ میں لکھا تھا کہ ۱۔

”ہم جو کچھ کر سکتے ہیں اسے کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ہم کشمیر کو اس کی ضرورت کی ہر شے فراہم کرنے کے لئے ضروری تدابیر اختیار کر رہے ہیں۔ لیکن اس بات کو مدنظر رکھنا چاہیے کہ ہماری راہ میں کچھ مشکلات بھی حائل ہیں۔ مثلاً لاریوں کے ڈرائیورز واپس مٹی سے سامان کو کوڑا پھینچانے میں

چکپتی تے ہی تے۔“

اور قبائل کے حملہ سے دو دنوں قبل جو تار روانہ کیا گیا تھا اس کا مضمون یہ تھا کہ:-

”نقل دہلی میں جو مشکلات پیدا ہو رہی ہیں ان پر قابو پانا مغربی پنجاب

کی حکومت کے بس سے باہر ہے۔ بیسی انہیں حکومت کے معاذ اور ضمانت

سے قسیم کرنا یا یہ سمجھنا کہ یہ سب کچھ آپ کی حکومت کو الحاق کے فیصلہ پر مجبور کرنے

کے لئے کیا جارہا ہے بالکل غلط ہے۔“

لیکن ان ہی دو دنوں تاروں سے کم از کم یہ بات ضرور ثابت ہو جاتی ہے کہ ہمارا جو نئے پاکستان

کے ساتھ جو معاہدہ کیا تھا مٹا دیا گیا اور اس پر قائم نہیں رہا تھا اور اگرچہ وہ اس معاہدہ

شکوک کو اپنی بعض مجبوریوں پر محمول کرتا تھا لیکن جیسا کہ بعد میں پلٹنے آنے والے واقعات نے

ثابت کر دیا ہے اس کا مقصد ہمارا جو کہ ریاست کے الحاق کا فیصلہ کرنے پر مجبور کر دینا تھا

اور چونکہ ہندوستان کی تقسیم کے بعد ریاست جموں اور کشمیر کے محل وقوع کے پیش نظر ہندو

کشمیر کے درمیان ریل و رسائل اور نقل و حمل کی تمام راہیں بند ہو چکی تھیں اور ہندوستان سے

دادی کشمیر کو ملانے والا وہ راستہ جو درہ بانہال سے ہو کر گذرتا ہے اس وقت موسم سرما

میں بند ہو جاتا تھا اور ریاست جموں اور کشمیر اس وقت ریل و رسائل اور نقل و حمل کے

وسائل میں پاکستان ہی کے دستِ نگر ہو جاتا اس لئے پاکستان کے ارباب حل و عقد کو اس

بات کا یقین کامل تھا کہ الحاق کا فیصلہ پاکستان ہی کے حق میں ہوگا۔

پھر جہاں تک ریاست جموں اور کشمیر میں پاکستانیوں کے مسلح گروہوں کے داخلہ کا

تعلق ہے اس کا ثبوت پونچھ کی امن بنیاد سے ملتا ہے جو وہاں ریاست کے خلاف اگست

۱۹۴۷ء کے دوسرے ہی ہفتہ میں رونما ہو گئی تھی اور اسی بغاوت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ

پاکستان کے قیام کے روزِ اولیٰ ہی سے وہاں کے حکمران ریاست جموں اور کشمیر پر قبضہ کر لینے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اس کے علاوہ ستمبر اور اکتوبر میں ریاست کی سرحدوں کے اندر ریاستی باشندوں اور پاکستانیوں کے درمیان متوازن جو مسلح جھڑپیں ہوتی رہی تھیں ان سے بھی اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ پاکستان اقتصاداً ناگزیر ہی کے ذریعہ سے نہیں بلکہ ریاست میں اپنے مسلح لشکریوں کو بھیج کر اور فتنہ و فساد برپا کر کے بھی مہاراجہ کو الحاق کا فیصلہ کرنے پر مجبور کر دینا چاہتا تھا۔

پاکستان کے مذکورہ بالا طرزِ عمل کے مقابلہ میں ریاست جموں اور کشمیر کے الحاق کے متعلق ہندوستان کا جو طرزِ عمل تھا اسے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ان الفاظ میں واضح کیا ہے کہ:-

”اگر وہ (مہاراجہ ہری سنگھ) ۱۴- اگست سے پہلے پاکستان کے ساتھ ریاست کا الحاق کر لیتے تو ہندوستان میں قائم ہونے والی حکومت نے مجھے اختیار دیا تھا کہ میں اس کی طرف سے مہاراجہ کو اس بات کا یقین دلا دوں کہ اسے ان کے اس فیصلہ پر کسی قسم کا اعتراض نہیں ہو گا۔“

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مذکورہ بالا الفاظ میں ہندوستان کے جس طرزِ عمل پر روشنی ڈالی ہے اس کی توثیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ جب مہاراجہ ہری سنگھ نے ۱۶- اگست کو پاکستان کے ساتھ ہندوستان سے بھی اسٹینڈرٹل انگریمنٹ کر لینے کی دعوت کی تھی تو ہندوستان نے محض اسی بنا پر کہ وہ ریاست جموں اور کشمیر کے مستقبل سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتا تھا اور وہ کسی طرح بھی مہاراجہ کی فوری فیصلہ پر اثر انداز نہیں ہونا چاہتا تھا اس

-
6. Address to the East India Association
June 29, 1948 in the ASIATIC Review
London, Vol. XLIV, Oct. 1948, P. 352

درخواست یا پیش کش کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ پھر اسی قدر نہیں بلکہ مائیکل بریجسپرے لکھا ہے کہ ہندوستان اور ریاست جموں اور کشمیر کے درمیان اسٹینڈ اسٹل اگر مینسٹر ہونے کے دوسرے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ :-

”ہندوستان کوئی ایسا قدم اٹھانے کے لئے تیار نہیں تھا جو پاکستان اور اس کے درمیان تبادلہ خیالات اور نزاع کا ایک اور سبب بن جاتا۔“

ان الفاظ سے جن میں اس وقت کی صریح صورت حال کو بیان کیا گیا ہے یہ نتیجہ اخذ کر لیتا کوئی دشوار کام نہیں کہ ایک جانب تو ہندوستان اپنی جگہ کشمیر کے معاملہ میں قطعاً بے تعلق رہتا اور اس ریاست کے مستقبل کے سوال کو اس کے حکمران کے آزاد فیصلہ پر چھوڑ دینا چاہتا تھا اور دوسری طرف وہ پاکستان کے ساتھ خوش گوار تعلقات قائم کرنے کا بھی خواہش مند تھا اور کوئی ایسا جائزہ ندم بھی اٹھانے کے لئے تیار نہیں تھا جس سے دونوں ملکوں کے درمیان کوئی غلط فہمی پیدا ہو جائے ان اسباب کے علاوہ اس معاملہ میں ہندوستان کی خاموشی کا ایک اہم سبب یہ بھی تھا کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان میں قائم ہونے والی حکومت کی سربراہی وہی لوگ کرنے والے تھے جو ہمیشہ ریاستی باشندوں کی آزادی کے مطالبہ کی حمایت اور ریاستی حکمرانوں کے مخصوص حقوق اور اختیارات کی مخالفت کرتے رہتے تھے اور ریاست جموں کشمیر کے معاملہ میں بھی وہ صرف ہمارا جرحی درخواست کو اسٹینڈ اسٹل اگر مینسٹل یا الحاق کی بنیاد نہیں بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ مٹری، این دھرنے لکھا ہے کہ :-

”ہندوستان سے بھی اسی قسم کی درخواست کی گئی تھی لیکن ہندوستان کا

موقف یہ تھا کہ کسی ملک کے ساتھ الحاق کا فیصلہ محض ریاست کے باشندے

ہی کر کے ہیں۔"

بہر حال برصغیر ہند کی آزادی کے بعد ریاست جموں اور کشمیر کی صورت حال یہ تھی کہ ایک طرف تو ریاست کے حکمران نے الحاق کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا دوسری طرف ہندوستان اپنے جمہوری منطلقات کی بنا پر مہاراجہ کے ساتھ ریاست کے متعلق کوئی سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار نہیں تھا اور تیسری جانب پاکستان نہ صرف پٹرول، پکڑے، نمک اور غلہ کی بہم رسانی ہی کو روک کر مہاراجہ کو پاکستان کے ساتھ ریاست کے الحاق پر مجبور کر کے کی کوشش کر رہا تھا بلکہ مسلم پاکستانیوں کے گروہ بھی ریاست میں داخل ہو کر شادائے برپا کرنے میں مصروف تھے اور تقسیم کی بدولت پناہ گزینوں کی آمد و رفت نے بھی ریاست کے اربابِ محل و عقد کے لئے ایک زبردست الجھن پیدا کر دی تھی۔ ان تمام باتوں کے باوجود الحاق کے معاملہ میں مہاراجہ نے کامل غمزدگی اور استقلال کا ثبوت دیا تھا اور وہ پاکستان کے ساتھ ریاست کے الحاق پر آمادہ نہیں ہوئے تھے اس کے برعکس انہوں نے ۱۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کو شیخ محمد عبداللہ اور ان کے دوسرے رفقاء و کار کو رہا کر دیا تھا اور نیشنل کانفرنس پر عالم کی ہوئی پابندی کو منسوخ کر دیا تھا اور اسی طرح مستقبل کے فیصلہ میں بالواسطہ طریقہ پر نیشنل کانفرنس اور اس کے رہنماؤں کو بھی شریک کر دیا تھا۔

کنٹینر نیشنل کانفرنس کے رہنماؤں کی رہائی کے بعد حالات نے جو نیا رخ اختیار کیا وہ یہ تھا کہ ان رہنماؤں نے الحاق کے سوال پر غور کرنے سے پہلے عوام کو جس بات پر توجہ دلائی وہ یہ تھی کہ سب سے پہلے انھیں جائیداد، دارالمنہ نظام حکومت کی گرفت سے نجات حاصل کرنی چاہیے۔ نیشنل کانفرنس کے رہنماؤں کی رہائی کے بعد سے کنٹینر چلنے کے وقت تک جو حالات پیش

1- The Kashmir Problem, Political and Economic

Background by P. N. Dhar, INDIAN QUARTERLY

April-June, 1951

آئے رہے تھے انیس فیصد محمد عبداللہ نے فردوسی ~~۱۹۵۸ء~~ میں مجلس تحفظ کے اجلاس منعقدہ
ایک سبس کے روبرو بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ :

”قید خانہ سے رہائی کے فوراً ہی بعد ہمارے سامنے دو اہم سوال آیا وہ یہ
تھا کہ ہمیں ہندوستان کے ساتھ ملحق ہونا چاہیے یا پاکستان کے ساتھ یا پھر
آزاد رہنا چاہیے۔۔۔۔۔ یہ سوال بہت زیادہ دشوار تھا لیکن میں نے
اپنے اہل وطن کو مشورہ دیا کہ اگرچہ ہمارے لئے یہ سوال بہت زیادہ اہمیت رکھتا
ہے لیکن اس کی حیثیت ثانوی ہے اور ہمارے لئے مقدم ترین سوال ہمارا جو
کی مطلق الحاقی حکومت سے آزادی حاصل کرنے کا ہے۔۔۔۔۔ اس وقت تک
ہمارا مقصد حاصل نہیں ہوا تھا اس لئے میں نے اپنے اہل وطن سے کہا کہ پہلے
اپنا یہ نصب العین حاصل کرنا چاہیے اور اس کے بعد آزاد انسانوں کی طرح
اس بات کو طے کرنا چاہیے کہ ہمارا مفاد کس امر پر منحصر ہے۔ قدرتی طور پر ہم
اپنی آزادی سے پہلے اس اہم سوال کا فیصلہ نہیں کر سکتے تھے اس لئے ہم نے
الحاق سے پہلے آزادی کا قرعہ بلند کیا۔ بعض پاکستانی دوست سری نگر میں
مجھ سے ملے۔ ہمارے درمیان صاف صاف باتیں ہوئیں اور میں نے ان پر اپنا
نقطہء نظر واضح کیا اور غیر مبہم الفاظ میں ان سے کہا کہ ماضی میں ہمساری
آزادی کی تحریک کے متعلق پاکستان کا رویہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ رہے ہو یکساں
وہ ہمارے فیصلہ پر اثر انداز نہ ہو سکے گا اور اگر ہم یہ محسوس کریں گے کہ
ہم لاکھ کشمیریوں کا فائدہ پاکستان کے ساتھ الحاق ہی میں ہے تو پینڈٹ
جواہر لال نہرو اور کانگریس کی دوستی اور ہماری آزادی کی تحریک میں ان کی
اعانت اور حمایت بھی ہمارے فیصلہ کو متاثر نہیں کر سکے گی۔

میں نے ان سے درخواست کی تھی کہ انہیں ہم سے کوئی فیصلہ کرانے میں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیئے بلکہ ہماری قریب کی حمایت کرتے ہوئے ہمیں ہمت دینی چاہیئے۔ میں نے ان سے یہ بھی کہا تھا کہ ہمارے آزاد ہو جانے کے بعد بھی ہمیں الحاق کے سوال پر غور کرنے کی ہمت ملنی چاہیئے اور میں نے یہ بات بھی بتا دی تھی کہ ہندوستان نے ہمارے اس زاویہ منظر کو تسلیم کر لیا ہے اور اس کی طرف سے ہمیں الحاق کے سوال کا فیصلہ کرنے پر مجبور نہیں کیا جا رہا ہے۔

پاکستانی دوستوں کے ساتھ ان ہی مذاکرات کے دوران میں میں نے اپنے ایک رفیق کار کو لاہور بھیجا تھا جہاں اس نے پاکستان کے وزیر اعظم سترلیاقت علی خان اور مغربی پنجاب کی حکومت کے دوسرے اعلیٰ کارکنوں سے مل کر ان کے سامنے یہ ہی نقطہ منظر پیش کیا تھا اور ان سے درخواست کی تھی کہ انہیں الحاق کے اعلان پر مجبور کرنے کی بجائے آزادی حاصل کرنے میں ہماری مدد کر کے ہمیں اس اہم سوال پر غور کرنے کی ہمت دینی چاہیئے۔ لیکن ابھی یہ مذاکرات جاری ہی تھے کہ ایک روز یہ اطلاع موصول ہوئی کہ صوبہ کشمیر کے ایک سرحدی قصبہ مظفر آباد پر پوری قوت سے حملہ کر دیا گیا ہے۔"

میرا حال جیسا کہ سطور بالا کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے ابھی نیشنل کانفرنس کے رہنماؤں اور پاکستان کے ارباب حکومت کے درمیان گفت و شنید جاری ہی تھی کہ ۲۶-۱۰-۱۹۴۷ء

کو جدید ترین اسلحہ سے مسلح قبائلی علاقہ کے باشندوں نے شمال مغربی صوبہ اور مغربی پنجاب کی سرحدوں کو عبور کر کے کشمیر پر یورش شروع کر دی اور اگرچہ ان حملہ آوروں کی قیادت بھی پاکستانی فوجی افسر ہی کر رہے تھے اور ایک امریکن فوجی سپاہی رسل کے، ہالٹ (جوئیر) کے بیان کے مطابق جو دو ماہ تک کشمیر پر حملہ آور فوج کے ساتھ رہ چکا تھا۔

”پاکستان نے قبائلی حملہ آوروں کو پٹرول ہتیا کیا تھا ان کے لئے کیپ قائم کئے تھے اور انہیں گولہ بارود ہم پہنچایا تھا۔“

لیکن جب قبائلی کا یہ حملہ بھی کشمیر کو فتح اور کشمیریوں کو مرعوب اور خوفزدہ کرنے میں کامیاب ثابت نہیں ہو سکا تو پاکستانی افواج کے کمانڈر ان چیف لارڈ آگن لک کے بیان کے مطابق ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو

”سٹر جنرل نے پاکستانی افواج کو کشمیر میں داخل ہو جانے کا حکم دے دیا تھا۔“

اور اگرچہ لارڈ آگن لک کی کوشش سے دو ستر ہی روز یہ حکم منسوخ بھی ہو گیا تھا لیکن اس کی یہ تیغ رسمی تھی اور جیسا کہ بعد کے واقعات سے ثابت ہو جائے گا اس جارحانہ حملہ میں پاکستان کی باقاعدہ افواج باقاعدگی اور توازن کے ساتھ حصہ لیتی رہی تھیں۔ حتیٰ کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے پریس آفائس سٹر کیپٹل جانشن نے ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو اپنی ڈائری میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور اخبار اسٹیشنز اکادمی کے ایڈیٹر گفتگو کا اندراج کرتے ہوئے یہ بھی لکھا تھا کہ:

”لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی گفتگو کو باری رکتے ہوئے کہا کہ سٹر جنرل

ایسٹ آباد میں مقیم تھے اور اس امر کے متوقع تھے کہ وہ فاتح کی حیثیت سے کشمیر میں داخل ہوں گے لیکن انھیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔

ریاست جموں اور کشمیر پر پاکستان کی امداد اور پاکستان کے فوجی افسروں کی قیادت میں ۲۲- اکتوبر ۱۹۴۷ء کو جو جارحانہ حملہ شروع کیا گیا تھا وہ ایک باقاعدہ منصوبہ پر مبنی تھا اس میں ہزاروں مسلح قبائلی شریک تھے اور حکومت ہند کی طرف سے جموں اور کشمیر کے حالات پر جو قریطاس ابغی (دبائٹ پیپر) شائع کیا گیا تھا اس میں بتایا گیا تھا کہ اگرچہ لڑائی میں صرف ۳۰۰ قبائلی حصہ لے رہے تھے لیکن مغربی پنجاب میں جمع ہونے والے قبائلیوں کی تعداد ۳۰۰۰۰ تھی اور چونکہ ریاست کی مغربی فوج کے لئے اس منظم اور باقاعدہ حملہ کی مدافعت ممکن نہیں ہو سکتی تھی اس لئے وہ علامتی مقابلہ کرنے کے بعد پسپا ہو گئے اور حملہ آور مظہر آباد اور ادوڑی پر قبضہ کرنے کے بعد وادی جہلم کے راستہ پر پیش قدمی کرتے ہوئے ۲۶- اکتوبر کی صبح کو بارہ مولا پہنچ گئے جو سری نگر سے ۳۰ میل مغرب کی سمت میں واقع ہے سچی کہ انھوں نے اسی روز آگے بڑھ کر سری نگر سے صرف ۱۰ میل دور مہورہ کے اس بھلی گھر اور اس کے گرد و نواح کے علاقہ پر بھی قبضہ کر لیا جہاں سے سری نگر کو بجلی ہٹیا کی جاتی ہے اور سری نگر کے باشندوں کو حملہ آوروں کے اس قتل و قریب پہنچ جانے کا اندازہ اس وقت ہو سکا جب انھیں رات کو بجلی کی روشنی میسر نہیں ہو سکی۔ ریاستی فوج پہلے ہی دن مقابلہ سے قاصر ہو چکی تھی اور حملہ آوروں کی اس کامیابی سے دل برداشتہ ہو کر اب سنہری حکام بھی راہ فرار اختیار کرنے لگے تھے۔ اس طرح منظم و نسق بالکل معطل ہو گیا تھا اور اب حملہ آوروں کے لئے سری نگر تک پہنچنے میں بظاہر کوئی رکاوٹ باقی

نہیں رہی تھی اور ان کی پیش قدمی برابر جاری تھی اور وہ ۲۷- اکتوبر کو سری نگر سے مرنے
چار میل کے فاصلہ پر رہ گئے تھے۔

اس حملہ سے پاکستان کا مقصد دیا ست جموں اور کشمیر کو فتح کر کے اس کے باشندوں
کو غلام بنانے کے علاوہ کچھ نہیں تھا اور اگرچہ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم سٹریات علی خان
نے ہندوستان کے وزیر اعظم نیڈت جواہر لال نہرو کے متعدد احتجاجی مراسلوں کے جواب
میں ۳۰ دسمبر کو لکھنؤ کو جو طویل مکتوب روانہ کیا تھا اس میں حملہ آوروں کے ساتھ پاکستان
کے تعلق سے انکار کرتے ہوئے یہ بھی لکھا تھا کہ ریاست سے گزرنے والے مسلمان پناہ گزینوں
اور ریاست کے مسلمان باشندوں پر ریاست کی فوج جو مظالم برپا کر رہی تھی ان سے
متاثر ہو کر قبائلوں نے اچانک یہ حملہ کر دیا ہے۔ لیکن واقعات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی
ہے کہ اس حملے کا مقصد ریاستی فوج کے حقیقی یا مفروضہ مظالم سے مسلمانوں کو نجات دلانا
نہیں بلکہ قبائلیوں کو لوٹ مار اور قتل و غارتگری کی عام اجازت دے کر انھیں خوش کرنا
اور ان کے ذریعہ سے کشمیر کو دائمی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لینا تھا۔

اس طوفانی حملہ کے دوران میں مذہبی امتیاز کے بغیر ہر شخص پر انتہائی وحشیانہ
مظالم برپا کئے گئے تھے حتیٰ کہ لارڈ برڈوونے بھی جے کشمیر کے واقعات کو قلمبند کرنے میں کسی
طرح غیر جانبدار نہیں کہا جاسکتا دے ہوئے الفاظ میں اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ:

”قبائلیوں کی پہلی فوج، جو تقریباً دو ہزار افراد پر مشتمل، لوگوں میں

سواہر کر ایبٹ آباد سے گزرتی ہوئی ۲۲- اکتوبر کو کشمیر کے علاقہ میں داخل
ہوئی اور اس نے راستہ میں ڈویل اور مظفر آباد کو لوٹ کر انھیں لگا دی

بیکس لارڈ بسٹوڈ نے مذکورہ بالا مبہم الفاظ میں جس حقیقت کو چھپانے کی کوشش کی ہے
عزیز جانیدارانہ مبہموں اور وقائع نگاروں نے اپنے بیانات اور تقریروں میں اسے قطعاً
بے نقاب کر دیا ہے۔ چنانچہ میری تحریر نے لکھا ہے کہ ۱۔

” قبا لیکوں کے حملہ کی متعدد خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ
بھی تھی کہ ان کی لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت گری سے ہندو اور مسلمان
دونوں ہی محفوظ نہیں رہ سکے تھے۔ حملہ آوروں کے ظلم و تلوار کی تعدیت
کے لئے بہت سے ثبوت موجود ہیں امدیادہ مولا کے سینٹ جوزف کاؤنٹی
میں تو یہ مظالم حد انتہا کو پہنچ گئے تھے۔“

امدیادہ مولا میں ان حملہ آوروں نے جو وحشیانہ مظالم برپا کئے تھے بیویارک ٹائمز کے ناٹک کار
ڈیوٹ ٹریبل نے انھیں ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ۱

” شہر کو بالکل لوٹ لیا گیا تھا اور جمعہ کی شب کو ہندوستانی فوج کی آمد
سے پہلے شہر کی نوجوان عورتیں حملہ آوروں سے بچنے کے لئے شہر چھوڑ
کر بھاگ گئی تھیں اور ان حملہ آوروں نے باقی ماندہ شہریوں کو جن کی
تعداد ۳۰۰۰ تھی نیز ۲ یورپین باشندوں اور ایک سابق برطانوی فوجی
افسر کرنل ڈائلکس اور اس کی حاملہ بیوی کو تزیین کر دیا تھا۔
اور آج بارہ مولا میں ہندوستانی فوج کی آمد سے ہم ۲ گمنام کے بعد اس
شہر کے چودہ ہزار باشندوں میں سے صرف ایک ہزار باقی رہ گئے ہیں“

۲۔ پریم ناتھ بزاز نے سینٹ جوزف کاؤنٹی کے حالات کو اپنے ایک مقالہ ”مقتدا باؤٹھیر“

1. The Struggle for Kashmir. P. 27

2. New York Times 10.11.47

میں بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

”ایک برس سالہ ہندوستانی نرس نے ایک ایسی مسلم خاتون کو بچانے کی کوشش کی تھی جس نے کچھ ہی دیر پہلے ایک بچہ کو جنم دیا تھا لیکن پہلے اس نرس کو گولی مار دی گئی اور اس کے بعد اس مسلمان خاتون کو ہلاک کر دیا گیا۔“

یہاں میر مقبول شیروانی کا واقعہ بیان کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ میر مقبول شیروانی کشمیر نیشنل کانفرنس کا ایک مخلص کارکن اور قوم پرست کشمیری نوجوان تھا۔ کشمیر پر حملہ شروع ہوا تو وہ دشمن کے عقب میں رہ کر اپنے اہل وطن کو بلا امتیاز مذہب و ملت متحد ہو کر دشمن کا مقابلہ کرتے رہنے کی ترغیب دیتا رہا لیکن چند روز کے بعد ان حملہ آوروں نے اسے گرفتار کر لیا اور چوک میں لاکر اسے یہ اعلان کرنے کا حکم دیا کہ ”مسلمانوں کے لئے پاکستان کے ساتھ شریک ہو جانا ہی مفید ہے“ لیکن جب اس نے یہ اعلان کرنے سے انکار کر دیا تو اسے سہ راہ ایک برآمدہ کے ستون کے ساتھ اس طرح باندھ دیا گیا کہ اس کے بازو صلیب کے بازوؤں کی طرح پھیل گئے۔ اس کے بعد انھوں نے ”پاکستان زندہ باد“ کا نعرہ بلند کرنے کا حکم دیا۔ اس کی دونوں مقبلیوں میں مینیں گاڑ دیں اور بین کے ایک ٹکڑہ پر یہ جملہ لکھ کر کہ ”غدار کی سزا موت ہے“ اس ٹکڑہ کو شیروانی کی پیشانی پر آویزاں کر دیا اور ان سب باتوں کے بعد چودہ قبائلوں کی راکٹوں سے بیک وقت چلنے والی گولیوں نے کشمیر کے اس بہادر فرزند کے جسم کو چھلنی چھلنی کر دیا۔ لیکن ’پاکستان زندہ باد‘ کے بجائے زندگی کے ان آخری لمحات میں بھی شیروانی کی زبان سے جو نعرہ بلند ہوا تھا وہ یہ تھا کہ :-

ہندو مسلم اتحاد پائندہ باد

1. Daily Express, London, 11.11.47

2. Halfway to Freedom Pp. 210-11

ریاست جھوں اور کشمیر میں اچانک جو واقعات پیش آئے تھے ان سے کشمیر کے عوام عوامی رہنماؤں اور ہمارا جہ کا غیر متاثر نہ رہنا ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ان نازک ترین لمحات میں جبکہ دشمن سری نگر کے دروازہ پر کھڑا ہوا تھا، ہمارا جہ اور تمام اعلیٰ احکام سری نگر سے جا چکے تھے اور ریاست کا انتظامی شیرازہ اس طرح منتشر ہو چکا تھا کہ حکومت کا کوئی وجود باقی نہیں رہا تھا۔ نیشنل کانفرنس کے رہنماؤں نے ایک جرأت مندانہ قدم اٹھا کر نظم و نسق کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں سنبھال لی۔ ان رہنماؤں کی آواز پر پندہ ہنرا ہندو، مسلمان اور سکھ دیکھتے دیکھتے عوامی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ ان قوی رضا کاروں میں مرد اور عورتیں ہی نہیں بلکہ بچے بھی شامل تھے اور اس حال میں کہ شیخ محمد عبداللہ کے بیان کے مطابق:

”سابقہ حکومت نے مالی دیوالیہ پن اور اقتصادی بد حالی کے علاوہ کچھ نہ چھوڑا تھا۔“

اس عوامی حکومت اور عوامی فوج نے نہ صرف مالی اور اقتصادی مشکلات پر قابو پالے کا فیصلہ کر لیا بلکہ اس حکومت نے عوامی فوج کے ذریعہ اس فوجی خصلت کو بھی پُر کر دیا جو ریاستی فوج کی عدم موجودگی کے باعث پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ یہی وہ عوامی فوج تھی جس نے سری نگر میں مکمل مٹھری انتظام اور فرقہ وارانہ یک جہتی کو برقرار رکھا تھا اور یہی وہ عوامی فوج تھی جو ہندوستانی افواج کے کشمیر پہنچنے تک حملہ آوروں سے سری نگر کی مدافعت کرتی رہی تھی۔ یہ عقائدہ بد عمل ہوا چانک پیش آنے والے ان واقعات کا کشمیر کے عوام پر ہوا تھا لیکن ہمارا جہ بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے تھے اور وہ محسوس کرنے

-
1. Presidential Address, All J. & K. National Conference Annual Session, 1949

لگے تھے کہ اگر انھوں نے اس وقت الحاق کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کیا تو حالات بالکل ہی ان کے قابو سے باہر ہو جائیں گے۔ اس کے باوجود وہ الحاق کے فیصلہ کو ملتوی کر دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس سلسلہ میں ایک محتاط قدم اٹھایا اور ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو حکومت ہند سے صرف یہ درخواست کی کہ وہ ہندوستانی افواج کو کشمیر بھیج کر ریاست کو قبائلی حملہ آوروں سے پاک کر دے میں ان کی امداد کرے۔

کشمیر پر قبائلیوں نے ۲۲-۱۰ اکتوبر کو حملہ کیا تھا اور یہ بات ظاہر ہے کہ حکومت ہند اس حملہ اور حملہ آوروں کی پیش رفت سے بے خبر نہیں رہ سکتی تھی۔ اس کے باوجود اس نے اس ریاست کے معاملات سے بے تعلق رہنے کا جو فیصلہ کر رکھا تھا اس کے پیش نظر اس نے اس اہم واقعہ پر بھی کوئی توجہ مبذول نہیں کی۔ چنانچہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے پیرس اتاشی سٹرکیپ جلی جانسن نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ عوام کے رویہ و :

قبائلیوں کے حملے کا تذکرہ پریگرت نہر سرونے پہلی بار ۲۴-۱۰ اکتوبر

۱۹۴۷ء کو کیا تھا۔ دوسرے دن اس مسئلہ پر انڈین ڈیپنٹس کمیٹی میں فوراً کیا گیا اور کمیٹی نے اس امر کی حمایت کی کہ ۲۴-۱۰ اکتوبر کو ہمارا جرنل جو درخواست کی تھی اسی کے مطابق فوراً ہی ہندوستانی فوج کو کشمیر بھیج دیا جائے لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس رائے سے اختلاف کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کوئی فوجی قدم اٹھانے سے پہلے الحاق کا فیصلہ ہو جانا چاہیئے اور یہ الحاق عارضی اور استصواب رائے عامہ کے ساتھ مشروط ہونا چاہیئے۔ ان دو باتوں کا کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا، لیکن جو ٹھوس فیصلہ ہوا وہ یہ تھا کہ مینٹل حالات

کی وضاحت کے لئے سری نگر بھیجا جائے :-

اس فیصلہ کے مطابق سرزمین نے سری نگر پہنچ کر ہمارا جو صورت حالات سے آگاہ کیا اور ہمارا جو کی دستاویز الحاق ہمراہ لے کر دوسرے ہی روز دہلی واپس آگئے اور اس طرح ریاست جموں اور کشمیر ۲۶- اکتوبر ۱۹۴۷ء سے ہندوستان کا ایک جزو بن گئی۔

ہندوستان کے ساتھ ریاست جموں اور کشمیر کے الحاق کے متعلق ہمارا جو نے ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو جو مکتوب روانہ کیا تھا اس میں یہ بھی مذکور تھا کہ :

” فی الحال میری ریاست میں جو حالات رونما ہو رہے ہیں اور جو ہنگامی

صورت حال پیدا ہو گئی ہے اس کے پیش نظر میرے لئے ہندوستان سے مدد

مانگنے کے علاوہ کوئی اور چارہ کار باقی نہیں۔ قدرتی طور پر ہندوستان کی حکومت

اس وقت تک میری درخواست کے مطابق مجھے مدد نہیں دے سکتی جب تک

میری ریاست ہندوستان کے ساتھ ملحق نہیں ہو جاتی۔ اس لئے میں نے الحاق

کا فیصلہ کر لیا ہے اور میں آپ کی حکومت کی منظوری کے لئے اس مکتوب کے

ساتھ دستاویز الحاق بھی منسلک کر رہا ہوں۔“

لیکن الحاق کا یہ فیصلہ ہمارا جو ہی کا فیصلہ نہیں تھا بلکہ اس فیصلہ کو کشمیر نیشنل کانفرنس،

یعنی کشمیر کے عوام اور عوامی رہنماؤں کی کامل تائید اور حمایت بھی حاصل تھی۔ چنانچہ

شیخ عبداللہ نے ۳۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں کہا تھا کہ :

” اس سلسلے سے مجھ کو کم نے ہندوستان کا رخ کیا تھا اور وہ ہمیں پچا

1. The Struggle for Kashmir P. 37

2. Govt. of India White Paper on J. & K.

کے لئے آیا تھا۔ پंडت جواہر لال نہرو نے اپنی جہوری روایات کو برقرار رکھتے ہوئے محض ہمیں مدد دینے کے لئے ہمارا الحاق منظور کیا تھا اور انتہائی شرافت کا ثبوت دیتے ہوئے آخری فیصلہ کو کشمیری عوام کی توفیق پہنچوڑ دیا تھا۔ دونوں ملکوں کے طریق کار کے فرق کو سمجھنے کے لئے اس سے زیادہ ترسٹن مثال نہیں ملی سکتی۔

ہندوستانی فوج ہمیں بچانے کے لئے بروقت پہنچی اور اس نے کشمیر کی مدافعت کے سلسلے میں جو خدمات انجام دیں وہ اس کے طرۂ امتیاز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ پیرگیٹ پر عثمان، میجر شرما، کرنل رائے اور دوسرے بہادر سپاہیوں اور افسروں نے اپنی شجاعت اور جانی قربانیوں کی بدولت پاکستان کی جارحانہ پیش قدمی کو مسدود کر دیا۔ ان کی قربانیوں پر ہر کشمیری فخر محسوس کرتا ہے اور ہم وطن کے ان بہادر اور لائق سپاہی فسرز ندول کو سلام کرتے ہیں۔

یہاں ان امور کو مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ برصغیر ہند کی تقسیم کے ساتھ ساتھ ہندوستانی ریاستوں کے حکمرانوں کو ان کی ریاستوں کے مستقبل کا فیصلہ کن کا حق بھی دیا گیا تھا اور مسلم لیگ کی طرف سے ۱۶ جون ۱۹۴۷ء کو سرحد جناب نے ہندوستانی ریاستوں کے حکمرانوں کے اس حق فیصلہ کو تسلیم کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ:

”برطانوی اقتدار اعلیٰ کے ختم ہو جانے کے بعد سوری اور قانونی اعتبار سے

ہندوستانی ریاستیں آزاد اور خود مختار ہو جائیں گی اور وہ اپنے مستقبل کا فیصلہ

1. Presidential Address, AH J.K

National Conference Annual

Session 1949

کرنے میں بالکل آزاد ہوں گی۔ ان کے لئے ہندوستان اور پاکستان کی مجالس دستور ساز میں سے کسی ایک میں شامل ہو جانے یا آزاد رہنے کی رہیں کھلی ہوئی ہیں۔“

اس حق کے ساتھ ساتھ ہندوستانی رہباستوں کو، ہندو اور پاکستان کے ”ساتھ ساتھ ٹیبل آف“ کر لینے کا اختیار بھی دیا گیا تھا اور تقسیم کے سرکاری اعلان سے قبل ہمارا جو نے پاکستان میں قائم ہونے والی حکومت کے ساتھ یہ معاہدہ بھی کر لیا تھا، ہندوستان کو کشمیر کے الحاق کے سوال سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ نہ صرف پاکستان کے ساتھ اس کے الحاق ہی پر کوئی اعتراض نہیں کرتا چاہتا تھا بلکہ لارڈ مائونٹ بیٹن کے پریس آفیش سرٹیفیکٹ جالسی کی یادداشت کے مطابق

”درحقیقت ہندوستان کی ریاستی وزارت، پٹیلی کی زیر ہدایت، اپنے

عمومی طریقہ کار کے برعکس اکثریت کے معاملہ میں کوئی ایسا قدم اٹھانا نہیں چاہتی تھی جس کے متعلق کہا جاسکے کہ ہندوستان نے یہ قدم اکثریت کو الحاق پر مجبور کرنے کے لئے اٹھایا ہے اور اس نے پاکستان کو اس بات کا یقین دلانے میں بھی اپنے عمومی طریقہ کار سے انحراف کیا تھا کہ اگر کشمیر اس کے ساتھ مل جائے گا تو ہندوستان اس الحاق کو ناقص قرار نہیں دے گا۔“

پھر جہاں تک کشمیر نیشنل کانفرنس کے رہنماؤں کا تعلق ہے وہ ہمارا جو کی حکومت سے آزاد ہونے سے پہلے الحاق کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتے تھے اور پاکستان کے ارباب حل و عقد کو اس بات کا یقین بھی دلاتے رہے تھے کہ وہ الحاق کا فیصلہ کرتے ہوئے اس مخالفت

1. Dawn, 18.6.47

2. The Struggle for Kashmir Pp.37, 38

کو بھی نظر انداز کر دیں گئے جو کشمیر میں کی تحریک آزادی کے سلسلہ میں مسلم لیگ کی طرف سے کی جاتی رہی تھی اور ان تمام باتوں کی موجودگی میں یقین کے ساتھ یہ بات نہیں جاسکتی تھی کہ ریاست کے حکمران یا اس مطلق العنان حکومت کے خاتمہ کے بعد الحاق کے سلسلہ میں کشمیری عوام کا فیصلہ کیا ہوگا۔ اس کے باوجود کشمیر پر پاکستان کی طرف سے اچانک حملہ کیا گیا اور اس ہنگامی صورت حالات کے پیش منظر جب ریاست کے حکمران اور عوامی رہنماؤں کی طرف سے ہندوستان کے ساتھ ریاست کے الحاق کی درخواست کی گئی تو ہندوستان نے محض کشمیر اور اس کے باشندوں کو تباہی سے بچانے کے لئے ان کی اس درخواست کو منظور کیا تھا اور ان تمام حقائق کی موجودگی میں نہ تو الحاق کو قانونی اعتبار سے ناقص اور ناجائز کہا جاسکتا ہے اور نہ ہندوستان پر یہ الزام لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے کشمیر کو الحاق کے لئے مجبور کیا تھا۔

ریاست کے مستقبل کے فیصلہ کو مؤخر کرنے کے سلسلہ میں مہاراجہ اور نیشنل کانفرنس کے رہنما جو کچھ کرتے رہے اور اس معاملہ میں ہندوستان غیر جانبداری اور احتیاط کی جس حکمت عملی پر کاربند رہا تھا سطور بالا میں اس کی وضاحت کی جا چکی ہے لیکن کشمیر کے باشندے الحاق کے فیصلہ کو ملتوی کرنے اور اس فیصلہ سے قبل اس وقت کی مطلق العنان حکومت سے نہات پانے کے جس درجہ خواہش مند تھے اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کے ساتھ الحاق کے فیصلہ کے باوجود شیخ محمد عبداللہ نے ۱۳۰۱-۱۳۰۲ء کو ایک مرتبہ پھر پاکستان کے ارباب حکومت کو مصالحت کی دعوت دیتے ہوئے کہا تھا کہ :

میں سڑجناح سے درخواست کرتا ہوں کہ انھیں ریاست جموں و کشمیر

کے باشندوں کے حق بالائری کے جمہوری اصول کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ ریاست

کی آبادی ۸۷ فیصد مسلمانوں پر مشتمل ہے اور ان کے علاوہ میں ان کی آزاد

وائے کو ضرور مد نظر رکھا جانا چاہیئے۔ میں سرجناج سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ حملہ آوروں کو واپس بلائے میں اپنے اثر اور اپنی طاقت کو استعمال کریں اور اگر وہ چاہیں تو میں ان سے ملنے کے لئے کراچی آنے پر بھی رضا مند ہوں۔

لیکن سرجناج کی طرف سے مصالحت کی اس دعوت کا کوئی جواب نہیں دیا گیا تھا حالانکہ جولائی ۱۹۴۷ء کے اواخر میں سرجناج نے ایک بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ :

اگر کوئی ریاست پاکستان کے ساتھ الحاق کوئی سمجھوتہ یا معاہدہ کرنا چاہے گی تو پاکستانی مجلس دستور سازی گفت و شنید کرنے والی کمیٹی اگر اس کا قیام عمل میں آچکا ہوگا یا پھر حکومت پاکستان کے نمائندے باہمی تعلقات کی شرائط طے کریں گے۔

اس اعلان کے مطابق پاکستان کو مذکورہ بالا دعوت مصالحت کو قبول کر لینا چاہیئے تھا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کیا تو پاکستان کے ارباب حکومت نیشنل کانفرنس کے رہنماؤں کو باشندگان کشمیر کا نمائندہ نہیں سمجھتے تھے اس لئے وہ ان کی مذکورہ بالا درخواست کو اپنے اعلان کے دائرہ سے خارج تصور کرتے تھے یا پھر وہ خود کو قبائلیوں کے حملے کا مہ دار سمجھتے تھے اور اس معاملہ پر گفت و شنید کو بے سود یقین کرتے تھے۔

جہاں تک نیشنل کانفرنس کے رہنماؤں کی نمائندہ حیثیت کا تعلق ہے اول تو وہ ریاستی نظم و نسق کے معطل ہو جانے کے بعد ایک ایسی حکومت کی سربراہی کر رہے تھے جو بعد میں کشمیر کی دستوری اور قانونی حکومت ثابت ہوئی ہے لیکن اگر اس حقیقت کے باوجود اس بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ پاکستان کشمیر کی اس ملہگامی حکومت یا نیشنل کانفرنس کو کوئی حیثیت

1. Hindustan Times, 2.11.47

2. Dawn, 31.7.47

دینا نہیں چاہتا تھا تو قدرتی طور پر یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ وہ ہمارا جہ ہی کو ریاست کا حقیقی حاکم لائقین کرتا تھا اور اس حال میں اسے ہمارا جہ کے فیصلہء الحاق کو جائز سمجھنا چاہیے تھا اور اگر شیخ محمد عبداللہ کی اس دعوت مصالحت کو اس نے اس بنا پر قبول نہیں کیا تھا کہ وہ خود کو قبائلیوں کے حلقہ کا ذمہ دار اور اس کے ساتھ وابستہ نہیں سمجھتا تھا تو اس کی تردید کے لئے صرف اس قدر سمجھ لینا ضروری ہے کہ جس روز ہندوستانی افواج وادی کشمیر میں داخل ہوئی تھیں اسی روز مسٹر جناح نے لاڈ ماؤنٹ بیٹن اور پنڈت جواہر لال نہرو کو لاہور آکر کشمیر کے معاملہ پر گفت و شنید کی دعوت دی تھی اور اگرچہ اسی وقت پنڈت نہرو لاہور نہیں جاسکے تھے لیکن لاڈ ماؤنٹ بیٹن اور مسٹر جناح کے درمیان یکم نومبر کو لاہور ہی میں اس سوال پر تبادلہ خیالات ہوا تھا اور اگرچہ گفت و شنید اصل سوال کو حل کرنے کے زاویہء نظر سے ناکامیاب ثابت ہوئی تھی لیکن اس سے مسٹر جناح کا طریقہ عمل اور زاویہء نظر واضح ہو گیا تھا۔ چنانچہ مائیکل بریسیپر نے لکھا ہے کہ لاڈ ماؤنٹ بیٹن کے بیان کے مطابق:

”مسٹر جناح نے اپنی گفتگو کا آغاز ہندوستان کے خلاف اس اعتراض سے کیا کہ اس نے پاکستان کو کشمیر کے الحاق اور وہاں ہندوستانی افواج بھیجنے کی اطلاع دیر سے دی ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ الحاق اس لئے جائز نہیں کہ اس کی بنیاد تشدد پر رکھی گئی ہے۔ میں نے جواب دیا کہ بے شک یہ الحاق تشدد پر مبنی ہے لیکن یہ تشدد قبائلیوں سے سرزد ہوا ہے ہندوستان سے سرزد نہیں ہوا۔“

مسٹر جناح کی اولین تجویز یہ تھی کہ کشمیر سے تمام مسلح افواج کو بیک وقت واپس بلا لیا جائے اور جب میں نے دریافت کیا کہ قبائلیوں کو واپسی پر

کس طرح مجبور کیا جاسکتا ہے تو سر جٹ جی نے جواب دیا کہ اگر آپ ہندوستانی

افواج کو واپسی بلا لیں تو میں تمام قضیہ کو ختم کر دوں گا۔

اور اس گفتگو کے پیش منظر یہ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ پاکستان خود کو قبائلیوں

کے حملے کا ذمہ دار نہیں سمجھتا تھا یا وہ اس کے ساتھ وابستہ نہیں تھا۔

”یہاں معاملے کے اس پہلو کو بھی مد نظر رکھنا چاہیے کہ لاہور بڑا وڈ

کے بیان کے مطابق سر جٹ جی کو کشمیر میں ہندوستان کے فوجی اقدام کی

اولین اطلاع ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء کی شام کو لاہور میں ملی تھی ۱۰۰۰ اور

انہوں نے اسی وقت ٹیلی فون کے ذریعے سے راولپنڈی میں جرنل گرہی

کو یہ ہدایت دے دی تھی کہ وہ پاکستانی افواج کو وادی ہبلم میں

بھیج دیں۔“

لیکن جیسا کہ اسی باب میں کسی دوسری جگہ بتایا جا چکا ہے دوسرے دن سر جٹ جی کو

اپنی یہ ہدایت واپس لے لی پڑی تھی۔ اس حال میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر

پاکستان کو قبائلیوں کے حملے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا تو وہ وادی کشمیر میں ہندوستانی

افواج کے داخلہ کی خبر پا کر وہاں پاکستانی افواج کس لئے بھیجا جاتے تھے۔ ان کے اس

حکم کا ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ وہ قبائلی حملہ آوروں کو باقاعدہ فوجی مدد دیکر

کشمیر پر ان کے غاصبانہ اور جارحانہ حملے کو جاری رکھنا چاہتے تھے اور اس صورت میں

پاکستان اس حملے سے اپنے کو بری الذمہ ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور سر جٹ جی کے

اس حکم کا دوسرا مطلب یہ لیا جاسکتا ہے کہ وہ ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کے

1. The Struggle for Kashmir P. 39

2. Two Nations & Kashmir P. 61

فیصلہ سے بے جرح تھے اور کشمیر میں ہندوستانی فوجوں کے داخلہ کے بعد اپنی اس لاعلمی کی حالت میں وہ پاکستانی افواج کو کشمیر میں بھیجنا اپنا ایک جائز حق سمجھتے تھے لیکن جیسا کہ سطور بالا میں بتایا جا چکا ہے انھوں نے ۲۷- اکتوبر ہی کو لارڈ مائونٹ بیٹن اور پنڈت جواہر لال نہرو کو لاہور آکر کشمیر کے معاملہ پر تبادلوہ خیالات کرنے کی دعوت بھی دی تھی اور اس بات سے ثابت ہو جاتا ہے کہ انھیں وادی کشمیر میں ہندوستانی افواج کے داخلہ کی اطلاع کے ساتھ کشمیر کے الحاق کی اطلاع بھی مل چکی تھی اور وہ جان بوجھ کر ہندوستان کے خلاف جارحانہ پیش قدمی شروع کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ لارڈ برڈوڈ نے پاکستانی افواج کو کشمیر میں بھیج دینے کے حکم کی تیئذ پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

”۲۸- اکتوبر کی صبح کو آکن لک (سپریم کمانڈر افواج ہند اور پاکستان)

اور گنہ سی دگمانڈر این چیف افواج پاکستان) سٹر جناح سے ان کا حکم

منسوخ کرائے میں کامیاب ہو گئے۔ سٹر جناح کے لئے یہ ایک صبر آزمایا

فیصلہ تھا اور ان کی مالیسی کا احساس اس لئے حد انتہا کو پہنچا ہوا

تھا کہ انھیں ایک ایسے ملک سے محروم اور دست کش ہونا پڑا تھا

جسے وہ نسلی اور اقتصادی لحاظ سے پاکستان کا ایک حصہ سمجھتے تھے۔

اور ان سطور سے جنہیں لکھنے والے نے اپنی تحریروں کی ہر ہر سطر میں پاکستان کے موقف

کو صریح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے یہ سمجھ لینا کوئی دشوار کام نہیں رہ جاتا کہ پاکستان

ریاست جموں اور کشمیر کے معاملہ میں کسی قانونی یا جمہوری اصول پر عمل درآمد کرنے کے لئے

تیار نہیں تھا۔ وہ اس سلسلہ میں کشمیر کے باشندوں کی خواہشات کو بھی کوئی وقت دینا

ہیں چاہتا تھا۔ اس نے ابتداء ہی سے اس ریاست کو پاکستان کا ایک حصہ تصور کر رکھا تھا حتیٰ کہ اس کے ارباب حکومت ہندوستان کے ساتھ اس کے الحاق کے باوجود ہندوستان پر اس پر قبضہ کر لینا چاہتے تھے لیکن سر جنرل کو جس بات نے ان کے حکم کی تیسرے پر آمادہ کیا تھا وہ یہ تھی کہ :

”اس وقت پاکستان کی باقاعدہ فوج میں کسی ہم کو متروک کرنے کی قوت اور اہلیت موجود نہیں تھی۔ پاکستانی فوج کے دو یاتیں دیتے کشمیر میں اعلیٰ ہو کر سری نگر کو پاکستان کے لئے فتح تو کر سکے تھے لیکن وہ (پاکستانی افواج) پاکستانی مغربی پنجاب پر ہندوستانی فوج کے براہ راست حملے کی جو حالت میں یقیناً کیا جاسکتا تھا مدافعت نہیں کر سکتے تھے۔“

غرضیکہ تباہیوں کے حملے کی بدولت ہندوستان کے الحاق کا جو فیصلہ کیا گیا تھا اس کی قطعیت اور قانونی جواز پر اس دور میں بھی کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا تھا اور جیسا کہ آئندہ ابواب سے واضح ہو گا آج تو اس الحاق کے جواز کو مرض بحث میں لانے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں ہے۔

پانچواں باب

تنازعہ کی حقیقت

گذشتہ باب کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ ہندوستان کے ساتھ ریاست جموں اور کشمیر کے اقل کو کشمیر کے تنازعہ کی بنیاد قرار دیا گیا ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے اور کشمیر کا تنازعہ صرف اس بات پر مبنی ہے کہ پاکستان اس ریاست کو برقیہ پر اپنے ساتھ ملحق کر لینا چاہتا ہے۔

یہاں تفصیل کے ساتھ اس بات کے اعادہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ ہندوستان کے تقسیم کے منصوبہ کے ساتھ ساتھ ہندوستانی ریاستوں کے حکمرانوں کو یہ حق بھی دیا گیا تھا کہ وہ ۱۵-۱۶ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے یا تو ہند اور پاکستان میں سے کسی ایک مملکت کے ساتھ وابستہ ہو سکتے ہیں یا اپنی آزادی کا اعلان کر سکتے ہیں۔ اس فیصلہ یا اصول کو مسٹر جناح نے غیر مشروط طور پر تسلیم کر لیا تھا لیکن کانگریس چونکہ ریاستی عوام کے جمہوری حقوق کی حمایت کرتی رہی تھی اس لئے اس نے اس اصول کو کسی قدر تاخیر کے ساتھ قبول کیا تھا لیکن۔

”مسٹر کپیلی جانش کی شہادت کے مطابق اس نے اس اصول کو تسلیم کر

بچنے کے بعد الحاق کے اہم فیصلہ کے سلسلہ میں ہمارا جہ کی رائے کو متاثر کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔

اور لارڈ برٹوڈ نے جو اپنی تحریروں کی ہر سطر میں پاکستان کے خطرات اور اقدامات کو جائز ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اس معاملہ میں ہندوستان کی حکمت عملی کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ :-

” بلاشبہ اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ ہندوستان نے کثیر کے معاملہ میں کوئی مداخلت کی تھی۔“

لیکن اس سلسلے میں قوی ترین شہادت ہندوستان کے وزیراعظم نیٹو جواہر لال نہرو کا وہ بیان ہے جو انہوں نے ۲۵ نومبر ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کی مجلس دستور سازی میں دیا تھا اور اپنے اس بیان میں موصوف نے کہا تھا کہ :-

” ایوان اس امر سے واقف ہے کہ اس سال ۱۵- اگست کو تاج کی بالادستی ختم ہو جانے کے بعد کثیر دونوں ملکوں میں سے کسی ایک کے ساتھ بھی وابستہ نہیں ہوا تھا بلاشبہ ہمیں اس بات سے گہری دل چسپی تھی کہ ریاست کا فیصلہ کیا ہوگا۔ اس کے باوجود ہم نے اسے ہندوستان کے ساتھ ملٹی ہو جانے کے لئے بالکل ہی مجبور نہیں کیا، کیونکہ ہم کشمیر کی مشکلات کو جاننے والے تھے۔“

-
1. The Struggle for Kashmir P. 41
 2. Two Nations & Kashmir P. 61
 3. Kashmir 1947-56 P. 5

اور ان شہادتوں کی موجودگی میں جب یہ ثابت ہو جاتی ہے کہ ہندوستان نے مہاراجہ کو کسی لحاظ سے بھی الحاق پر مجبور نہیں کیا تھا اور خود مہاراجہ نے اپنے اس حق کو جسے مسلم لیگ کی طرف سے مسٹر جناح نے تسلیم کر لیا تھا، آزادانہ طریقہ پر استعمال کر کے ہندوستان کے ساتھ اپنی ریاست کے الحاق کا فیصلہ کیا تھا تو یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ خود الحاق کا فیصلہ اس تنازعہ کی بنیاد نہیں ہے بلکہ اس تنازعہ کی حقیقی بنیاد یہ ہے کہ پاکستان ریاست جموں اور کشمیر کو لارڈ مڈلے کی تصدیق کے مطلق نسلی اور اقتصادی لحاظ سے اپنا ایک حصہ یقین کرتا تھا اور ہندوستان کے ساتھ ریاست کے الحاق کے فیصلے نے اس کے اس یقین کو کامل مایوسی میں تبدیل کر دیا تھا اور پھر صغیر ہند کی تقسیم کے بعد ریاست جموں اور کشمیر سے متعلق جو واقعات رونما ہوتے رہے تھے ان میں ترتیب وار مطالبہ کرنے کے بعد اس کے علاوہ کوئی اور نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا کہ پاکستان نہ تو ریاست جموں اور کشمیر کی آزادی کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہو سکتا تھا اور نہ وہ ہندوستان کے ساتھ اس کے الحاق ہی کو گوارا کر سکتا تھا۔

گذشتہ باب میں اس امر کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ برصغیر ہند کی تقسیم کے بعد ریاست جموں اور کشمیر عملاً ہندوستان سے علیحدہ ہو گئی تھی۔ ہندوستان سے وادی کشمیر تک جانے والا وہ راستہ جو درہ باہنہال سے ہو کر گزر رہا ہے اس وقت موسم سرما میں بند ہو جاتا تھا لیکن وادی کشمیر سے راولپنڈی تک جانے والا راستہ ہر موسم میں کھلا رہتا تھا، اسی لئے تقسیم کے بعد ریاست سے متعلق رسل و رسائل، نقل و حمل اور ضروریات زندگی کی بہم رسانی کی تمام ذمہ داری پاکستان پر عائد ہو گئی تھی چنانچہ جب مہاراجہ نے پاکستان کے ساتھ اسٹینڈرٹس اگرمینٹ کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو پاکستان کے ارباب حل و عقد کو مذکورہ بالا واقعات کی بہت پر اس امر کا حل یقین تھا کہ انجام کار مہاراجہ کو پاکستان

کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کرنا پڑے گا۔

اپنے اس مفروضہ کے باوجود پاکستان کے ارباب حکومت ریاست کے حکمران اور عوام کو الحاق کے سوال پر سکون اور اطمینان کے ساتھ غور کرنے کا موقع نہیں دینا چاہتے تھے۔ اس لئے اسٹینڈ اسٹل اگر نیٹ کے ایسا محفل نے ریاست کی اقتصادی ناکہ بندی کر کے اسے الحاق پر مجبور کر دینے کی ہر ممکن کوشش کی تھی اور عوام کی ضرورتوں میں کام آنے والی بنیادی اشیاء مثلاً علم، نمک، شکر اور پٹرول وغیرہ کی فراہمی سے انکار کر کے حصول مقصد کے لئے ریاست کے باشندوں پر زیادہ سے زیادہ دباؤ ڈالا تھا۔

اسٹینڈ اسٹل اگر نیٹ کے باوجود پاکستان نے ریاست پر جو اقتصادی دباؤ ڈالا تھا اس کے بنیادی مقصد کو لارڈ برٹوڈ نے بھی ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:-

جہاں تک اس وقت کی حکومت پاکستان کا تعلق ہے، شہزادوں سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اقتصادی دباؤ ڈال کر ہزاروں کو الحاق پر مجبور کر دینا چاہتی تھی لیکن اس کی اس حکمت عملی سے خود اسی کے مفادات کو نقصان پہنچنا پڑا ہے۔ ہند اور پاکستان میں اس وقت انتشار اور بد منظمی کا جو عالم موجود تھا اس کی بدولت کشمیر کے شہتیر کی تجارت مردہ ہو چکی تھی اس پر مستزاد یہ کہ پاکستان نے کشمیری مصنوعات کی فروخت پر پابندی عائد کر دی تھی اور ان امور کی بدولت ریاست تقریباً دیوالیہ ہو گئی تھی۔

-
1. The Struggle for Kashmir
Pp. 23-24
 2. Kashmir-1947-56 P. 5
 3. Two Nations & Kashmir Pp. 46, 50

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ اگرچہ الحاق کے فیصلہ کو ملتوی کرنے کے معاملہ میں ہمارا جہ اور حامی رہنماؤں کا زاویہ نظر مختلف تھا لیکن وہ دونوں الحاق کے فیصلہ کے التوا پور پوری طرح متفق المرائے تھے اور ہمارا جہ نے پاکستان کے ساتھ جو اسٹیٹ اسٹل اگر مینٹ کیا تھا وہ بھی ان کی اسی خواہش اور کوشش کا مظہر تھا۔ چنانچہ اقتصادی دباؤ کے باوجود جب پاکستان ہمارا جہ سے الحاق کا فیصلہ کراتے ہیں کامیاب نہیں ہو سکا تو اس کے ارباب حکومت نے مسلح پاکستانیوں کو ریاست میں بھیجا اور اپنے ہمسوا ریاستی عناصر کو فتنہ و فساد برپا کرنے پر آمادہ کرنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ ان ہی عناصر کی بدولت پونچھ میں باقاعدہ بغاوت بھی برپا ہوئی۔ اس بغاوت کے متعلق لارڈ برٹوڈ نے لکھا ہے کہ :

” اکتوبر کے وسط تک، پونچھ کی بغاوت کو، قدرتی طور پر اس کے ان غیر سرکاری پاکستانیوں کی امداد ملنے لگی تھی جو بغاوت کے حامی تھے اور جنہیں سر دریاے جہلم نے پونچھ سے علیحدہ کر رکھا تھا اور یقینی بات یہ ہے کہ وہ دریاے جہلم کی راہ سے باغیوں کے لئے برابر اسلحہ بھیج رہے تھے۔“

اس صورت حال کے پیش نظر ۱۵- اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ہمارا جہ نے بذریعہ تارکراچی کو اپنی اس تجویز سے مطلع کیا تھا کہ حالات کی غیر جانبدارانہ تحقیقات کرائی جائے اور اس کے ساتھ ہی اس تار میں یہ بھی لکھا تھا کہ :

” اگر بد قسمتی سے اس تجویز پر کوئی توجہ بندول نہ کی گئی تو میری حکومت اپنی مرضی کے خلاف اس بات پر مجبور ہو جائے گی کہ وہ ریاست کی سرحدوں پر پاکستانیوں کے چار حانہ اور غیر دستارہ اقدامات کو روکنے کے لئے امداد کی درخواست کرے۔“

پھر ۱۸- انگریز کو بھی ہمارا جہ کی جانب سے ایک ایسا ہی نار روانہ کیا گیا تھا جس کے جواب میں پاکستان کے گورنر جنرل نے لکھا تھا کہ:-

”بیرونی امداد حاصل کرنے کی دھکی آپ کی حکومت کی اس حکمت عملی کو واضح کرتی

ہے کہ وہ ہندوستان کے ساتھ شمولیت کے لئے بہانہ تلاش کرنا چاہتی ہے

اور ہندوستان کی امداد اور مدافعت سے حالات کو بدل دینا چاہتی ہے۔“

لیکن اس صورت میں کہ سر جٹراج اٹھاق کے فیصلہ کے متعلق ہندوستانی ریاستوں کے حکمرانوں کی رائے کو قلعی اور خسر می سمجھنے کے اصول کو تسلیم کر چکے تھے انہیں ہمارا جہ اور ان کی حکومت کے خلاف اس بنا پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے تھا کہ وہ ریاست کو ہندوستان کے ساتھ ملحق کرنے کا فیصلہ کرنا چاہتے ہیں۔

بہر حال حبیہ طریقہ کار بھی ریاست کو پاکستان کے ساتھ ملحق کرانے میں کامیاب ثابت نہ ہو سکا تو پھر ریاست پر وہ جارحانہ حملہ کیا گیا جسے قبائلیوں کے حملہ سے موسوم کیا جاتا ہے اور اس طرح ریاست پر یہ جبر قیضہ کر لینے کی کوشش کی گئی اور اس طرح مائیکل بریجسپر کی اس رائے سے اختلاف کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ:-

”اگرچہ مسلم لیگ نے دو ریاستوں کے مستقبل کے متعلق حکمرانوں کی کامل آزادی

کے اصول کو تسلیم کر لیا تھا لیکن وہ کشمیر کے سوال کی بازی کو اس درجہ اہم

سمجھتی تھی کہ وہ ان ہمارا جہ کو ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کی آزادی

نہیں دینا چاہتی تھی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ

پاکستان نے بھی یہ اٹل فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ جس قیمت پر بھی ہو مکے کا کشمیر کو

حاصل کر کے رہے گا۔"

اور پاکستان کا یہی وہ فیصلہ ہے جس نے کشمیر کے سادہ سے معاملہ کو ایک تنازعہ بنا رکھا ہے۔ ریاست جموں اور کشمیر کے سلسلہ میں پاکستان کی وارانہ دستہوں اور جارحانہ کارروائیوں کی داستان اس جگہ ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس کا تاریک ترین باب ۲۶ - اکتوبر ۱۹۴۷ء کو اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب ہندوستان نے ہمارا جو کی درخواست اور کشمیر کے عوامی رہنماؤں کی تائید و حمایت کی بنا پر اس ریاست کا الحاق منظور کیا تھا اور جس کے بعد قسطنطنیہ ہند کے فیصلہ نین بین اقوامی دستور کے مطابق پاکستان کو کشمیر سے اپنے مسلح شہریوں اور قبائلی حملہ آوروں کو واپس بلالینا چاہیئے تھا لیکن جیسا کہ گذشتہ باب میں بتایا جا چکا ہے مسٹر جناح نے الحاق کی اطلاع پانے کے بعد ریاست جموں اور کشمیر پر یہ جبر قبضہ کر لینے کا فیصلہ کیا تھا اور اگر اس وقت پاکستان کی باقاعدہ افواج میں اس ریاست پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لینے یا پھر اپنے اس اقدام کے نتائج کا مقابلہ کر لینے کی صلاحیت موجود ہوتی تو یقینی کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ کسی حالت میں بھی اپنے فیصلہ کو تبدیل کرنے پر آمادہ نہ ہوتے۔ لیکن کشمیر میں باقاعدہ پاکستانی افواج کے داخلہ کے حکم کی تیئخ کے باوجود، ریاست پر قبضہ کر لینے کے سلسلے میں پاکستان کی جدوجہد میں کوئی فرق نہیں آیا تھا اور ۲۷ - اکتوبر ۱۹۴۷ء کو کشمیر میں ہندوستانی افواج کے پہنچنے کے بعد پاکستان اپنے مقصد کے حصول کی جو کوششیں کرتا رہا تھا اس کا اندازہ ہندوستان کے وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے اس بیان سے بخوبی کیا جاسکتا ہے جو موصوف نے ۲۷ جنوری ۱۹۴۷ء کو نئی دہلی میں اخباری نمائندوں کے ایک اجتماع میں دیا تھا۔ اور اس بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ:

”ہماری افواج نے ۲۴۔ اکتوبر کو کشمیر میں پہونچ کر وادی اور شہر سری نگر کو بچا لیا تھا اور وادی جہلم کے راستہ پر دشمن کو اوڑی تک پسپا کر دیا تھا۔ اس وقت سے ریاست کشمیر اور پاکستان کی تقریباً تمام سرحد تک لڑائی ہوتی رہی ہے۔ جدید اسلحہ سے مسلح لوگ، بڑے بڑے جنگی گروہوں کی شکل میں بہت سے مقامات پر ریاست میں آتے رہے ہیں اور ان سے کہیں زیادہ تعداد میں لوگ سرحد کے ساتھ ساتھ پاکستان کے اندر جمع ہوتے رہے ہیں۔ ان حملہ آوروں کے لئے پاکستان کے یہ سرحدی علاقے جارحانہ اقدامات کے مستقر بنے ہوئے ہیں اور ان ہی مستقروں کی حفاظت میں یہ لوگ بہت بڑی تعداد میں سرحد کے پار، ریاست کشمیر کے علاقہ میں آکر جو ہندوستان کا علاقہ ہے اچھا پہنچتے، آگ لگاتے اور لوٹ مار کرتے ہیں۔

اگر ہندوستان کی حکومت اپنی علاقہ کے پیش نظر ان مستقروں پر حملہ کر کے ان حملہ آوروں کے مرکزوں کو ختم کر دیتی تو وہ حق بجانب ہوتی لیکن وہ ایسا کرنے سے صرف اس لئے گریزاں رہی کہ اول تو وہ لڑائی کے دائرے کو محدود رکھنا چاہتی تھی اور دوسرے اسے امید تھی کہ پاکستان کی حکومت حملہ آوروں کو امداد اور شہ دینا بند کر دے گی۔

پچھلے دو مہینوں میں پاکستان کی حکومت سے متواتر درخواستیں کی جاتی رہی ہیں کہ وہ ہندوستان پر حملہ کرنے کے سلسلے میں اپنے علاقے کے استعمال کو روک دے لیکن یہ نہیں کہ اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ یہ بھی ایک حقیقت مذکور ہے کہ ان حملہ آوروں کو چین کی بہت بڑی تعداد پاکستانیوں پر مشتمل ہے حکومت پاکستان کی طرف سے ہر طرح امداد ملتی رہی ہے۔

انہیں موٹر گاڑیوں اور ریل گاڑیوں میں سوار ہو کر پاکستانی علاقہ سے گزرنے کی اجازت دینی جاتی رہی ہے اور انہیں پٹرول، خوراک اور رہائش گاہیں مہیا کی جاتی رہی ہیں۔ ان کے پاس جو اسلحہ ہیں وہ پاکستانی فوج کے اسلحہ ہیں اور کشمیر کی لٹرائی کے دوران میں ہمارے سپاہیوں نے پاکستانی فوجیوں کو بھی گرفتار کیا ہے۔۔۔۔ پاکستان نے اس حملہ کو روکنے کے لئے نہ صرف کوئی موٹر قدم ہی نہیں اٹھایا بلکہ اس نے ان حملہ آوروں کو ان کے اس جارحانہ اقدام سے باز رہنے کی دعوت دینے سے بھی انکار کر دیا۔

حکومت ہند اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتی کہ ایک دوست اور ہمسایہ ملک کے علاقہ کو ہندوستان پر جارحانہ حملہ کئے لئے استعمال کیا جائے لیکن اس وقت تک کوئی کارروائی کرنے سے بچنے کے لئے جب تک حالات اسے مجبور ہی نہ کر دیں اس نے اس معاملہ کو مجلس تحفظ میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

۲۲۔ دسمبر ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے وزیر اعظم سے باقاعدہ تقابلیری درخواست کی گئی تھی۔ اس مراسلہ میں پاکستان کے جارحانہ اقدامات اور پاکستان کی طرف سے حملہ آوروں کو دی جانے والی امداد کی صورتوں کو اختصار کے ساتھ بیان کرنے کے بعد حکومت پاکستان سے کہا گیا تھا کہ وہ پاکستانی شہریوں کو جتوں اور کشمیر چرسلہ میں شریک ہونے سے روک دے اور حملہ آوروں کو پاکستانی علاقہ میں آنے اور اس علاقہ کو ریاست جتوں اور کشمیر پر حملہ کے لئے استعمال کرنے کی اجازت نہ دے (۲) انہیں فوجی اور دوسرے قسم کے سامان کی ہم رسانی بند کر دے اور (۳) انہیں ایسی کوئی امداد نہ دے جس سے موجودہ کشمکش کے طویل ہونے میں مدد مل سکتی ہو۔

حکومت ہند نے ایک مرتبہ پھر پاکستان کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھنے کے سلسلے میں اپنی غلط فہمی خوار کیا تھا اور اسے تو حق تھی کہ اس کی درخواست پر فوری اور غیر مشروط توجہ مبذول کی جائے گی..... اس باقاعدہ درخواست کا کوئی جواب موصول نہیں ہوا تھا اور دو مرتبہ یاد دہانی بھی کرائی گئی تھی۔

اس زمانہ میں پاکستان کا جو منظر یہ اور طریقہ کار رہا تھا اس کے متعلق لارڈ برٹوڈ نے لکھا ہے کہ۔

”یوں شکوکہ میں جب پاکستان کے چیت آٹ اسٹان جہلی سیر خانہ اقدیم تھوہ کے کیش سے بات چیت کرنے کے لئے دہلی آئے اور اپنے پڑا تے دوست جہول کونستہ شکہ سے ملے تو دوران گفتگو میں شیرخان نے بتایا کہ ہمارا مقصد یہ تھا کہ پہلے تو ہندوستانی افواج کو منتشر کر دیا جائے اور اس کے بعد اقوام متحدہ کی مؤثر مداخلت کا انتظار کیا جائے۔“

اور اس حکمت عملی کے سلسلہ میں اپنی اس رائے کا اظہار بھی کیا ہے کہ

”میر شکوہ دھاک پاکستان، ہندوستان سے فیملہ کن مقابلہ کی جس حکمت عملی پر کاربند رہا تھا وہ سیاسی اعتبار سے نہیں بلکہ فوجی لحاظ سے بھی اس کے لئے بُری تھی۔“

غرضیکہ ان اقتباسات سے جہاں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ پاکستان اب تادم سے کشمیر

1. Kashmin 1947-56 Pp. 8, 9

2. [Two Nations & Kaahmir P. 78

پر قبضہ کر لینے کا خواہش مند تھا اور اس کے اربابِ حل و عقد نے الحاق کے بعد بھی اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے کی کوششوں میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی وہاں یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ حکومت ہند یہ جانتے ہوئے بھی کہ پاکستان، ہندوستان کے خلاف جارحانہ طے میں مصروف ہے اس تنازعہ کو پرامن طریقے پر حل کرنا چاہتی تھی اور اسی لئے وہ ہندوستان کی سرحد کے پار کسی قسم کی فوجی کارروائی کرنے سے گریز کرتی رہی تھی۔

یہ بات بتائی جا چکی ہے کہ ریاست جموں اور کشمیر پر قبائلیوں نے جو جارحانہ حملہ کیا تھا وہ صرف پاکستان کی رضا مندی ہی سے نہیں کیا گیا تھا بلکہ اس میں پاکستان انھیں ہر قسم کی امداد بھی دیتا رہا تھا حتیٰ کہ نوڈ پاکستانی ہنٹری بھی حملہ آوروں میں شامل تھے لیکن یہاں معاملہ کے اس پہلو پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

حکومت ہند کی جانب سے، ریاست جموں اور کشمیر پر حملہ کرنے والے قبائلیوں کو امداد دینے کے سلسلے میں پاکستان پر جو اعتراضات کئے گئے تھے اُن کا جواب دیتے ہوئے پاکستان کے وزیر اعظم نے لکھا تھا کہ :-

”جہاں تک حکومت پاکستان پر حملہ آوروں کو امداد دینے کے الزامات کا تعلق ہے ہم پوری قوت کے ساتھ ان کی تردید کرتے ہیں۔ اس کے برعکس حکومت پاکستان قبائلیوں کی نقل و حرکت کی بہت تشکیں کرنے کے لئے جنگ کے علاوہ اپنی قوت کے مطابق ہر ممکن کوشش کرتی رہی ہے۔“

حتیٰ کہ ریاست پر حملہ سے آٹھ ماہ بعد بھی جیہ کشمیر کا مسئلہ ادارہ اقوام متحدہ میں پیش تھا پاکستان کے وزیر خارجہ نے کہا تھا کہ :-

”ہم اس الزام کی پُر زور تردید کرتے ہیں کہ حکومت پاکستان ان نام نہا

حملہ آوروں کو امداد دے رہی ہے۔“

لیکن حقیقت اس بیان سے بالکل مختلف تھی چنانچہ ’نیوز کرائیکل‘ لندن کے نامہ نگار نے ۲۷- اکتوبر ۱۹۴۷ء کو لکھا تھا کہ،

”اس بات پر یقینی کرنے کے تمام ثبوت موجود ہیں کہ ان کی ہم (قبائلی حملہ)

کو قوی امداد حاصل تھی اور اسے فوجی صلاحیت کے ساتھ چلایا جا رہا ہے۔“

اور ان سطروں کی اشاعت سے چھ روز بعد اخبار ’آبزورڈ‘ لندن میں اسے مورہیل کی جوتسریر شاخ بھولی بھٹی اس میں بتایا گیا تھا کہ،

”ہر جگہ مجسرتی جاری ہے اور یہ بھرتی قبائلی علاقوں میں ہی نہیں بلکہ

پاکستان میں بھی کی جا رہی ہے۔“

پھر اسی قدر نہیں بلکہ اخبار ’نیو اسٹیمین اینڈ نییشن‘ لندن کے ایڈیٹر مکگل نے مارٹن نے کشمیر کا دعوہ کرنے کے بعد فروری ۱۹۴۸ء میں اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ،

”یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ پاکستان کی طرف سے قبائلی حملہ آوروں

کی بہت افزائی نہیں کی جا رہی ہے اور انہیں امداد نہیں دی جا رہی ہے۔“

قبائلی حملہ آوروں کے ساتھ پاکستان کے تعلق کے سلسلہ میں اگرچہ مذکورہ بالا

غیر ملکی اور غیر جانب دار مشاہدین کی عینی شہادتوں کو کافی سمجھنا چاہیے لیکن ان شہادتوں کی تصدیق کے لئے پاکستان کے بعض ارباب حکومت کے بیانات بھی موجود ہیں۔ مثلاً

سرحد کے اس وقت کے وزیراعظم خان عبدالغفور خان نے ۳۰-۱ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو کہا تھا کہ
 ”پٹان ہندوستان کو کشمیر پر حملہ کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔“

اور دوسرے ہی روز اسٹھ کے وزیر صحت نے

تمام تربیتی یافتہ سابق فوجی سپاہیوں سے بطور رضا کار محاذ کشمیر
 پر جانے کی اپیل کی تھی۔

حتیٰ کہ پاکستان کے وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خان ۱۱-جنوری ۱۹۴۷ء کو راسٹر کے ایک
 نمائندہ کو بتایا تھا کہ:-

”در پاکستان کے لئے اس امر کی ضمانت دینا ناممکن ہے کہ کوئی پاکستانی
 یا پاکستان سے گزرنے والے دوسرے لوگ آزادی کی جدوجہد میں حصہ
 لینے کے لئے کشمیر نہیں جائیں گے۔“

ان تمام مشاہدات اور بیانات کے باوجود ۱۹۴۷ء کے اواخر تک پاکستان کشمیر پر قبضہ کرنے
 کے حملہ کے ساتھ اپنے تعلق کو چھپانے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہا لیکن ۲۲-نومبر ۱۹۴۷ء کو جب
 اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہند اور پاکستان کی پہلی عبوری رپورٹ شائع ہوئی تو ان حقائق کی
 تفصیلی بھی ہو گئی جو اس حملہ کے پہلے ۴ دن سے ہندوستان کے علم میں تھے اور جن پر وہ
 پاکستان کو بار بار توجہ دلاتا رہا تھا۔ اقوام متحدہ کے اس کمیشن نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا:
 ”کمیشن کی ایک بے مضابطہ نشست میں جو یکم اگست ۱۹۴۷ء کو منعقد ہوئی

بھی شمال مغربی سرحدی صوبہ کے گورنر سر نے ڈنڈا اس نے اپنے بیان میں

1- Pakistan Times 30-10-47

2- The Times of India 1-11-47

3- The Hindustan Times 13-1-48

کہا تھا کہ دراصل پاکستانی علاقہ میں جنگ چھڑ جانے کے خطرے سے بچنے کے لئے میرے صوبہ سے گزر کر قبائلیوں کو کشمیر جانے کا موقعہ دیا گیا تھا۔۔۔ قبائلیوں نے پاکستان میں مقامی ذرائع سے پیڑوں حاصل کیا تھا اور انھوں نے ریلوں اور مقامی موٹر ٹرانسپورٹ کو بھی استعمال کیا تھا۔۔۔۔۔ مسٹر محمد علی نے جو اس وقت پاکستان کے وزیر باہیات تھے اور بعد میں وزیر اعظم بھی رہ چکے ہیں، کہا تھا کہ اگر پیڑوں ہٹیا کر لے سے انکار کر دیا جاتا تو پاکستان کی اقتصادی ناکر بندی کر لی جاتی اور اس کے نتائج پاکستان کی حکومت کے حق میں نہایت ہی خطرناک برآمد ہوتے۔۔۔۔۔ سر فخر اللہ نے اس بات کی تصدیق کی تھی کہ قبائلیوں نے مقامی ذرائع سے پیڑوں حاصل کیا تھا۔“

لیکن اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندو پاکستان کی پہلی عمومی رپورٹ سے جو تذکرہ بالا اقتباسات پیش کئے گئے ہیں ان کے مطالعہ کے بعد بھی بغیر محاط حقائق پر کہہ سکتے ہیں کہ ان سے جزوی طور پر قبائلیوں کے ساتھ بغیر پاکستانیوں اور پاکستانی حکام کے تعلق پر تو ضرور روشنی پڑتی ہے لیکن ان کے ساتھ حکومت پاکستان کا براہ راست تعلق ثابت نہیں ہوتا۔ لیکن صوبہ سرحد کے وزیر اعظم خان عبدالقیوم خان نے ۷ مارچ ۱۹۴۷ء کو صوبہ کی مجلس قانون ساز میں قبائلیوں کے لئے خصوصی مالی امداد کا مطالبہ پیش کرتے ہوئے جو تقریر کی تھی اس میں کہا تھا کہ:

”ایوان اس واقعہ کو قریب کے ساتھ یاد کرے گا کہ ہمارے خطرناک ترین لمحات میں مسعودیوں نے ریاست جموں اور کشمیر کے مجبور مسلمانوں کی نجات کے لئے وہاں جا کر ہمارے آواز پر لبیک کہا تھا۔“

- | | | |
|----|--------------------------------------|-----------|
| 1 | The Struggle for Kashmir | Pp. 31-32 |
| 2. | The Making of Pakistan by R. Symonds | P. 122 |

اور اس اعتراف کے بعد اس بات کو ثابت کرتے کہ نئے ممبر ریاست جموں اور کشمیر پر قبائلیوں کا حملہ حکومت پاکستان ہی کے منصوبہ اور دعوت پر مبنی تھا مزید دلائل پیش کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور اس طرح کشمیر کے تنازعہ کی حقیقت صحت یہ رہ جاتی ہے کہ پاکستان ابتداء ہی سے اس ریاست پر قبضہ کر لینے کا خواہش مند تھا۔ وہ تقسیم ہند کے بعد ہی سے اس ریاست کے الحاق کے لئے مختلف وسائل اختیار کرتا رہا تھا۔ اس نے اسٹیٹ اسٹیل اگرینٹ کے باوجود ریاست کی اقتصادی تباہی نہ کرنے سے بھی گریز نہیں کیا تھا۔ ریاستی مصنوعات کی درآمد اور فروخت پر پابندیاں عائد کر کے مالی اعتبار سے ریاست کو کھوکھلا بھی بنا دیا تھا، ریاست میں مسلح پاکستانیوں کو بھیج کر فتنہ و فساد بھی برپا کرائے تھے اور ریاست میں بغاوت بھی برپا کرادی تھی لیکن جب وہ ان عام طریقوں کے استعمال کے باوجود اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا تو اس نے قبائلیوں کو حملہ کی ترغیب دی اور اس حملہ میں انھیں ہر قسم کی امداد دینا رہا۔ حتیٰ کہ جب ہندوستان کے ساتھ اس کا الحاق ہو گیا تو اس نے اپنی باقاعدہ افواج بھی بھیج دیں اور آج بھی وہ ہندوستان کے اس حصہ سے دست کش ہونے کے لئے تیار نہیں ہے جو اس وقت قبائلیوں کے توسط سے اس کے قبضہ میں چلا گیا تھا۔

چٹا باب

تصویر کے دورِخ

گوشہ صفحات کے مطالعہ کے بعد یہ حقیقت پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ " انڈین انڈپنڈنس ایکٹ " میں دیسی ریاستوں کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لئے ان کے حکمرانوں کو جو حق دیا گیا تھا، مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے مسٹر جناح نے اسے غیر مشروط طور پر تسلیم کیا تھا۔ لیکن چونکہ انہیں اپنی ریاستوں سے عوام کی بالادستی کی علامت رہی تھی اس لئے دیسی حکمرانوں کی بالادستی کے اصول کو نال کے ساتھ منظور کیا تھا اور یہ بات بھی ثابت ہو چکی ہے کہ جہاں تک ریاست جموں اور کشمیر کا تعلق ہے پاکستان جس کی عنوان حکومت مسلم لیگ کے ماتحتوں میں آئی تھی مسٹر جناح کے منظور کردہ اصول پر قائم نہیں رہا تھا۔ اس کی طرف سے ہر طرح 'ہسا راجہ کو اس بات پر مجبور کیا جاتا رہا تھا کہ وہ اپنی ریاست کو پاکستان کے ساتھ ملحق کر دیں۔ حتیٰ کہ شیخ محمد عبداللہ نے ۷-۱۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو دہلی میں ایک بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ :

'کشمیر پر جان بوجھ کر مقصد وہاں کے عوام کو خرفہ وہ کہے ان سے ایک

مخصوص فیصلہ کرانا یعنی پاکستان کے ساتھ الحاق پر مجبور کرنا

ہے۔ لیکن ہر کشمیری اپنی رائے پر اس دباؤ سے نفرت کرتا

ہے۔

پھر اسی قدر نہیں بلکہ ہندوستان کے ساتھ ریاست کے الحاق کے بعد بھی پاکستان اور سڑجنار نے اسے جائز اور قانونی الحاق تسلیم نہیں کیا اور پاکستان آج بھی اسے جائز اور قانونی الحاق تسلیم نہیں کرتا۔ حالانکہ

”الحاق قانونی طور پر ہمارا جہ نے کیا تھا اور انھوں نے یہ قدم ریاست کی مقبول اور با اثر ترین سیاسی جماعت آل جموں اور کشمیر نیشنل کانفرنس کے رہنما شیخ عبداللہ کے مشورہ پر اٹھایا تھا۔“

اس کے برعکس لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے پریس اتانٹی سٹرکچرپیل جانسی کی شہادت کے مطابق ریاستوں کے الحاق یا عدم الحاق کے فیصلہ کے سلسلہ میں دیسی حکمرانوں کی بالادستی کے اصول کو بدلنا خواستہ تسلیم کر لینے کے بعد کانگریس نے اس معاملہ میں ہمارا جہ کی رائے کو متاثر کرنے کی ذرہ بیاہر بھی کوشش نہیں کی تھی لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ الحاق کے بعد ریاست جموں اور کشمیر کو ہندوستان کے ایک جزو لاینفک کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی اس لئے ہندوستان الحاق کے بعد سے اس وقت تک اپنے اس علاقہ کی آزادی اور اپنی علاقائی سالمیت کو بہ قرا رکھنے اور بحال کرانے کے لئے جو کچھ کرتا رہا ہے وہ سب کچھ اس کا فرض تھا اور اس کے عوامل اور حرکات کو سمجھ لینا کوئی مشکل کام نہیں ہے لیکن جہاں تک اس معاملے سے پاکستان کا تعلق ہے یہ بات آج تک بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ اس کے ارباب اختیار نے کشمیر میں اپنے تسلیم کردہ اصول سے کیوں انحراف کیا تھا، انھوں نے ہمارا جہ کے فیصلہ الحاق کو بچے کشمیری عوام کی تائید اور حمایت بھی حاصل تھی کس نے تسلیم نہیں کیا اور وہ آج بھی ہندوستان کے اس علاقہ سے دست بردار ہونے کے لئے کیوں تیار نہیں ہے؟

1. The Times of India 28-10-47
2. Govt. of India White Paper on J. & K. P. 3

کسی دوسری بگڑاؤ پر ڈوڈ کے حوالہ سے یہ بات بتائی جا چکی ہے کہ سر جینار
ابتداء ہی سے ریاست جموں اور کشمیر کو پاکستان کا جزو لاینفک سمجھتے رہے تھے اور اس نے
۲۷۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء کی شام کو کشمیر پر فوجی کشی کا حکم دینے کے بعد جب دوسرے دن
فیلڈ مارشل سر کلود آگن لک اور جنرل گرہی کے مشورہ پر انھیں اپنا یہ حکم منسوخ کرنا پڑا تھا
تو یہ امر ان پر بے حد شاق گذر رہا تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اسباب کیا تھے جن کی بنا
پر سر جینار نے کشمیر کو پاکستان کا ایک حصہ فرض کر لیا تھا؟ اور اگرچہ آج تک بھی اس
سوال کا کوئی جامع، مدلل اور معقول جواب نہیں مل سکا لیکن قبائلی حملہ کے دوران میں
۴۔ نومبر ۱۹۴۷ء کی اس نشری تقریر میں جو پاکستان کے پہلے وزیر اعظم سر لیٹ علی خاں
مروم نے کی تھی، نیز مجلس تحفظ کی رپورٹوں اور پاکستان کی سرکاری اور غیر سرکاری مطبوعات
سے اس سوال کا جو جواب ملتے ہیں کیا جا سکتا ہے خود ہندوستان کے مقدمہ اور مؤقت کو
سمجھنے کے لئے اسے بھی مد نظر رکھنا چاہیئے۔

سر لیٹ علی خاں نے ریاست جموں اور کشمیر پر قبائلیوں کے حملہ کو حق بجانب قرار
دیتے ہوئے اپنی اس تقریر میں یہ اعلان کرنے کے بعد کہ — ہم اس افاق کو تسلیم نہیں
کرتے کہا تھا کہ

”ہندوستان کے ساتھ کشمیر کا افاق، پاکستان کے تحفظ کے لئے ایک

بہت بڑا خطرہ ہے۔“

سر اسے، ڈی مہانی نے ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں کی ایک طرف تفصیلاً بیان کرنے کے
بعد مسلمانوں کے تحفظ کے زاویہ نظر سے لکھا ہے کہ :

”اس لئے کشمیر، ہند اور پاکستان کے مسئلہ کا ایک بہت ہی اہم پہلو

ہے۔ پہلے ہی سے ضعیف پاکستان کو کثیر سے محروم کر دیے کی کوششوں کو کسی طرح بھی جائز نہیں قرار دیا جاسکتا۔ مزید یہ کہ نعتنہ پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کثیر پاکستان کی پوری تعمیر میں منڈیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر پاکستان اس بنا پر اس کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کے باشندوں کی بہت بڑی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے جن کے لئے جیسا کہ مذکورہ بالا تفصیلات سے ظاہر ہے ہندوستان میں کوئی جگہ نہیں۔ ان مسلمانوں کو پاکستان ہی میں مانا پڑے گا۔

کراچی یونیورسٹی کے شعبہ جغرافیہ کے مسد مٹ مانگ بی پیٹیا والانے، کثیر کے ارضی و جغرافیائی احوال کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہوئے کثیر کے ساتھ پاکستان کے قدرتی تسلسل کو ثابت کرنے کے لئے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ :

”پہلی بات تو یہ ہے کہ مغربی پاکستان اور کشمیر کے درمیان جو سرحد واقع ہے وہ کافی طویل اور تقریباً ۵۸۰ میل ہے اور اس کی مسلسل حفاظت اور نگہداشت درکار ہے۔ بیشتر مغربی پاکستان دریائے سندھ کی وادی پر مشتمل ہے اور کثیر دراصل اس طبعی علاقہ کا بالائی حصہ ہے اور یہی دریا ان دونوں مسلسل علاقوں کے لئے رابطہ کی بڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔ پنجاب کے ان دریاؤں کے منبے بھی کثیر ہی میں ہیں جو پاکستان کے دریا ہو گئے ہیں۔ ان دریاؤں کے لئے کثیر کے برف پوش پہاڑ ذخائر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پاکستان اپنی شادابی کے لئے ان ہی سے آب پاشی کا پانی حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن اگر منبے پر کوئی اُفتاد پڑ جائے تو نشیبی وادیوں کو نقصان پہنچنا ضروری ہے

یہی دریا کثیر کے پہاڑوں سے زرخیز مٹی بہا کر پنجاب اور سندھ کے زیریں حصوں میں بھی لاتے ہیں۔"

مذکورہ بالا اقتباسات کے مطالعہ کے بعد جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان اپنی فوجی اور اقتصادی ضرورتوں کی بنا ہی پر کثیر کو اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتا بلکہ وہ مغربی پاکستان اور کثیر کے جغرافیائی تعلق، طبعی ارتباط اور مغربی پاکستان کے باشندوں کے ساتھ باشندگان کثیر کی اکثریت کی مذہبی ہم آہنگی کی بنیاد پر بھی اپنے ساتھ اس ریاست کے الحاق کو اپنا حق سمجھتا ہے۔ چنانچہ پاکستان کے سابق وزیر خارجہ سر فخر الدین نے ۸۔ فروری ۱۹۵۷ء کو مجلس تحفظ کے روبرو اپنے ملک کا مقدمہ پیش کرتے ہوئے بھی ان ہی نکات پر زور دیا تھا۔ اور مسٹریاقت علی خاں مرحوم نے بھی ۱۹۵۷ء میں مسٹر ڈیوڈ بیسن تھل کو ایک بیان دیتے ہوئے پاکستان کے زاویہ نظر سے کثیر کی اہمیت پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی تھی کہ:-

"پاکستان کے لئے کثیر بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے لیکن ہندوستان کے لئے اس کی جو حیثیت ہے آپ اسے قیث سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ کثیر کو ہماری یقیناً زندگی کی ضرورت کی حیثیت حاصل ہے۔ نقشہ پر ایک نظر ڈالئے تو معلوم ہو جائے گا کہ کثیر پاکستان کے سر پر کلاہ کا درجہ رکھتا ہے اور اگر میں ہندوستان کو یہ کلاہ اتار لینے کی اجازت دے دوں تو میں ہمیشہ ہندوستان کا محتاج اور زیر دست رہوں گا اور کروڑوں انسانوں کی قربانی ادا کرتا ہو جائوں گی۔"

1. An Introduction to Kashmir— its Geology and Geography p. 51-53
2. Another Korea' in the making "-Colliers, New York Aug. 4. 1951

اور مذکورہ بالا تمام سرکاری اور غیر سرکاری تحریروں اور تقریروں کی روشنی میں کشمیر سے متعلق پاکستان کے دعویٰ کو سمجھنے کے بعد ہمیں ہندوستان کے مقدمہ اور موافقت کو بھی سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

ہندوستان کی حکومت نے ریاست جموں اور کشمیر کے حکمران ہماراجہ ہری سنگھ اور نیشنل کانفرنس کے رہنما شیخ محمد عبداللہ کی درخواست پر ہندوستان کے ساتھ اس ریاست کے الحاق کو منظور کیا تھا لیکن اس الحاق کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی واضح کر دی تھی کہ:-

”ہندوستان کی اس حکمت عملی کے پیش نظر کہ جس ریاست میں الحاق کے سوال پر اختلاف ہوگا وہاں اس سوال کا فیصلہ رائے عامہ کے ذریعہ سے کرایا جائے گا۔ اس لئے جس وقت بھی کشمیر میں امن قائم اور قانون بولا ہو جائے گا اور ریاست کی سرزمین مسلمہ آدروں سے پاک ہو جائے گی الحاق کے سوال پر عوام کی رائے لی جائے گی۔“

اور جیسا کہ لارڈ برڈوڈ نے یہ کہہ کر کہ

میں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ہندوستان نے کشمیر میں فوج بھیجنے اور اسے ملحق کرنے کے لئے پہلے سے کوئی منصوبہ نہیں بنارکھا تھا۔“

اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ہندوستان ہماراجہ اور کشمیر کے عوامی رہنماؤں کی درخواست سے پہلے کشمیر میں اپنی فوجیں بھیجنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا اس لئے یہ بات ثابت کرنے کے لئے کسی مزید دلیل کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ الحاق سے پہلے ہندوستان اپنی

1. Letter from Lord Mountbatten

Hari Singh dated 27th October, 1947

2. Two Nations & Kashmir P. 59

ایک، سرحدی ریاست کے حالات کو نشوونما کی نظر سے دیکھنے کے باوجود ان کی اصلاح یا
انسداد کے لئے کوئی قدم اٹھانے پر تیار نہیں تھا لیکن جب اس نے ہمارا جو اور کشمیر کے
عوامی رہنماؤں کی اس درخواست کو منظور کر لیا جو ہمارا جو کے قانونی حق پر مبنی تھی تو پھر
ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے الفاظ میں

”ہندوستان کے لئے اُن لوگوں کے ساتھ جنہوں نے اس پر عبور
کیا تھا غدا کی کرنا ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔“

اور یہاں اس امر پر زور دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ کشمیر کے معاملے میں ہندوستان
کا مضبوط ترین موقف اخلاقی ہے اور حکومت ہند اپنی اس اخلاقی ذمہ داری کو محسوس
کرتی ہے کہ کشمیر کے باشندوں کو ایک بار اس بات کا یقینی دلانے کے بعد کہ ہندوستان
ان کے وطن کی آزادی اور خود ان کے جمہوری نظریات کا تحفظ کرے گا اسے کسی حالی میں
بھی اپنی اس یقینی دہانی سے انحراف نہیں کرنا چاہیے۔

یہ امر کسی وضاحت کا محتاج نہیں کہ پاکستان کی طرف سے مذہب کی بنا پر کشمیر
کے الحاق کا مطالبہ سڑ بھارج کے ”دوقوی نظریہ“ پر مبنی ہے۔ لیکن یہ بات بھی واضح
ہے کہ ہندوستان کی تقسیم کے باوجود کانگریس کے رہنماؤں اور حکومت ہند نے تقسیم سے
پہلے اور تقسیم کے بعد کسی موقع پر بھی اس نظریہ کو تسلیم نہیں کیا۔ چنانچہ آج بھی ہندوستانی
یہ کم و بیشی پانچ سو کروڑ مسلمان آباد ہیں۔ ہندوستان کے آئین میں ہندوستان کے مسلمانوں
اور غیر مسلموں کو مساوی حقوق حاصل ہیں اور حکومت ہند کا کوئی ایسا حکم نہیں جس میں
مسلمان ہی اعلیٰ مناصب پر فائز نہ ہوں۔ ان حالات میں یہ بات ظاہر ہے کہ ہندوستان
کشمیر کے مسلمانوں پر پاکستان کے مقدمے اس حیرت و کوئی اہمیت نہیں دے سکتا۔ اس کے

برعکس ہندوستان میں 'انڈونیشیا اور پاکستان کے بعد سب سے زیادہ مسلمانوں کی موجودگی اس امر کا بڑی قوت ہے کہ انڈونیشیائی کانگریس نے ہندوستان کی تقسیم کو 'دوقومی نظریہ' کے ماتحت تسلیم نہیں کیا تھا۔ چنانچہ ہندوستان کے وزیراعظم نہت جواہر لال نہرو نے اس غلط فہمی کی تردید کرتے ہوئے جو ہندوستان کی تقسیم کے بنیادی اسباب کے متعلق متحدہ امریکہ میں پھیلی ہوئی تھی ۱۶ نومبر ۱۹۴۷ء کو لندن میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

"متحدہ امریکہ میں نہیں بلکہ دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی جو ایک غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان کی تقسیم کی بدولت ہندوستان کے ہندو اور مسلمان مذہب کی بنیاد پر ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہو گئے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں تقسیم کو 'پُرانی مسلم لیگ ریاستوں' کے 'دوقومی نظریہ' کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم نے کبھی اس نظریہ کو تسلیم نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اس کی تردید ہی کرتے رہے ہیں۔"

اور یکم مارچ ۱۹۵۱ء کو مجلس تحفظ میں ہندوستان کا مقدمہ پیش کرتے ہوئے مسٹر بی۔ این۔ رائے نے کہا تھا کہ

"کشمیر کا سوال جیسا کہ اسے ظاہر کیا جاتا ہے یا غلط طور پر ظاہر کیا جاتا ہے ہندو مسلم سوال نہیں ہے۔ چنانچہ پاکستان کی علیحدگی کے باوجود ہندوستان میں مختصراً چار کروڑ مسلمان آباد ہیں اور یہ آبادی (انڈونیشیا اور پاکستان کے بعد) سب سے زیادہ ہے۔"

1. Indigram (daily bulletin of
2. the Indian High Commission
- to U. K.) Nov, 17, 1949

پھر ۲۳ جولائی ۱۹۴۷ء کو سرحدی، کے کشنا مینن نے مجلس تحفظ ہندوستان کے نظریہ کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

”دوسری بات ایسی ہے جس کے سلسلہ میں میری حکومت اپنے موقف کو ہرگز تبدیل نہیں کرے گی۔ ہم اس چیز کو ہرگز قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں جسے ”دوقومی نظریہ“ کہا جاتا ہے۔ ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے اور وہاں کا ہر باشندہ خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، عیسائی ہو یا بودھ یا کوئی اور ہندوستان کا مساوی اقلیت بن گیا اور بٹی ہے..... ہندوستان اسلام کو بھی اپنا ایسا ہی مذہب سمجھتا ہے جیسا عیسائیت یا کسی اور مذہب کو، لہذا ہم اس منطق کو مسترد کرتے ہیں کہ اگر کسی خاص علاقہ میں کسی مذہب کے پیرو زیادہ تعداد میں ہوں تو اس علاقہ کا سوال سیاسی سوال بن جاتا ہے..... ہم اسلام کو غیر ملکی مذہب یا ثقافت (پکڑ) خیال نہیں کرتے۔ اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ ہندو ہوں یا مسلمان، عیسائی ہوں یا کچھ اور، ان سب کے بزرگ تقریباً ایک ہی تھے..... ہندوستان میں مسلمانوں کی اتنی بڑی آبادی ہے کہ انہیں اقلیت بھی نہیں کہا جاسکتا۔ وہ ہمارے ملک کے ہم مرتبہ شہری ہیں اور حکومت، سرکاری ملازمت، صنعت، زراعت اور دوسری تمام چیزوں میں مسلمانوں کو ایک مقام حاصل ہے۔“

اور ہندوستان کے اس موقف کی وضاحت کے بعد یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ دنیا کے تمام جمہوری اور سیکولر ملکوں کی طرح وہ بھی مذہب کی بنا پر ملکوں اور علاقوں

کی تقسیم کے منظر پر کو تسلیم نہیں کر سکتا۔

پھر پاکستان کے دعوے کی یہ دلیل تاریخی اعتبار سے بھی قطعا بے بنیاد ہے۔ مثال کے طور پر اس بات کو مد نظر رکھنا چاہیے کہ پہلی عالم گیر جنگ سے پہلے تقریباً پورا عالم اسلام سلطنت عثمانیہ میں شامل تھا لیکن مذہب کی اس ہم آہنگی اور سلطنت عثمانیہ کے ساتھ خلافتِ اسلامیہ کے عظیم منصب کی وابستگی کے باوجود پہلی عالم گیر جنگ کے دوران میں عرب محض اپنی قومی آزادی کے تصور کے ماتحت اس وقت کی اتحادی طاقتوں کے دوش بدوش ترکوں کے خلاف صف آرا ہو گئے تھے اور آج بھی ایشیا میں عوامی چین کی سرحد سے شروع ہو کر شمالی افریقہ کے انتہائی مغربی گوشہ تک مسلمانوں کی جو بہت سی چھوٹی بڑی ریاستیں پھیلی ہوئی ہیں وہ مذہبی مماثلت کی بنیاد پر متحد ہو جانے کا تصور تک بھی نہیں کر تیں۔ چنانچہ مصر اور سوڈان کے باشندے ہم مذہب ہونے کے باوجود آج دو جدا جدا اور خود مختار ریاستوں کے باشندے ہیں اور مصر و شام کے الحاق نے تو اس حقیقت کو بالکل ہی واضح کر دیا ہے کہ آج دنیا میں مذہب کی مماثلت کی بنیاد پر ملکوں کے باہمی الحاق اور قوموں کے باہمی اتحاد کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ چنانچہ متحدہ عرب جمہوریہ کے باشندوں کی بہت بڑی اکثریت کے مسلمان ہونے کے باوجود اسلام کو ریاست کا سرکاری مذہب قرار نہیں دیا گیا اور یمن کی ریاست میں شیعہ مسلمانوں کی اکثریت اور انھیں کی حکومت ہونے کے باوجود یہ ریاست ایٹن کے ساتھ متحد ہونے کی بجائے متحدہ عرب جمہوریہ کی ریک وحدت ہے اور متحدہ عرب جمہوریہ کے آئین میں ریاست کے لئے کوئی مذہب متعین نہ کر کے اس بات کی جو گنجائش رکھی گئی ہے کہ متحدہ عرب جمہوریہ میں وہ عرب ریاستیں بھی شامل ہو سکتی ہیں جن میں غیر مسلم عرب بھی آباد ہیں وہ بس بات کا کھٹی ہوئی دین ہے کہ آج پاکستان کی طرح مذہب کی بنیاد پر قوموں اور ملکوں کو اتحاد کی دعوت دینا کسی طرح بھی ممکن نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح یورپ کے باشندوں کا عام مذہب عیسائیت ہے لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ صرف مذہب کی بنا پر ان تمام ریاستوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملحق کر دینے کا کبھی خیال نہ کیا گیا۔ اس کے برعکس آج اقوام عالم کو جن دو گروہوں میں منقسم سمجھا جاتا ہے، ان کی یہ حقیقت یا مفروضہ تقسیم بھی محض سیاسی، معاشی اور تہذیبی نظریات ہی کے اختلافات پر مبنی ہے۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے وہ کم بیش نصف صدی تک غیر ملکی حکومت سے نجات حاصل کرنے کی مسلسل جدوجہد کرتے رہنے کے بعد آزاد ہوا ہے۔ اس جدوجہد میں اس کے ہر گوشہ کے لئے ایک مسلمان، سکھ، عیسائی اور پادری ایک دوسرے کے دوش بدوش حصہ لیتے رہے تھے اور اس کا مقصد ہمیشہ ہندوستان کی آزادی اور خود مختاری کے اصول کے ساتھ یہاں ایک غیر مذہبی جمہوریت کا قیام بھی رہا تھا اور اگرچہ ہندوستان کے قوم پرور عناصر کو ملک کی تقسیم منظور کرنے پر مجبور ہو جانا پڑا تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے اس کی اس مذہبی بنیاد کو تسلیم نہیں کیا تھا جو مسلم لیگ کے رہنماؤں کے پیش نظر تھی اس لئے اگر آج ہندوستان کشمیر کے معاملہ میں پاکستان کے دعوے کے اس مذہبی جز کو تسلیم نہیں کرتا تو یہ امر اس کے لیے اور جمہوری نظریات اور کردار کی ننگلی کا منظر ہے۔

حسن الحاق سے کشمیر ہندوستان کی ایک ایسی ریاست ہے جہاں کے باشندوں کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے اور چونکہ مسلمانوں کو ریاست کی آبادی میں اکثریت حاصل ہے اس لئے وہ ریاست کی مجلس قانون ساز اور کاہنہ میں بھی اکثریت ہی میں ہیں لیکن کیا اس بات کو ہندوستان کے جمہوری اور یکوثر نظریات کے نفوذ اور مقبولیت کی ایک روشنی دہلے دے گی کہ کشمیر کے باشندوں کے سیاسی شعور، بیداری کی ایک زبردست علامت نہیں کہنا چاہیے کہ اس ریاست کے مسلمان، مغربی پاکستان کے باشندوں کے ہم مذہب ہونے کے باوجود سیاسی

اور اقتصادی زاویہ نظر سے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے خواہش مند ہی نہیں ہوئے تھے بلکہ آج تک ہر موقع پر اس الحاق کی توثیق بھی کرتے رہے ہیں۔ اس لئے اگر پاکستان اس ریاست کے بین چوتھائی باشندوں کے ساتھ مغربی پاکستان کے باشندوں کی مذہبی مماثلت کی بنا پر اس کے الحاق کے مسئلہ میں ایک ایسا دعویٰ کر سکتا ہے جو تاریخ اور شواہد کے بالکل برعکس ہے اور جسے اس ریاست کے مسلمان باشندے بھی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں تو ہندوستان کو اپنے جمہوری اور سیکولر نظریات کے ساتھ ریاست جموں اور کشمیر کی پوری آبادی کے جمہوری اور سیکولر نظریات کی مماثلت کی بنا پر اپنے ساتھ اس کے الحاق کو قائم رکھنے کا پاکستان سے کہیں زیادہ حق پہنچتا ہے اور کشمیر کے باشندوں کے اس جمہوری اور سیکولر کردار کا ثبوت صرف اس کے ماضی ہی سے نہیں ملتا بلکہ اس کا حال بھی اس کے کردار کی ان ہی خصوصیات کا منہر ہے۔ حتیٰ کہ سرکار کے آغاز میں شیخ محمد عبداللہ نے جنہیں اس وقت کشمیر کے باشندوں کا اعما و حاصل تھا ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق پر افسوس ارباب خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ :-

”کثیر مسلمانوں کی آبادی کی زبردست اکثریت کے باوجود پاکستان سے علومہ رہا ہے اور اس کی یہ علمہ کی نہ صرف سر جارج کے ”دوقوی نظریہ“ کے کوہ پیچ ہی کو ثابت کرتی ہے بلکہ ان بنیادوں کی مضبوطی کے لئے ایک جیلنگ کی حیثیت بھی رکھتی ہے جس پر پاکستانی کا قیام عمل میں آیا ہے۔“

پھر اسی نقد نہیں بلکہ موصوف نے ۲۰ ستمبر ۱۹۴۷ء کو دہلی میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ

”ہم نے (الحاق کا جو فیصلہ کیا ہے) ہمارے لئے اس سے انحراف کی

کوئی صورت ممکن نہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ کشمیر میں کسی دینی حکومت کے قیام کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔“

اور اس کے بعد اٹھنوں نے ۱۲- فروری کو مناس میں ایک جلسہ عام میں فرمایا تھا کہ:
 ”ہمیں نیڈت ہرو اور ہندوستان کے دوسرے رہنماؤں کی ذات میں امید کی ایک جھلک نظر آتی ہے۔ یہ لوگ ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے ہر حصہ میں فرقہ وارانہ نظریات کا بطلان کر رہے ہیں۔ لیکن پاکستان کی حیثیت کو سمجھنے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہو سکتی۔ وہاں کی حکومت دینی حکومت ہے اور اسے محض جاگیرداروں اور فرقہ وارانہ رجعت پسندی کی بقا اور تحفظ کے ساتھ دل چاہی ہے۔“

اور ان تک مباحثوں کے پیش منظر یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ کشمیر کے معاملہ میں مذہب کو کوئی دخل حاصل نہیں ہے اور خود کشمیر کے مسلمان باشندے بھی پاکستان کے دعوے کے اس جہد کو تسلیم نہیں کرتے اور جب وہ خود ہی اسے تسلیم نہیں کرتے تو پاکستان کے دعوے کا یہ جہد بے وزن اور بے جان ہو کر رہ جاتا ہے۔

جہاں تک اقتصادی زاویہ نظر سے کشمیر کے ساتھ پاکستان کا تعلق قائم کرنے کا سوال ہے۔ اس کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ کشمیر کی بدولت پاکستان کی اقتصادی اور معاشیات میں کشادگی پیدا ہو اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ پاکستان کشمیر کی اقتصادی اور معاشی فراخی کا موجب ثابت ہو سکے۔

اس سلسلے میں اس بات کو مدنظر رکھنا چاہیے کہ کشمیر کا تنازعہ آج سے ۱۶ سال

پہلے شروع ہوا تھا اور اس کے مقدمات کی ترتیب بھی اسی زمانہ میں کی گئی تھی۔ اور اگرچہ آج کا کشمیر اقتصادی اعتبار سے اس وقت کے کشمیر کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہے پھر بھی ہمیں پاکستان کے مقدمہ کے دوسرے جزو کے سلسلہ میں اسی وقت کے کشمیر کو مد نظر رکھنا چاہیئے۔ اور جب ہم اقتصادی زاویہ نظر سے آج سے بارہ سال پہلے کے کشمیر کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ:-

”اس زمانہ میں یہ ریاست اقتصادی اعتبار سے برصغیر ہند کی سب سے

کم ترقی یافتہ ریاست تھی۔“

اور اگرچہ اس بارہ سال کی مدت میں اس کے اقتصادی حالات بہتر ہو چکے ہیں لیکن پھر بھی بعض لمبی اسباب اور قدرتی حالات کے باعث اس کے حالات کی یہ بہتری بھی اسے خود کفایتی نہیں بنا سکی اور ان حالات میں یہ بات ظاہر ہے کہ کشمیر کی بدولت پاکستان کو اقتصادی اعتبار سے کوئی قابل ذکر فائدہ نہیں پہونچ سکتا تھا اور جہاں تک پاکستان سے کشمیر کو کوئی فائدہ پہونچنے کے سوال کا تعلق ہے اس کا اندازہ سٹریٹس این راؤ کی اس تقریر سے کیا جاسکتا ہے جو انھوں نے سرٹھڑی اندھاں کی نشریہ کے اسی جزو کے جواب میں مجلس تحفظ کے روبرو کی تھی۔

سٹریٹس این راؤ نے کشمیر اور پاکستان کے اقتصادی اور تجارتی تعلق کا تجزیہ کرتے ہوئے

کہا تھا کہ:-

”۴۵-۱۹۴۷ء میں کشمیر نے تقریباً ۵ کروڑ ۶۰ لاکھ روپے کا سامان

درا لیا تھا لیکن چونکہ یہ اعداد و شمار تقسیم ہند سے قبل کے ہیں اس لئے

یہ نہیں بتایا جاسکتا کہ آج کے ہندوستان اور پاکستان میں شمل علاقوں

کے وزیر اعلیٰ اس درآمد کا تناسب کیا تھا۔ پھر بھی سرکاری رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں سے ۴۰ کروڑ ۶۰ لاکھ روپے کا سامان ان علاقوں سے گیا تھا جو ہندوستان میں شامل ہیں اور ایک کروڑ ۲۰ لاکھ روپے کا سامان ان علاقوں سے دیا گیا تھا جو پاکستان میں شامل ہیں ۴۰-۵۰-۵۵ء میں یہ تناسب ۴۰ کروڑ ۷۰ لاکھ اور ۹۰ لاکھ روپے رہ گیا تھا اور ۶۰-۶۵-۶۹ء میں ہندوستان نے کثیر کو ۵ کروڑ ۹۰ لاکھ روپے کا سامان ہٹا لیا تھا اور پاکستان نے ایک کروڑ ۲۰ لاکھ روپے کا اور ان ہی تین سال کی مدت میں کثیر کی درآمد کا تناسب ہند اور پاکستان کے درمیان علی الترتیب ۸۰ اور ۲۰ فیصد رہا تھا۔

اور اگرچہ پاکستان کے اس دعوے کی بے بضاعتی کو سمجھنے کے لئے کہ کثیر اور اس کی اقتصادیات ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں، مذکورہ بالا اعداد و شمار کا مطالعہ ہی کافی ہے لیکن اگر مزید حقائق کو سامنے رکھا جائے تو یہ دعویٰ بالکل ہی بے وزن ہو کر رہ جاتا ہے۔ جہاں چاہے یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر کی تمام تر مصنوعات اور پیداوار کا سب سے بڑا خریدار ہندوستان ہی رہا ہے۔ کثیر کے پھل تقسیم ہند سے پہلے راہ پٹنڈی کے راستے سے آکر ہندوستان کے تمام بڑے شہروں ہی میں فروخت ہوتے تھے اور آج وہ راہ پٹنڈی کے ٹوبلے راستے سے آنے کی بجائے براہ راست دہلی، کھنوا، پٹنہ، بمبئی، بھارت، مدراس اور دوسرے سینکڑوں چھوٹے بڑے شہروں میں حتیٰ کہ قصبوں اور دیہات تک پہنچنے اور فروخت ہوتے ہیں۔ کثیر کے شمال ہندوستان کی آبادی کے لئے زندگی کی ایک ضرورت کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہندوستان اور ملت کے لوگوں کی مختلف ضرورتوں میں کام

ماتے ہیں۔ لکڑی اور دینا کاری کی صنعتیں ہمیشہ سے ہندوستان کی سرپرستی میں فروغ پاتی رہی ہیں اور پیرپاشی کی کشمیری صنعت بھی ہندوستان ہی کی بدولت فروغ پاتی رہی ہے اور آج بھی ان تمام صنعتوں کی ترقی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ کسی زمانہ میں بھی پاکستان کی سرپرستی کی محتاج نہیں تھیں۔

حفاظتی اور دفاعی زاویہ نظر سے پاکستان کے مقدمہ کا مطالعہ کرنے کے بعد جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یا تو پاکستان ہندوستان کے علاوہ کسی دوسرے ملک کے حملہ کا اندیشہ میں مبتلا ہے یا پھر اسے ہندوستان ہی کی طرف سے حملے کا اندیشہ لاحق ہے۔ لیکن جہاں تک دوسرے ملکوں کے حملے کا اندیشہ کا تعلق ہے، ہندوستان کے ایک حصہ کی حیثیت سے ریاست جموں اور کشمیر کا پاکستان اور ان ملکوں کے درمیان حائل رہنما دفاعی زاویہ نظر سے پاکستان کے لئے زیادہ مفید ہے۔ اس حال میں اس ریاست کے تحفظ اور دفاع کی تمام ذمہ داریاں ہندوستان پر عاید ہوتی ہیں لیکن ان کا فائدہ پاکستان کو پہنچتا ہے۔ لیکن اگر اسے ہندوستان کی جانب سے حملہ کا اندیشہ لاحق ہے تو اس کا اندیشہ اس لئے بالکل بے بنیاد ہے کہ اول تو گذشتہ بارہ سال کی مدت میں کسی نازک سے نازک موقع پر بھی حکومت ہند نے، پاکستان کے خلاف مواڈانہ رجحانات کا مظاہرہ نہیں کیا اور وہ ہمیشہ اس کے متعلق خیر سگالی کی حکمت عملی ہی پر کاربند رہی ہے۔ اپنی اس حکمت عملی کی بنا پر اس نے کشمیر کے معاملہ کو مجلس تحفظ میں پیش کیا تھا اور اپنے ان ہی خیر سگالانہ جذبات کے ماتحت جنوری ۱۹۵۰ء میں یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ دونوں ملکوں کو باہم جنگ نہ کرنے کا ایک معاہدہ کر لینا چاہیے اور اسے پاکستان کی طرف سے مسترد کئے جانے کے باوجود یہ پیشکش اب تک بحال ہے لیکن اگر اس اندیشہ کو بھی صحیح فرض کر لیا جائے تو ریاست جموں اور کشمیر کو اس سلسلے میں کوئی اہمیت نہیں دی جاسکتی۔

کثیر ایک و شمار گزار کو ہستانی علاقہ ہے اور اگر بغرض حال ہندوستان کشمیر کی راہ سے پاکستان پر حملہ کرنے کا ارادہ بھی کرے تو اسے راہ کی ان تمام رکاوٹوں پر غالب آنا پڑے گا اور ایسی حالت میں کہ ان دونوں ملکوں کے درمیان ۸ سو میل تک کوئی قدرتی سرحد موجود نہیں ہے، کسی فوجی اقدام کے لئے اس ۸۰۰ میل کی غیر قدرتی سرحد کو عبور کر محض کثیر کو منتخب کرنا ایک ایسی فوجی غلطی ہوگی جس کی توقع فوجی جنگ کے کسی ہندی سے بھی نہیں کی جاسکتی اور اس نادیدہ نظر سے کشمیر کی عدم اہمیت کو سمجھ لینے کے بعد یہ سمجھ لینا دشوار نہیں رہ جاتا کہ پاکستان کی طرف سے اس کی دفاعی اہمیت پر زور دینا بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

پھر جہاں تک مغربی پاکستان کے ساتھ کشمیر کی طبعی مماثلت اور دریائے سندھ کی بدلتی ان دونوں کے ارتباط کا تعلق ہے، پاکستان کے مقدمہ کی یہ کڑی سب سے زیادہ کمزور ہے اور علم طبقات الارض کا ایک مبتدی بھی اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتا ہے کہ جو ملک ایک دوسرے سے متصل واقع ہوتے ہیں ان کی بعض طبعی خصوصیات مشترک ہوتی ہیں لیکن ان طبعی خصوصیات کی مماثلت کی بنا پر کوئی ملک اپنے ہمسایہ ملکوں کو ملحق کر لینے کا تصور بھی نہیں کرتا۔ اسی طرح دریائے سندھ دو ملکوں میں بہنے والا دنیا کا کوئی واحد دریا نہیں ہے بلکہ یورپ کا بین الاقوامی دریا ڈینیوب متعدد ریاستوں سے ہو کر گذرتا ہے اور دریائے نیل بھی مصر اور سودان کو سیراب کرتا ہے لیکن یہ دونوں دریا یورپ اور افریقہ کی بین ریاستوں سے ہو کر گذرتے ہیں ان میں سے کسی ریاست نے کبھی دوسری ریاستوں کو صرف اس بنا پر اپنا حجز نہ نہیں قرار دیا کہ یہ دریا ان ریاستوں کو بھی سیراب کرتے ہیں۔ اس کے برعکس ایسے حالات کے لئے آب پاشی، جہاز رانی اور بحری تجارت کے بین الاقوامی منوال پر عمل درآمد کیا جاتا ہے اور ہند اور پاکستان کے درمیان بھی آسانی کے ساتھ ان مسائل پر قابل عمل سمجھوتے ہو سکے ہیں۔ چنانچہ گزشتہ بارہ سال کے واقعات اس امر کے شاہد ہیں کہ اس تمام مدت میں پاکستان کشمیر سے بچنے والے ان تمام

درباروں سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا رہا ہے اور ان ہی میں اقوامی روابط کے ماتحت عالمی بینک کے توسط سے ہندو اور پاکستان کے درمیان نہری پانی کے تبادلہ کا فیصلہ ہوا ہے اور اب پاکستان اب پاشی کے لئے نہریں تعمیر کرنے پر رضامند ہو گیا ہے۔ کشمیر سے مستحق پاکستان کے مقدمہ کے تمام اجراء کی حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد یہ سمجھ لینا بھی کوئی دشوار کام نہیں رہ جاتا کہ اپنے اس بے دلیل دعوے کے باوجود وہ اس ریاست پر قبضہ کر لینے کا خواہش مند ہے لیکن کیا ہندوستان سے اس بات کی توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے ایک حصہ سے دست بردار ہو کر اپنے کسی ہمسایہ ملک کے حوالہ کر دینے پر آمادہ ہو جائے گا؟

ریاست جموں اور کشمیر کے سلسلہ میں ہندوستان کے موقف کو سمجھنے کے لئے اس بات کو بھی ذہنی نشیں کر لینا چاہیے کہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو مسلم کانفرنس کے بعض رہنماؤں نے راولپنڈی کے ایک ہوٹل میں جمع ہو کر آزاد کشمیر کے نام سے ایک متوازی حکومت قائم کرنے کا فیصلہ اور اعلان کیا تھا۔ برائے نام آزاد کشمیر کی یہ حکومت آج تک قائم ہے لیکن اول تو اس کا نام تہاد اثر سورخ اس کے صدر مقام مظفر آباد اور اس کے گرد وواح ہی تک محدود ہے اور کشمیر کے ان اہم علاقوں کے ساتھ جو اس وقت پاکستان کے قبضہ میں ہیں عملاً اس نام تہاد حکومت کا کوئی تعلق نہیں، دوسرے اس نام تہاد حکومت نے بارہ سال کی اس طویل مدت میں پاکستان کے ساتھ اپنے زیر اثر علاقہ کے الحاق کا کوئی اعلان نہیں کیا۔ اس کے برعکس ہندوستان کے ساتھ ریاست جموں اور کشمیر کا الحاق قانونی طور پر اس کے حکمران مہاراجہ ہری سنگھ نے کیا تھا اور ان کے اس فیصلہ میں انہیں باشندگان کشمیر کی تائید اور حمایت حاصل تھی۔ اس لئے ایک جانب تو ہندوستان بجا طور پر مقبوضہ کشمیر کو بھی اپنا ایک حصہ مانتی کرتا ہے اور دوسری طرف ہندوستان کی حکومت دنیا کے رو بہ پوری ذمہ داری کے ساتھ ہندو چین کے ایک حصہ یعنی کشمیر کی تائید کر سکتی ہے لیکن چونکہ اول تو ہندوستان کی

سرزمین پر اس پرانے نام آزاد کشمیر کی حکومت کا وجود ہی غیر قانونی ہے اور دوسرے اس نے پاکستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کا کوئی اعلان بھی نہیں کیا اس لئے ان دونوں کو دنیا کے دو بدکشمیر کی نمائندگی کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔

بہر حال کشمیر کے مسئلہ کے ان دونوں پہلوؤں کو ذہن نشین کر لینے کے بعد ان پیچیدگیوں کو سمجھ لینے میں کوئی دشواری پیدا نہ ہوگی جو اس مسئلہ کو مجلس تحفظ میں پیش کرنے کے بعد سے اس وقت تک پیدا ہوتی رہی ہیں اور ان ہی سطور کی روشنی میں یہ بات بھی واضح ہو سکے گی کہ آج اس معاملہ میں ہندوستان کا موقف کیا ہے۔

ساتواں باب

مجلس تحفظ میں

گذشتہ ابواب کے مطالعہ کے بعد اس بات کے اعادہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ ۱۹۴۷ء کے
 مسئلہ کو ریاست جموں اور کشمیر کے حکمران ہمارا جہ ہر مسئلہ کی اس درخواست الحاق کو منظور کر لینے
 کے بعد جسے ریاست کی عوامی سیاسی تنظیم 'نیشنل کانفرنس' کے رہنماؤں کی کامل تائید اور حمایت حاصل
 تھی، یہ ریاست قانونی طور پر ہندوستان کا ایک حصہ بن گئی تھی اور حکومت ہند کو اپنے ایک ایسے
 علاقہ کے تحفظ کے لئے جس پر قبائلیوں کی مسلح یورش جاری تھی وہاں اپنی افواج بھیجی گئی تھیں۔
 لیکن حکومت کی ان دفاعی سرگرمیوں کے دوران میں اسے اس امر کا اندازہ ہوا تھا کہ کشمیر
 پر حملہ کرنے والے ان قبائلیوں کو اس کے ہمسایہ ملک پاکستان سے امداد مل رہی ہے اس لئے
 پہلے تو وہ حکومت پاکستان کو اس بات پر توجہ دلاتی رہی تھی کہ پاکستان سے مختلف طریقوں پر
 قبائلی حملہ آوروں کو جو امداد مل رہی ہے اسے بند کر دیا جانا چاہیئے۔ لیکن جب مسلسل کوششوں کے
 باوجود پاکستان نے اپنے رویہ میں کوئی تبدیلی نہیں کی تو اسے مجبور ہو کر اس معاملہ کو مجلس تحفظ
 میں پیش کرنا پڑا تھا۔ چنانچہ ۲۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو ہندوستان کے وزیراعظم نیٹوت جواہر لال نہرو
 نے نئی دہلی میں ان واقعات کی وضاحت کرتے ہوئے نمائندگان جرائد کو بتایا تھا کہ:

اور ان نتائج کی بنیاد پر مجلس تحفظ سے درخواست کی تھی کہ وہ حکومت پاکستان کو مشورہ دے کہ :-

(۱) پاکستانی کے سرکاری ملازمین کو خواہ وہ فوجی ہوں یا انتظامی ریاست جموں اور کشمیر کے خلاف جارحانہ حملہ میں شریک ہونے یا اس حملہ میں اعانت کرنے سے روک دیا جائے۔

(۲) پاکستان کے دوسرے شہریوں کو ریاست جموں اور کشمیر کی لڑائی میں کسی طرح بھی حصہ نہ لینے کی ہدایت کر دی جائے اور

(۳) (وہ) حملہ آوروں کو (الف) اپنے علاقہ سے گذر کر کشمیر پر حملہ کرنے اور اس علاقہ کو جارحانہ اقدامات کا مستقر بنانے کی اجازت نہ دے (ب) اشیاء فوجی اور دوسری قسم کا سامان پہنچانا بند کر دے اور (ج) انہیں اس قسم کی کوئی اعلاوہ دے جس سے یہ کٹش مکش طویل ہو سکی ہو۔

اس تہذیب کے مطابق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا کہ وہ اقوام متحدہ کو ریاست جموں اور کشمیر کے ساتھ اپنے قانونی تعلق سے آگاہ کر کے، مجلس تحفظ کے توسط سے پاکستان کو اس بات پر آمادہ کر سکے کہ وہ اپنے شہریوں کو کشمیر پر حملہ میں حصہ لینے سے روک دے، حملہ آوروں کو اپنے علاقہ سے گذرنے اور اپنے وسائل نقل و حمل استعمال کرنے کی اجازت نہ دے اور انہیں مزوری سامان پہنچانے نہ دے۔ اور ہندوستان کو اس امر کی توقع تھی کہ مجلس تحفظ ادارہ اقوام متحدہ کے ایک رکن کے خلاف دوسرے رکن کی اس اہم تفکایت کو دور کرانے کے لئے کوئی فوری اور مؤثر قدم اٹھائے گی۔ چنانچہ ۱۵ جنوری ۱۹۴۷ء کو مجلس تحفظ کے روبرو ہندوستان کے مقدمہ کی وضاحت کرنے کے بعد مسٹر جی پالاسوامی نے گراؤنگھانی نے کہا تھا کہ :

”ہم نے مجلس تحفظ کے روبرو ایک سیدھا سادہ معاملہ پیش کیا ہے۔۔۔

اور ہمیں اپنی توجہات کو جن احمقانہ مرکزہ کرنا چاہیے وہ یہ ہیں کہ کشمیر کی سرزمین کو حملہ آوروں سے خالی کرایا جائے۔ اور ان لڑائی کو فوراً بند کر دیا جائے۔“

ہندوستان اور کشمیر کے تعلق کے سلسلہ میں بلیادی طور پر پاکستان کا کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن چونکہ قبائلی کشمیر پر پاکستانی علاقہ سے گزرنے والا حملہ آوروں سے تھے، کشمیر کی سرحد کے قریب، پاکستان میں ان حملہ آوروں کے فوجی مستقر قائم تھے، ان کے ساتھ پاکستان کے شہری شامل تھے اور پاکستان میں سے انہیں ضروری سامان، رسد اور نقل و حمل کی آسائیاں مل رہی تھیں اس لئے ہندوستان اپنے مقدمہ میں اسے شامل کرنے پر مجبور تھا اور دیکھا کہ ہندوستان نے اپنی ان مفصل قیسا وین میں بتایا تھا جو اس نے اس سلسلہ میں ۲۷ جنوری ۱۹۴۷ء کو مجلس تحفظ میں پیش کی تھیں۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ:-

”پاکستان ان قبائلیوں اور دوسرے لوگوں کو جنہوں نے کشمیر پر حملہ کیا ہے اور جو ایک ملک ریاست میں موجود ہیں، سمجھا بھگا کر ریاست سے واپس چلے جاتے اور لڑائی سے دست کش ہو جانے پر آمادہ کرے، انہیں اپنے علاقہ سے گزرنے والے سے کشمیر کے خلاف جارحانہ اقدامات کا مستقر بننے کی ممانعت کر دے اور انہیں براہ راست یا بالواسطہ کسی قسم کی مدد نہ دے۔“

نوٹ: ادارہ اقوام متحدہ نے مجلس تحفظ (سیکوریٹی کونسل) کی تمام یادداشتوں کے لئے انگریزی کا حرف و اختیار کیا ہے۔ P.V سے مراد وہ تقریریں ہیں جو مجلس کی نشستوں میں کی جاتی ہیں۔ الہ تمام یادداشتوں پر ترتیبی نمبر اور تاریخیں درج ہوتی ہیں۔ اس کتاب میں حوالوں کے لئے یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

1. S/P. V. 227, Jan. 15, 1948

2. S/P. V. 236, Jan. 28, 1948 | Pp. 266-267

لیکن اسے ادارہ اقوام متحدہ کی تاریخ کا ایک 'حادثہ' کہنا چاہیے کہ
 "بین الاقوامی حالات کی پیچیدگیوں کی بدولت مجلس تحفظ اس معاملہ میں
 غیر جانبدارانہ اور بے لاگ رویہ اختیار نہیں کر سکی جس کی بدولت کشمیر کا سوال
 غیر قدرتی طور پر بین الاقوامی الجھنوں کے ساتھ وابستہ ہو کر رہ گیا اور اس مسئلہ کو
 پُر اس طریقہ پر حل کرنے کی کوشش میں دُور افتادہ اور غیر متعلقہ سوالات
 بھی شامل ہو گئے۔"

چنانچہ شیخ محمد عبداللہ نے ۱۹۴۷ء میں مجلس تحفظ کو خطاب کرتے ہوئے اس حقیقت کو ان الفاظ
 میں بیان کیا تھا کہ :

مجلس تحفظ کو اس معاملہ کے ساتھ دوسرے دور افتادہ مسائل کو وابستہ
 کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔ مجلس تحفظ کے سامنے صرف یہ مسئلہ ہے
 کہ پاکستان کو اپنی بین الاقوامی ذمہ داریوں پر قائم رہنا چاہیے اور اسے
 بیرونی حملہ آوروں کی امداد نہیں کرنی چاہیے۔"

لیکن یہاں اس بات کو بھی ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ مجلس تحفظ میں کشمیر کے سوال سے متعلق
 کبھی ہوئی حقیقتوں کو نظر انداز کر کے اسے اقتدار پسندی کی سیاست (پاور پالیٹکس) کے
 ساتھ وابستہ کر دینے کی وجہ یہ تھی کہ دنیائے اکثر تو میں ابتداء ہی سے دو گروہوں میں
 منقسم چلی آ رہی ہیں اور ان میں سے ہر گروہ اس کوشش میں مصروف رہا ہے کہ وہ زیادہ
 سے زیادہ قوتوں کو اپنے ساتھ ملا کر خود کو دوسرے گروہ کے مقابلہ میں زیادہ مضبوط اور
 طاقتور بنائے۔ یہی دونوں گروہ ادارہ اقوام متحدہ میں بھی ایک دوسرے کے حریف
 رہتے چلے آئے ہیں اور بین الاقوامی مسائل میں بھی ان دونوں گروہوں کے درمیان
 مستقل کشمکش جاری رہی ہے لیکن ہندوستان ہمیشہ سے نہ صرف ایک غیر جانبدار ملک

ہی رہا ہے بلکہ دوسروں کو بھی غیر جانبدار بننے اور فوجی نیز سیاسی گروہ بند یوں علیحدہ رہنے کی دعوت دیتا رہا ہے اور یہ بات ظاہر ہے کہ اس کا یہ طریقہ عمل کسی گروہ میں بھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جاسکتا اس لئے جو گروہ بھی ادارہ اقامت مندہ میں برسرِ اقتدار ہو گا وہ ہندوستان ہی کو نہیں بلکہ ہر غیر جانبدار ملک کو اپنا ہمنوا بنانے کے لئے یا پھر اپنے گروہ سے تعلق رکھنے والے ملکوں کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے کم از کم ان ملکوں سے تعلق رکھنے والے مسائل کو اُلجھا ضرور سکتا ہے اور یہ بات واضح ہے کہ کشمیر کے معاملہ میں بھی ہندوستان کو اسی میں اقوامی کش مکش کا شکار رہنا پڑا ہے۔

تنازعات کے تصفیہ کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ان کے دائرہ کو زیادہ سے زیادہ محدود کر کے ان کے بنیادی اسباب و علل کو متعین کر لیا جائے اور پھر واقعات اور مشاہدات کی روشنی میں اس بات کا فیصلہ کیا جائے کہ کسی تنازعہ کی ذمہ داری کس فریق پر عاید ہوتی ہے۔ ہندوستان نے مجلس تحفظ میں اپنی شکایت پیش کرتے ہوئے اسی اصول کو مد نظر رکھا تھا اور مجلس تحفظ کو اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی تھی کہ — کشمیر ہندوستان کے ساتھ الحاق کے بعد اس ملک کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ اس لئے آج ہندوستان کے خلاف جو جارحانہ حملہ جاری ہے اسے ختم ہو جانا چاہیئے اور پاکستان کی جانب سے حملہ آوروں کو ہوا ملنا دل نہ رہی ہے اسے بند ہو جانا چاہیئے — اسی لئے مجلس تحفظ ان ہی حدود میں رہ کر ہندوستان کی شکایت پر غور کر سکتی تو یہ مسئلہ آج سے بہت پہلے حل ہو چکا ہوتا لیکن اس نے اس کے دائرے کو وسعت دے کر اس میں بہت سے دور افتادہ اور غیر متعلق مسائل اور مباحث کی شمولیت کا دروازہ کھول دیا جس کے نتیجے میں اس کے دائرہ نظر سے یہ مسئلہ آج تک اُلجھا ہوا ہے۔

ہندوستان کے مندوب مسٹر گوپالاسوامی اسٹنگر انجمنی نے مجلس تحفظ کے روبرو

۱۵ جنوری ۱۹۵۴ء کو اپنے ملک کے مقدمہ کی وضاحت کی تھی اور ۱۶ جنوری ۱۹۵۴ء کو پاکستان کے مندوب اور وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان نے اس کا جواب دیا تھا۔ لیکن اس جواب میں ہندوستان کی شکایت کی تردید کرنے کی بجائے ان کی کوشش یہ رہی تھی کہ اس کے دائرہ کو زیادہ سے زیادہ وسیع کر دیں اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انہوں نے بھی وہی نفسیاتی طریقہ کار اختیار کیا تھا جو ہندوستان کی تقسیم کے مطالبہ میں مسلمانوں کی ایک محمول تعداد کو اپنا ہمنوا بنانے کے لئے مسلم لیگ کے رہنما اختیار کر چکے تھے۔ لیکن ان دونوں طریقوں میں فرق یہ تھا کہ مسلم لیگ کے رہنما ڈن نے براہ راست مذہب کے نام پر مسلمانوں کو ہندوستان کی تقسیم کے مطالبہ کی تائید پر آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی اور سر ظفر اللہ خان نے اپنے جواب میں حقائق اور استدلال کو نظر انداز کر کے محض جذبات انسانیت کو ابھار کر محمول مقصد کی سعی کی تھی۔ چنانچہ سٹراٹیکل ریپر نے لکھا ہے کہ:

” مجلس تحفظ کی توجہ کو قبائلوں کے حملہ کی جانب سے ہٹا کر فرقہ وارانہ فسادات کی جانب مرکوز کر دینے کی سعی کے ساتھ ساتھ سر ظفر اللہ خان کی کوشش یہ بھی رہی تھی کہ جو سوال اقوام متحدہ کے زیر غور ہے اس کے دائرہ کو وسیع تر بنا دیا جائے۔“

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا حقیقی مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا کہ وہ مجلس تحفظ کی توجہ کو ہندوستان کی اصل شکایت سے ہٹا کر غیر متعلق مسائل کی جانب مبذول کر دیں اور انہوں نے جذبات انسانیت کو متحرک کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ اس مقصد کے حصول کے ایک ذریعہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔

بہر حال سر ظفر اللہ خان نے ابتدا ہی سے اپنی تقریر میں اپنے اس متین طریقہ کار

کو بد نظر رکھا تھا اور یہ بات دہلی نشین کرانے کی کوشش کی تھی کہ

” کشمیر پر مسئلہ بجائے خود کوئی اہم اور منفرد واقعہ نہیں بلکہ یہ تقسیم سے پہلے

کے ان واقعات کے سلسلہ کی ایک کڑی اور خصوصاً ۴۰-۱۹ میں پنجاب

میں برپا ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کا نتیجہ ہے۔ “

چنانچہ انھوں نے ۱۵ جنوری ۱۹۴۵ء کو مسٹر آئسنر کی تقریر کا مختصر جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ

” ہندوستان کے مذہب نے اس سوال کو جس درجہ سادہ اور ایسا اندازانہ ثابت

کرنے کی کوشش کی ہے وہ ہمیں اس قدر سادہ اور ایسا اندازانہ معلوم نہیں ہوتا۔ اس لئے

مجلس تحفظ کے روبرو کشمیر کے مسئلہ کا تمام تر پس منظر پیش کرنا ضروری ہے۔ “

اور دوسرے دن اپنی مفصل تقریر کے دوران میں انھوں نے اعلان کیا تھا کہ

” کشمیر میں جو کچھ ہوتا ہے وہ اہمیت و واقعات کی ایک کڑی ہے جن کی

شدت مشرقی پنجاب میں حد انتہا کو پہنچ چکی ہے اور کشمیر کے واقعات کو

ان واقعات سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ “

لیکن یہ امر محتاج بیان نہیں کہ سر فخر الدین خان نے اپنی تقریر میں مشرقی پنجاب کے جن

فرقہ وارانہ ہنگاموں کا حوالہ دیا تھا وہ صرف مشرقی پنجاب ہی تک محدود نہیں تھے بلکہ

مغربی پنجاب کے پاکستانی حصہ میں اس سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ برپا ہوئے تھے۔

سر فخر الدین خان نے اپنی تقریر میں جذبات انسانیت کو متحرک کرنے کا بولفسیاتی

طریقہ اختیار کیا تھا اس کا تذکرہ کرتے ہوئے مائیکل پرچر نے لکھا ہے کہ

1. The Struggle for Kashmir

P. 66

2. S/P. V. 227, P. 31

3. S/P. V. 229, P. 117

(الف) ہندوستان کی شکایت میں 'جارحانہ حملہ' کے سوال کو بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ پاکستان اس سوال کو منظرِ انداز کر دینا چاہتا تھا۔
 (ب) ہندوستان کی شکایت میں بنیادی اہمیت کا دوسرا عنصر، کشمیر پر اس کے قانونی حق کا سوال تھا۔ پاکستان اس سوال کی اہمیت کو کم سے کم کر دینا چاہتا تھا۔

(ج) پاکستان کشمیر پر حملہ میں اپنے شہریوں کی شرکت کو بھی اٹکے جڑا بنا کر منسکاب کا اتفاقاً ثابت کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ سر ظفر اللہ خاں نے کہا تھا کہ —
 اب یہ لوگ (پاکستانی فوجی) رخصت پر جاتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے ہم قوموں کا قتل عام کیا جا رہا ہے یا انہیں شدید اذیتیں دی جا رہی ہیں تو اگر ان میں سے کچھ ان واقعات میں خود حصہ لینے لگتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہیں لڑائی میں شریک ہونے کے لئے رخصت دی جاتی ہے۔ ایک انسان ان حالات میں اور کہہ ہی کیا سکتا ہے ؟

(د) پاکستان اپنے ان ممتاز عمال کی مداخلت کرنا چاہتا تھا جنہوں نے قبائلیوں اور پاکستان کے شہریوں کو کشمیر پر حملہ کی ترغیب دی تھی۔ چنانچہ سر ظفر اللہ خاں نے کہا تھا کہ — ان حالات میں ۱۰۰۰۰۰ یہ بات صحیح ہے کہ بعض صوبائی وزراء نے کچھ ایسی باتیں کہی ہیں جنہیں نہ کہنا ہی مناسب ہوتا لیکن اس بات کی تفرق کی جانی چاہیئے کہ وزیر ہو جانے کے بعد وہ انسانیت کے دائرے سے خارج نہیں ہو گئے ہیں اور براہِ امید کرنا کہ چونکہ وہ وزیر ہیں اس لئے انہیں مسلمان کی حیثیت سے بھی اپنے جذبات و مصلحتوں اور اپنی خواہشات کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے۔ ایک ایسی امید

ہے جو انسانوں سے قائم نہیں کی جاسکتی۔

(سرمظفر احمد خان نے ان سطور میں جن باتوں کا حوالہ دیا ہے وہ پاکستانی باشندوں اور قبائلیوں کو مشتعل کر کے انہیں کشمیر پر حملہ کرنے اور لڑائی جاری رکھنے سے متعلق پاکستان کے اعلیٰ حکام اور رہنماؤں کے وہ اعلانات اور تقریریں ہیں جن کا مفصل تذکرہ گذشتہ ابواب میں کیا جا چکا ہے)

(دکا) پاکستان ہندوؤں اور سکھوں کے اس قتل عام پر پُریدہ ڈالت چاہتا تھا جو مغربی پنجاب میں ہوا تھا۔

(د) اور سب کے بعد پاکستان کا مقصد کشمیر پر قبائلیوں کے جارحانہ حملوں کو جائز اور معقول ثابت کرنا تھا۔

سرمظفر احمد خان کے بیان کے اصل خلاصہ اور اس پر مائیکل بریجسپیر کے ان تاثرات کی روشنی میں غور کرنے کے بعد یہ دو باتیں بالکل واضح ہو جاتی ہیں کہ اول تو انہوں نے اپنے اس پورے بیان میں مسلم لیگ کی بنیادی فرقہ وارانہ حکمت عملی کو مد نظر رکھتے ہوئے کشمیر کے مسئلہ کو دو قومی نظمیہ پر مبنی ثابت کرنے کی کوشش کی تھی اور دوسرے انہوں نے ہندوستان کی شکایت کے تمام اجزاء کی صحت کو تسلیم کر لیا تھا لیکن واقعات کے اسباب علل کو دوسرے رنگ میں پیش کیا تھا اور اس وقت کے بین الاقوامی حالات کی پیچیدگیوں کی بدولت مجلس تحفظ نے بھی ان کے ان گمراہ کن منطریات کو قبول کر لیا تھا اور اسی لئے اس نے ۲۲ جنوری ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کی شکایت کے اصل عنوان 'ہمیں اور کشمیر کا سوال' کو تبدیل کر کے 'ہند اور پاکستان کا سوال' کے نام سے موسوم کر دیا تھا۔ مجلس تحفظ نے اس معاملے میں جو رویہ اختیار کیا تھا اس کے متعلق

منظر نگار نے مارٹن نے وسط فروری ۱۹۴۷ء کے نیواسٹیشن میں اینڈ نیشن، میں ان الفاظ میں اظہار خیال کیا تھا کہ:-

”ہندوستان اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی درخواست پر ایمانداری کے ساتھ غور کیا جائے اور اسے منظر انداز نہ کر دیا جائے۔ مجلس تحفظ کے سامنے جو یہ سادہ سوال پیش کیا گیا تھا اس پر غور کرنے سے اس کے انکار سے تقریباً ہر ہندوستانی کو اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ معاملہ پر حقائق کی روشنی میں غور نہیں کیا گیا ہے بلکہ اسے اقتدار پسندانہ سیاست کے تابع کر دیا گیا ہے اور خصوصاً یہ کہا جاتا ہے کہ اس طرز عمل کے پس پردہ جو عناصر کام کر رہے ہیں ان میں سے اہم ترین عنصر پاکستان میں اینگلو امریکن فوجی مستقروں کا معاملہ ہے۔“

اور ان ہی حقائق کے سلسلہ میں مشہور ہیں شیخ محمد عبداللہ نے مجلس تحفظ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

”ہیں ایک بار پھر مجلس تحفظ سے درخواست کرتا ہوں کہ اسے کبھی کے سوال کو طے کرتے ہوئے متنازعہ فیہ نکتہ کو دوسرے معاملات کے ساتھ الجھا نہیں دیتا چاہیے۔“

لیکن یہ امر محتاج بیان نہیں کہ مجلس تحفظ میں بعض معلوم اور غیر معلوم اسباب کی بنا پر اس سوال کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا۔ اس کے باوجود جیسا کہ آئندہ سطور سے واضح ہو سکے گا ہندوستان اس مسئلہ کو پرامن طریقے سے حل کرنے کے بنیادی نصب العین

1. New Statesman and Nation, Feb. 1948

2. Kashmir Decides its Destiny P. 2

پہنچاؤم رہا اور اس نے اسے طے کرنے کے لئے ۲۷- جنوری ۱۹۴۷ء کو مجلس تحفظ کے روبرو اپنی جو مفصل قب ویدہ پیش کیں وہ اس کی اس خواہش کے بقی ثبوت کی حیثیت رکھتی ہیں۔

گذشتہ ابواب میں یہ بات بتائی جا چکی ہے کہ اول تو ہندوستان کی حکومت ۲۷- اکتوبر ۱۹۴۷ء کے کثیر میں رونما ہونے والے تمام واقعات سے ناخبر ہونے کے باوجود اس کی طرح بھی مداخلت نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن جب اس نے ہندوستان کے ساتھ ہمارا جو ہر سنگھ کی اس درخواست الحاق کو منظور کر دیا ہے ریاست تھوں اور کشمیر کی واحد سیاسی تنظیم نیشنل کانفرنس کے رہنماؤں کی کامل نایب اور حمایت حاصل تھی تو اس نے اپنے مسئلہ اصول کے ماتحت اس الحاق کو اس مقصد کے پیش نظر منظور کیا تھا ہے ہندوستان کے وزیر اعظم اور وزیر خارجہ پنڈت جواہر لال نہرو نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:

”میں اس بات کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس ہنگامی صورت حال میں کشمیر کی امداد کا سوال کسی طرح بھی اسے ہندوستان کے ساتھ ملحق ہو جانے کے لئے متاثر کرنے کے خیال پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ ہمارا نظریہ یہ ہے اور ہم متواتر اس کا اعلان کرتے رہے ہیں کہ ہر ممتاز عرقیہ علاقہ یا ریاست میں الحاق کے سوال کو عوام کی خواہشات کے مطابق طے کیا جائے گا اور ہم اپنے اس نظریہ پر قائم ہیں لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ اگر بیرونی حملہ کشمیر کے علاقائی سالمیت کو نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو گیا تو کشمیر کے باشندوں کے لئے اظہار رائے کی آزادی کو قائم رکھنا ممکن نہ ہو سکے گا۔“

اور جس کے متعلق مسٹر سنگھ نے مارٹن نے فروری ۱۹۴۷ء میں لکھا تھا کہ:

1. Telegram from Foreign, New
Delhi to Prime Minister U. K.
London 25-10-47

”اس بات میں شبہ کی ذرہ برابر بھی گنجائش نہیں کہ اگر ہندوستان گذشتہ اکتوبر میں (کشمیر میں) مداخلت نہ کرتا تو سری نجر اور حسین وادئی کشمیر میں آج راکھ کے ڈھیروں کے علاوہ کچھ نظر نہ آتا۔“

اس نے یہ بات ظاہر ہے کہ مجلس تحفظ میں اپنی شکایت پیش کرنے سے بھی ہندوستان کا مقصد یہ تھا کہ اس کے توسط سے کشمیر کی سرزمین کو حملہ آوروں کو پاک کرانے کے بعد ایسی سادگاراؤ پراسن فضا پیدا کی جائے جس میں کشمیر کے باشندے آزادی کے ساتھ اپنے مستقبل یا ریاست کے الحاق کا فیصلہ کر سکیں۔

ہندوستان نے کشمیر کے سوال کو طے کرنے کے لئے ۲ جنوری ۱۹۴۷ء کو مجلس تحفظ کے صدر پروتجا ویر کا جو مسودہ پیش کیا تھا اس میں انھیں ہر دو مقاصد کو مد نظر رکھتے ہوئے پہلے مقصد کے حصول کے لئے یہ تجویز پیش کی تھی کہ

”پاکستان کی حکومت اپنے اثر سے کام لے کہ حملہ آوروں کو کشمیر سے واپس چلے جانے پر آمادہ کرے۔ انھیں پاکستانی علاقہ سے گزرنے کی اجازت کر دے، انھیں پاکستانی علاقوں میں فوجی مستقر قائم کرنے کی اجازت نہ دے اور ان کی امداد نہ کرے۔“

اور جب یہ پہلا مقصد حاصل ہو جائے تو دوسرا مقصد یعنی امن قائم کرنے اور حالات کو حسب معمول بنانے کے لئے

ان تمام کشمیریوں کو جو جنگ کے باعث اپنے گھروں سے بھاگ گئے تھے واپس بلایا جائے اور انھیں پورے شہری حقوق کے استعمال کی اجازت دی جائے۔ تمام سیاسی قیدیوں کو چھوڑ دیا جائے۔ مناسب سیاسی سرگرمیوں پر

کوئی پابندی نہ لگائی جائے اور اختلاف خیالات یا سابقہ سیاسی سرگرمیوں

کی بنا پر کسی کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی نہ کی جائے۔“

اپنی ان تجاویز میں ہندوستان نے یہ بھی کہا تھا کہ لڑائی ختم ہونے کے بعد سے استصواب رائے مد کے وقت تک کشمیر کے تحفظ کی یقینی دہائی کی جانی چاہیے اور چونکہ کشمیر ہندوستان کے ساتھ ملحق ہو چکا ہے اس لئے

”جس وقت تک ہندوستان کے ساتھ کشمیر کا یہ الحاق قائم ہے

حکومت ہند اس کے دفاع کی ذمہ دار بھی ہے اس لئے اگرچہ جنگ بندی

کے بن کشمیر میں متین ہندوستانی افواج کی تعداد کو کم کر دیا جائے گا لیکن

آئندہ کے لئے کسی بیرونی حملہ کی مداخلت اور انتظامی حکام کو امن اوقات

کی بقا میں مدد دینے کے لئے مناسب تعداد میں ہندوستانی افواج کا

رہاں رہنا ضروری ہے۔“

پھر جہاں تک کشمیر کے داخلی، سیاسی اور انتظامی معاملات کا تعلق ہے ہندوستان نے

تجویز کیا تھا کہ

”اس وقت کشمیر میں جو ہنگامی حکومت قائم ہے اسے ذمہ دار وزارت

میں تبدیل کر دیا جائے۔“

اور سب کے بعد ہندوستان نے کشمیر کے تنازعہ کو طے کرنے کی غرض سے استصواب رائے عامہ

کے سلسلہ میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ

”ہائیکورٹ کے حق رائے دہندگی کی بنیاد پر نیشنل اسمبلی طلب کی جائے

اس اسمبلی کی بنیاد پر نیشنل گورنمنٹ قائم کی جائے اور یہ حکومت اقوام متحدہ

کے مقرر کردہ افراد کی ہدایت کے مطابق اور ان کی نگرانی میں استصواب رائے عامہ کرائے۔

ہندوستان کی ان تجاویز کے مقابلہ میں پاکستان نے کشمیر کے تنازعہ کو طے کرنے کے لئے جو تجاویز پیش کی تھیں ان کا خلاصہ یہ تھا کہ ادارہ اقوام متحدہ (الف) جموں اور کشمیر میں ایک غیر جانبدار عبوری حکومت قائم کرانے کا اہتمام کرے

(ب) ریاست کو تمام تر مسلح افواج سے خالی کرائے

(ج) ریاست کے جو باشندے ہنگاموں کے باعث ریاست سے چلے

گئے تھے یا انہیں چلے جانے پر مجبور کیا گیا تھا انہیں واپس بلائے۔ اور

(د) استصواب رائے عامہ کا انتظام کرے۔

اور اگرچہ کشمیر کے تنازعہ کو طے کرنے کے سلسلے میں بظاہر دونوں ملکوں کی تجاویز میں کوئی فرق نظر نہیں آتا لیکن محض اسی وجہ کے ساتھ ان دونوں کا ملنا ٹکرنے کے بعد ان کا بنیادی فرق اور دونوں ملکوں کے زاویہ نظر کا اختلاف واضح ہو جاتا ہے۔

گذشتہ سطور میں کئی مرتبہ اس کا اعادہ کیا جا چکا ہے کہ ۲۶۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو

ہندوستان کے ساتھ ریاست جموں اور کشمیر کے الحاق کے بعد اس ریاست کے دفاع کی

تمام تر ذمہ داری ہندوستان پر عاید ہو گئی تھی۔ اس لئے وہ اپنے اس مطالبے میں قلعہ

حق بجانب تھا کہ کشمیر میں جنگ کو فوراً بند کر دیا جائے اور استصواب رائے عامہ کی تکمیل تک

ہندوستان فی افواج مقبول اور مناسب تعداد میں وہاں مقیم رہیں۔ اور چونکہ پاکستان نے

1. S/P. V. January 1948, Pp. 266-267

2. S/P: V. 736, Jan. 28, 1948, Pp. 267-268

کشمیر پر حملہ کرنے میں حملہ آوروں کی مدد کی جاتی تھی اس لئے پاکستان کو اپنے اڈے سے کام لے کر ان حملہ آوروں کو واپسی پر آمادہ کرنا چاہیے اور اس انگلیشات کے بعد کہ پاکستان کی باقاعدہ افواج بھی کشمیر کی سرزمین پر موجود ہیں اس کی طرف سے اس بات کے مطالبہ کو بھی غیر حتمی بجانب ہمیں قرار دیا جاسکتا کہ ان پاکستانی افواج کو بھی واپس چلا جانا چاہیے۔

پاکستان بھی ریاست میں قیام امن کی ضرورت کا منکر نہیں تھا لیکن ہندوستان کے برعکس وہ قیام امن کے مقصد کو بنیادی اور مقدم ترین مقصد نہیں سمجھتا تھا اور چونکہ وہ ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کو بھی تسلیم نہیں کرتا تھا اس لئے وہ کشمیر سے متعلق ہندوستان پر عاید ہونے والی ذمہ داریوں کا منکر بھی تھا اس لئے اس کا مطالبہ یہ تھا کہ کشمیر میں امن قائم کرنے اور جنگ بند کرانے کے لئے قبائلی حملہ آوروں کو بے نام نہاد آزاد کشمیر کو اس بات کا یقینی دلایا جائے کہ الحاق کے سوال پر کشمیر کے باشندوں کی رائے معلوم کرنے کے لئے استصواب بین الاقوامی انتظام کے ماتحت کر لیا جائے گا اور اس تجویز کا مات ملے گا کہ اول تو پاکستان قبائلی حملہ آوروں کو واپسی کے لئے آمادہ کرنے کے سلسلہ میں خود کوئی ذمہ داری قبول نہیں کرنا چاہتا دوسرے وہ قبائلی حملہ آوروں کو بھی اس تنازعہ میں ایک فریق کا درجہ دلانا چاہتا ہے اور تیسرے استصواب کے معاملہ کو پوری طرح بین الاقوامی انتظام کے ماتحت دے کر ایک جانب تو کشمیر کی جائز اور قانونی حکومت کو اس معاملے میں بالکل مفلوج کر دینا چاہتا تھا اور دوسری طرف ہندوستان کو کشمیر کے دفاع اور تحفظ کے قانونی حق سے محروم کر دینا چاہتا تھا۔

بہر حال مجلس تحفظ کی طرف سے اصل شکایت کو نظر انداز کر دئے جانے اور کشمیر کے سوال کو طے کرانے کے لئے پاکستان کی جانب سے یہ الجھی ہوئی اور متضاد تجاویز پیش کئے جانے کے باوجود ہندوستان اس تنازعہ کو طے کرانے کی جدوجہد میں مصروف رہا۔

اور جیسا کہ آئندہ صفحات کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ وہ ان تجاویز کو قبول کرتا رہا جو اس سلسلہ میں ادارہ اقوام متحدہ کی جانب سے طے کی جاتی رہی تھیں اور ان ہی صفحات کے مطالعہ سے یہ بات بھی واضح ہو سکے گی کہ ادارہ اقوام متحدہ کے زاویہ نظر سے مسئلہ بھی نہ کیوں طے نہیں ہو سکا ہے۔

آٹھواں باب

ابتدائی بحث کے نتائج

ہندوستان نے گنتیہ کے معاملہ کو مجلس تحفظ کے زیرِ مہم ۳۰ دسمبر ۱۹۴۷ء کو پیش کیا تھا۔ اس طرح یہ معاملہ بارہ سال سے مجلس تحفظ کے زیرِ غور ہے اور وہ اسے طے کرانے کے لئے مختلف اوقات میں مختلف اقتادات بھی کرتی رہی ہے جنہیں یہاں تفصیل کے ساتھ بیان کرنا ممکن نہیں ہو سکتا لیکن اس معاملہ کی موجودہ نوعیت کو سمجھنے کے لئے مجلس تحفظ کی کارروائیوں کو پیشِ نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ خصوصاً اس مسئلہ پر مجلس تحفظ میں جو ابتدائی بحث ہوئی تھی اس کے نتائج آج تک اس سوال پر اثر انداز ہو رہے ہیں اس لئے مجلس تحفظ کی کارروائیوں کا مختصر تذکرہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

مجلس تحفظ نے ہندوستان کی شکایت موصول ہونے کے بعد جو پہلا رسمی قدم اٹھایا تھا وہ دونوں ملکوں کے نام اس کے صدر کی ایک اشد فروری اپریل مئی۔ یہ اپریل ۶ جنوری ۱۹۴۸ء کو دونوں ملکوں کی حکومتوں کے نام بھیجی گئی تھی اور اس میں کہا گیا تھا کہ — دونوں ملکوں کو حالات کو مزید پیچیدہ بنانے سے احتراز کرنا اور انہیں ان کی موجودہ صورت ہی پر برقرار رکھنا چاہیئے — اور ۱۷ جنوری ۱۹۴۸ء کو اس نے ایک قرارداد منظور کر کے

دونوں ملکوں کو اس امر پر توجہ دلائی تھی کہ وہ :

”کوئی ایسا بیان دینے اور کوئی ایسا کام کرنے سے پرہیز کریں جس سے حالات کے مزید غراب ہونے کا احتمال ہو اور ایسی حالت میں کہ یہ معاملہ مجلس تحفظ کے زیرِ غور ہے اگر حالات میں کوئی اہم تبدیلی واقع ہو یا اس کے وقوع کا امکان ہو یا پھر کوئی ایسی تبدیلی رونما ہو رہی ہو تو اس کی اطلاع فوراً مجلس تحفظ کو دیں۔“

اسی روز برطانوی مندوب کی تحریک پر یہ تجویز بھی منظور کی گئی کہ ”مجلس تحفظ کے صدر کو فریقین سے تبادلہ خیالات کر کے کوئی ایسی صورت نکالنے کی کوشش کرنی چاہیے جسے فیصلہ کی بنیاد بنایا جاسکے۔“

اور پھر تیسرے روز ۲۰ جنوری ۱۹۴۷ء کو مجلس تحفظ نے اپنی وہ قرارداد منظور کی جس کے تحت اس سلسلہ میں اقوام متحدہ کے تین اراکین پر مشتمل ایک کمیشن کے تقرر کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اس کمیشن کے دو اراکین کے انتخاب کا حق علمبرہ ہندوستان اور پاکستان کو دیا گیا تھا اور تیسرے رکن کے انتخاب کو دونوں ملکوں کے منتخب نمائندوں کے اتفاق رائے پر مقرر رکھا گیا تھا اور اس کمیشن کے دائرہ عمل میں جن امور کو شامل کیا گیا تھا ان میں سے پہلی بات یہ تھی کہ وہ —

اس امر کی تحقیقات کرے کہ اس تنازعہ میں وہ حقائق موجود ہیں یا نہیں جن پر اقوام متحدہ کے منشور (چارٹر) کے دفعہ ۳۸ کا اطلاق ہوتا ہے اور دوسری بات یہ تھی کہ وہ فیصلہ کی راہ میں حائل

1. S/651, 17.1.48

2. S/P. V. 229, P. 125

۳۔ ادارہ اقوام متحدہ کے منشور کے دفعہ ۳۸ کے تحت یہ ہے کہ : مجلس تحفظ ایسے ہر تنازعہ اور ایسی صورتحال کی تحقیقات کر سکتی ہے جس کی بدولت بین الاقوامی اختلافات کا اندیشہ ہو یا جس کی بنا پر کوئی تنازعہ برپا ہو سکتا ہو۔ تاکہ وہ اس نتیجہ پر پہنچ سکے کہ اگر یہ تنازعہ قائم رہا یا یہ صورت حال جاری رہی تو اس سے بین الاقوامی امن اور سلامتی خطرے میں تو نہیں پڑ جائے گی !

مشکلات کو دور کرنے میں پہلے انٹرو سرورج سے کام لے اور ان ہدایات پر عمل درآمد کرے جو مجلس تحفظ کی طرف سے اسے دی جائیں اور اس طرح ہندوستان کی امن و شکایت کی حیثیت محض ثانوی ہو کر رہ گئی۔

اس کے بعد ۲۲۔ جنوری ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کی مخالفت کے باوجود مجلس تحفظ نے کثرت رائے سے اس تنازعہ کے ابتدائی عنوان ”جموں اور کشمیر کے سوال کو بدل کر اسے ”ہند اور پاکستان کے سوال“ کے نام سے موسوم کر دیا اور اس طرح ہند اور پاکستان کو ایک ہی سطح پر لا کھڑا کیا۔ چنانچہ مجلس تحفظ کی اکثریت نے اسی رویہ اور فیصلہ کی بنیاد پر چند مضمون کے بعد سرگھڑا لٹل خاں نے مجلس تحفظ میں ایک تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ”کثیر کے سوال کو بھی مجلس تحفظ کے رویہ و مروت ہندوستان ہی نے نہیں بلکہ ہند اور پاکستان دونوں نے پیش کیا ہے۔“

لیکن ظاہر ہے کہ ہندوستان اس معاملہ میں پاکستان کی مساوی حیثیت کو تسلیم نہیں کر سکتا تھا اور جیسا کہ آئندہ واقعات سے ثابت ہوگا اس مرحلہ پر ہندوستان کو مجلس تحفظ کی اکثریت اور پاکستان کے زائد غیر نھرتے جو اختلاف پیدا ہو گیا تھا وہی اختلاف مجلس اقوام میں اس سوال کے فیصلہ کی راہ میں حاصل رہا ہے۔

گذشتہ باب میں یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ ہندوستان نے اس تنازعہ کو طے کرنے کے لئے مجلس تحفظ کے رویہ و جو تجاویز پیش کی تھیں ان میں کثیر کی جنگ کو فوراً ختم کر دے جانے کو اولین مقصد قرار دیا تھا۔ اس کے برعکس پاکستان استصواب رائے کو بنیادی مقصد قرار دلاتا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس معاملہ میں بھی مجلس تحفظ کی اکثریت کا بھان پاکستان ہی کے مطالبہ کی طرف رہا۔ چنانچہ ہند اور پاکستان کی انتخاب ویز پر بحث کے

دوران میں ہر قانونی مزدوب مشر نو دل بیکر نے کہا تھا کہ :

” میری رائے میں لڑائی کو ختم کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ جو لوگ لڑائی میں معروف ہیں انہیں اس بات کا یقین دلایا جائے کہ ایک ایسا من سب قیصلہ ہو جائے گا جس کے ماتحت ان کے حقوق کا تحفظ ہو سکے گا۔ دوسرے الفاظ میں..... جب جنگ میں معروف عناصر اپنے مستقبل کے متعلق مطمئن ہو جائیں گے تب وہ لڑائی سے دست کش ہونے پر رضامند ہوں گے۔“

اسی موقع پر یحیٰی کے نمائندہ نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ چونکہ جنگ بندی اور استعواب رائے کے سوالات ایک ہی مسئلے کے دو پہلو ہیں اس لئے ان میں کسی ایک کو دوسرے پر مقدم نہیں لکھنا چاہیئے اور اس سلسلہ میں اس نے یہ دو قراردادیں پیش کی تھیں کہ :-
(۱) مجلس تحفظ اپنی نگرانی میں استعواب رائے عامہ کی تیاری کرے
اور اسے انجام تک پہنچائے

(۲) مجلس تحفظ کے مقرر کردہ کمیشن کو ہدایت کی جائے کہ اس کے جو فرائض مقرر کئے گئے ہیں ان میں وہ اقدامات بھی شامل ہیں جن کی بدولت تصادم اور تشدد کے واقعات کے بند ہونے کی صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔

اور ان قراردادوں کی حمایت کرتے ہوئے متحدہ امریکہ کے مزدوب نے کہا تھا کہ
کوئی شخص بھی یہ نہیں چاہتا کہ کشمیر پر حملہ کرنے والوں کو دباؤ سے نکلنے کے لئے ان سے قوی تر فوج کو دباؤ میں لایا جائے۔

پھر ہم - فروری ۱۹۷۱ء کو امریکہ ہی کے سندوب سٹراسٹی نے مجلس کے روبرو تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ

” لڑائی کے بغیر قبائلیوں کو بمبوں اور کشمیر سے نکال لینا یا واپسی پر آمادہ کرنا کس طرح ممکن ہو سکتا ہے ؟ اور اگر قبائلیوں کو اس بات کا یقین نہ دلایا جاسکا کہ ایک عبوری حکومت کے ماتحت جو بظاہر بالکل غیر جانبدار ہوگی، غیر جانبداری کے ساتھ استصواب رائے عامہ کو پایا جائے گا تو پھر انہیں لڑائی کے بغیر واپسی پر آمادہ کرنا ممکن نہیں ہو سکتا۔“

ان تمام حوالوں کے پیش نظر یہ سمجھ لینا کچھ مشکل کام نہیں رہ جاتا کہ کشمیر کے سوال پر بحث و غور کے اس ابتدائی مرحلہ ہی میں نہ صرف ہندوستان کی حقیقی شکایت ہی کو نظر انداز کر دیا گیا تھا اور اسے دوسرے غیر متعلق مسائل کے ساتھ مخلوط کر کے اسے نازی درجہ سے دیا گیا تھا بلکہ اس امر کی کوشش بھی کی جاتی رہی تھی کہ پاکستان کے علاوہ قبائلی حملہ آوروں کو بھی اس تنازعہ میں ہندوستان کے مساوی درجہ دے کر جنس متنازعہ کا ایک فریق تسلیم کر لیا جائے۔

بہر حال پاکستان بلیم کی ان قراردادوں کو صرف اس لئے منظور کر لینا چاہتا تھا کہ یہ دونوں اس کے مفید مطلب تھیں لیکن ہندوستان انہیں اس بنا پر مسترد کر دینا چاہتا تھا کہ اول تو ان میں جنگ بندی کے متعلق کوئی واضح ہدایت موجود نہیں تھی اور دوسرے ان میں اس کی پیش کردہ تجاویز کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ اس پر تقریر کرتے ہوئے سٹراگوپال اسماعیل نے کہا تھا کہ

” ہم نے فیصلہ کے لئے اپنی جو تجاویز پیش کی تھیں ان میں اس

سوال (جنگ بندی) کو مقدم جسگہ دی مٹی لیکن ہم نے جس کام کے لئے کوشش کی مٹی اسے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ ہم نے ایک ٹھوس تجویز پیش کی تھی لیکن اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لی گئی ہیں اس کی بجائے مجلس کے روبرو جس قرارداد کا مسودہ پیش کیا گیا ہے اگر ناگوار نہ گزرے تو میں کہنا چاہتا ہوں کہ وہ انتہائی حد تک بے معنی ہے۔

اس کے بعد انھوں نے اس قرارداد کے مبہم الفاظ پر سخت تنقید کرنے کے بعد دریا کیا تھا کہ:

”کیا ہم فوری سوال یعنی جنگ بندی کے سوال کو حل کرنے کے قریب پہنچ رہے ہیں؟ اور اس وقت جبکہ ہندوستان میں آگ لگی ہوئی ہے کیا ہماری یہ پہل باتیں وقت ضائع کرنے کی ایک روشن مثال نہیں ہے۔“

اور اس کے بعد جب ہندوستان کے مندوب نے یہ درخواست کی کہ اسے دہلی جا کر اپنی حکومت سے مشورہ کرنے کی ہمت دی جائے اور اس مسئلہ پر بحث کو چند روز کے لئے ملتوی کر دیا جائے تو اس کا اس درخواست کی بھی مخالفت کی گئی تھی کہ اس واقعہ سے متاثر ہو کر پیپلز جوائنٹ ٹریڈ یونین ہندوستان کو بھی ۱۵ فروری ۱۹۴۷ء کو بحال میں اس خیال کا اظہار کرنا پڑا تھا کہ:-

”ہمارے پیش کردہ سوالات پر سیدھے سادے طریقے سے بحث کرنے

اور انھیں اسی طرح سے طے کرنے کی بجائے وہ قومیں جن پر یہ جماعت

(مجلس تحفظ) مشق ہے اقتدار پسندانہ سیاست میں گم ہو کر رہ گئی ہیں۔“

مختصر یہ کہ اس ناسازگار ماحول کے باوجود مسٹر سنگھ مجلس تحفظ کو اپنا نفع و منفعت سمجھانے میں

1. S/P. V. 237, 29 J. 43, Pp. 295 296

2. The Times of India, 16.2.48

کا میاب ہو گئے اور اس مسئلہ پر بحث کو دھستوں کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔

اس التوا کے فائدہ پر ۱۸ مارچ ۱۹۵۹ء کو کشمیر کا سوال دوبارہ مجلس تحفظ کے زیر بحث آیا اور اس موقع پر چین (فارموسا) کے مندوب مٹر سیانگ نے جو قرارداد پیش کی اس کی بعض غامیوں کے باوجود ہندوستان اسے اس بنا پر منظور کرنے کے لئے رضامند تھا کہ اس میں پاکستانی کے مطالبہ استعصا اب رائے کے ساتھ ہندوستان کی خواہش جنگ بندی کو بھی نظر رکھا گیا تھا۔ اس قرارداد میں

پاکستان سے کہا گیا تھا کہ وہ قبائلیوں کو مزید امداد دینا بند کر دے اور ہندوستان کو اس بات کی اجازت دی گئی تھی کہ وہ لڑائی ختم ہو جانے سے بعد کشمیر کے تحفظ اور وہاں امن اور قانون کو برقرار رکھنے کے لئے اپنی مسلح افواج کے کچھ حصہ کو وہاں رکھ سکتا ہے۔ کشمیر کی عبوری حکومت سے کہا گیا تھا کہ اسے بڑی بڑی سیاسی جماعتوں کے نمائندوں کو بھی شریک کرنا چاہیے اور اس کا مطلب آزاد کشمیر کے نمائندوں کی شرکت تھا، استعصا رائے کا کہ اسے ایک جدا گانہ نظام قائم کرنے کی سفارش کی گئی تھی لیکن اسے رسمی طور پر حکومت کشمیر کا ایک شعبہ قرار دیا گیا تھا۔ یہ تجویز کی گئی تھی کہ اس شعبہ کا منظم و نسق، اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل کے مترکرہ ایک شخص کے ماتحت رہے اور اگرچہ اسے تمام اختیارات حکومت کشمیر کی تفویض کر دیے گئے لیکن وہ اپنے کاموں میں بالکل آزاد رہے گا۔

لیکن بعض اسباب کی بنا پر یہ قرارداد بھی منظور نہیں ہو سکی اور ایک ماہ بعد ۲۱ اپریل ۱۹۵۹ء کو مجلس تحفظ نے جوئی تجویز منظور کی وہ اس قرارداد کی مسخ شدہ شکل تھی اور اس کی رٹ سے

”مجلس تحفظ کے مقرر کردہ کمیشن کو بین الاقوامی کی بجائے پانچ افراد پر مشتمل کر دیا گیا تھا۔ دو زامدارا کیوں کے انتخاب کا حق مجلس تحفظ کے لئے مخصوص رکھا گیا تھا۔ یہ بات طے کی گئی تھی کہ جس رکن کے انتخاب کا اختیار ہند اور پاکستان کے منتخب کردہ اراکین کو دیا گیا ہے اگر وہ اس کے انتخاب پر متفق الٹے نہ ہوں تو اسے مجلس تحفظ کا سہارا نہ دے۔ کمیشن کو فوراً برصغیر ہند روانہ ہو جانے کی ہدایت کی گئی تھی اور اسے اس بات کی ہدایت بھی کی گئی تھی کہ وہ قیام امن اور استعصواب رائے کے سلسلہ میں دونوں ملکوں کی حکومتوں کے روبرو اپنی خیر سگالانہ خدمات پیش کرے۔“

اور اس قرار داد پر اظہار خیال کرتے ہوئے چین کے مندوب نے کہا تھا کہ،

”اس قرار داد میں استعصواب رائے عامہ کو محراب کی حیثیت حاصل ہے۔۔۔ اور اس کا ہمیشہ حصہ استعصواب رائے عامہ کو ایسا زامدارانہ اور غیر جانبدارانہ بنانے کے خیال پر مبنی ہے۔“

مجلس تحفظ کی اس قرار داد کی تشریح کرتے ہوئے سٹریٹنبرگ نے لکھا ہے کہ،
 رد افواج کی واپسی کے سلسلہ میں مجلس قوت نے ہندوستان کے نقطہ نظر کا خیال رکھا تھا اور پاکستان سے کہا تھا کہ وہ قبائلیوں اور ان پاکستانیوں کو کشمیر سے واپس چلے جاتے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرے جو کشمیر کے باشندے نہیں ہیں۔ جو لوگ کشمیر میں رہ رہے ہیں انہیں مدد دینے سے گریز کرنا۔“

1 S/726, 22.4.48

2. S/P V 284, 17.4.48, p. 5.

ریاست میں ان کے داخلہ کو روک دے۔ اس کے برعکس حکومت کشمیر میں ان کا قانون کو برقرار رکھنے میں مدد دینے کی غرض سے وہاں ہندوستان کو کم از کم "فوج رکھنے کی اجازت دی گئی تھی اور باقی ماندہ ہندوستانی فوج کی واپسی کو کمیشن کے مشورہ پر منحصر کر دیا گیا تھا۔ پاکستان کو داخلہ طور پر اس سے مستثنیٰ کر دیا گیا تھا اور اسے حمایت کی گئی تھی کہ وہ اپنی افواج کی واپسی کا کام اس وقت شروع کرے جب کمیشن کو ان باتوں کا اطمینان ہو جائے کہ قبائلی واپس جانے لگے ہیں اور جنگ بندی کے استقامت موثر ہو چکے ہیں۔

جمہوری حکومت کے سلسلہ میں ہندوستان کا مطالبہ یہ تھا کہ ذمہ دار حکومت کو بحال رکھا جائے اور پاکستان ایک غیر جانبدار عارضی حکومت کے قیام پر منحصر تھا اور اس قرارداد میں ان دونوں نظریوں کو یک جا کرنے کے لئے ہندوستان کو اس بات کا یقین دلانے کی دعوت دی گئی تھی کہ کشمیر کی حکومت وناں کی بڑی سیاسی جماعتوں (آزاد کشمیر اور نیشنل کانفرنس) کے نمائندوں پر مشتمل ہونے والی اور اسی کے ماتحت استصواب رائے کی تیاری اور تکمیل کرائی جائے گی۔

استصواب رائے کے سلسلہ میں پاکستان کا نظریہ یہ تھا کہ اس کے تمام انتظامات کو بین الاقوامی کنٹرول میں رہنا چاہیے۔ اس زاویہ نظر سے یہ قرارداد واضح طور پر پاکستان کے مطالبہ کی تائید کرتی تھی اور یہ بات استصواب رائے حاکم کے ناظم کے اختیارات کی تشریح اور تفسیر سے اسی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس کی "خود مختاری" کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ اگرچہ اس کے تقرر کا اختیار وہی حور پر حکومت کشمیر کو دیا گیا تھا لیکن اس نامزدگی یا انتخاب کا حقیقی اختیار اقوام متحدہ کے

سکرٹری جنرل ہی کو حاصل تھا۔ پھر اس کا تعلق براہ راست کمیشن کے ساتھ اور اس کے توسط سے مجلس تحفظ کے ساتھ رکھا گیا تھا اور اسے اس کے عمل کے انتخاب اور تقرر کا اختیار بھی دیا گیا تھا۔ پھر ناظم استصواب رائے کو اس کے فرائض کی ادائیگی کے سلسلہ میں بھی غیر محدود اختیارات دئے گئے جیسے مثلاً (الف) ریاستی حکومت کو (ب) امر کا پابند بنایا گیا تھا کہ وہ ناظم استصواب رائے کو وہ تمام تر اختیارات دے گی جو ناظم استصواب رائے کے خیال میں استصواب رائے کے لئے ضروری ہوں گے۔ اسے مرثا اسی مقدمہ سے ریاستی فوج اور پولیس کو ہدایات دیے اور ان کی بکثرت کرنے کا اختیار بھی دیا جائے گا (ب) اسے استصواب رائے کو رائے کے لئے جتنی فوج کی ضرورت ہوگی وہ ہندوستان ہتیا کرے گا (اورج)۔ ریاستی حکومت ایسے تمام مقدمات کی جماعت کے لئے جو غیر جانبدارانہ استصواب رائے پر اثر انداز ہو سکے ہیں، ناظم استصواب رائے کو اسپیشل مجسٹریٹ کی ایک جماعت ہتیا کرے گی۔

اور اس قرارداد پر بحث کے دوران میں مسٹر گوپالا سوای آسنگ نے ہندوستان کے ذریعہ منظر کو ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ:-

”بنیادی ضروریات کے لحاظ سے اس قرارداد میں مسٹر سیا سنگ کی تجویز کی شکل کو بالکل ہی بدل دیا گیا ہے۔۔۔۔۔ اس لئے ہم اس قرارداد کے ساتھ اتفاق رائے نہیں کر سکتے۔“

اور اپنی اس تقریر میں انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ

”دہلاری حقیقی شکایت کو اس مرد مہری کے ساتھ نظر انداز کر دئے جانے سے ہمیں، ہماری حکومت اور میری قوم کو سخت صدمہ پہنچا ہے۔ ہندوستان کی شکایت پر یہ وقت کوئی قدم اٹھانے کی بجائے تقریباً چلہ ماہ تک تو اسے سرد خانہ میں رکھا گیا اور اس چار ماہ کی مدت میں مسلسل خوریزی اور اقتصادی تباہی جاری رہی اور اب اس مدت کے خاتمہ پر ہمیں ایک ایسی قرارداد کو قبول کر لینے کی نصیحت کی جا رہی ہے جس میں ہمارے مقدمہ کے حقائق کو تسلیم کرنے میں سخت سے کام لیا گیا ہے اور جس کے الفاظ پاکستان کے اقدامات کے سلسلہ میں مبہم اور غیر واضح ہیں۔ پھر ان الفاظ کی وضاحت کرتے ہوئے تو مجلس تحفظ اور بھی اگے بڑھ گئی ہے اور پاکستان کو اس کا فرض یاد دلاتے ہوئے معذرت خواہی کی مدت تک پہنچ گئی ہے۔ اور ہندوستان اپنی عزت کے پیش نظر اپنے مقدمہ کے ساتھ اس طرز عمل سے اتفاق پائے نہیں کر سکتا۔“

اس موقع پر ہندوستان کے مندوب نے اس قرارداد کی مخالفت ہی پر اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ ان دو مفروضات کی تردید بھی کی تھی کہ ہندوستان کے ساتھ کشمیر کا لاق استوار ہے کے نتیجہ کے ساتھ مشروط ہے اور یہ کہ کشمیر کے تنازعہ میں ہندو اور پاکستان مساوی درجہ کے فریق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے کہا تھا کہ:-

”الحاق بالکن قانونی فیصلہ کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ فیصلہ اس صورت میں تو ضرور ہو سکتا ہے جب استعمار رائے کا نتیجہ پاکستان کے حق میں برآمد ہو۔“

اس لئے پاکستان کو استصواب رائے کے انتخابات میں شرکت کا حق نہیں پہنچتا
مزید برآں جنگ بندی کے بعد پوری ریاست کو کشمیر کی آئینی حکومت کے زیر انتظام
آ جانا چاہیئے (دوسرے ہندوستان اپنی تمام ترقی حلقوں (ریاستوں) کی موافقت
کا ذمہ دار ہے اس لئے اسے ریاست کے اس حصہ میں بھی اپنی افواج رکھنے
کا حق حاصل ہے جو فی الحال (نام نہاد) آزاد کشمیر کے زیر انتظام ہے۔"

اور آخر میں انہوں نے کہا تھا کہ :

(الف) موجودہ کشمکش کے دور میں مشترکہ حکومت منظم و نسق کو مفلوج
کر دے گی۔ پھر بھی ہندوستان بڑی سیاسی جماعتوں کو حق نمائندگی دینے پر آمادہ
نہیں کرتا لیکن ان کا انتخاب ریاست کے وزیر اعظم کریں گے۔
(ب) ہندوستان کو ریاست میں کم از کم 'فوج رکھنے کا جو حق دیا گیا ہے
اس کے ماتحت ہندوستانی فوج کی تعداد کو امن اور قانون کو برقرار رکھنے کے لئے
نہیں بلکہ بیرونی حملہ کی موافقت کے لئے بھی کافی ہونا چاہیئے۔"

اسی سلسلہ میں انہوں نے ناظم استصواب رائے کو وسیع تر اغنیا رات دئے جانے کی مخالفت
کرتے ہوئے کہا تھا کہ :-

"ناظم استصواب رائے کو استصواب رائے سے پہلے ہی ریاستی فوج اور
پولیس پر حاکم نا اختیارات کیوں دے جانے چاہئیں؟ اور اسے پاکستان کے ساتھ
مراسلت کا حق کیوں ملنا چاہیئے؟ ناظم استصواب رائے درحقیقت حکومت کشمیر
کا ایک افسر ہوگا جسے ایک ایسی بیرونی حکومت کے ساتھ براہ راست مراسلت
کا حق دیا جانا چاہئے استصواب رائے بین کوئی دخل حاصل نہ ہوگا سیاسی اور انتظامی

دونوں طرف سے فرما سب ہے۔"

اردان اعدا اذات نیز بعض دیگر اسباب کی بنا پر ہندوستان نے اس قرارداد کو مسترد کر دیا تھا،

لیکن اس کے ساتھ ہی مسٹر اسٹون نے کہا تھا کہ

"ہماری طرف سے اس قرارداد کو مسترد کرنے کے باوجود اگر مجلس تحفظ

اپنے مجوزہ کمیشن کو بھیجے گا فیصلہ کرے گی تو ہندوستان اس کے ساتھ باجیت

اور تبادلہ خیالات کرنے سے گریز نہ کرے گا۔"

دوسری طرف پاکستان بھی شدہ پاکر اس قرارداد کو غیر اطمینان بخش کہنے لگا۔ چنانچہ

سرفراز اللہ خاں نے اس قرارداد کے متعلق جو کچھ کہا تھا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ — جنوری

اور فروری میں اس سوال پر بحث کے دوران میں اراکین مجلس تحفظ کا عام رجحان یہ تھا کہ ریاست

کی عارضی حکومت کو قطعاً عزیز جاننا چاہیئے۔ استصواب رائے تمام فریقوں کو غیر طرفدارانہ

معلوم ہونی چاہیئے۔ تمام باقاعدہ اور بے قاعدہ مسلح افواج کو ریاست سے چلا جانا چاہیئے

اور افواج کی یہ واپسی ہند اور پاکستان دونوں ملکوں کے فوجی باقی کمانڈوں کے اشتراک سے عمل

میں آئی چاہیئے۔ لیکن ۲۱-۲۲ اپریل ۱۹۴۷ء کی اس قرارداد میں ان مسئلہ باقوں میں سے ایک بات

بھی موجود نہیں ہے — اور انھوں نے اس قرارداد کے بعض مخصوص حصوں پر تبصرہ

کرتے ہوئے کہا تھا کہ :

مجلس تحفظ نے اس بات کا اعلان کیا تھا کہ قیامیوں کی واپسی اس شرط

کے ساتھ شرط ہوئی چاہیئے کہ انھیں اس بات کا یقین دلایا جائے کہ

غیر جانبدارانہ استصواب رائے لایا جائے گا لیکن اس لحاظ سے یہ قرارداد

نقص ہے۔ پھر اس کام کے لئے ایک مشینری کی موجودگی بھی ضروری ہے۔

د اس نے انھوں نے تجویز کیا تھا کہ پاکستان کو کشمیر میں فوج اور پولیس رکھنے یا پھر فوج یا پولیس بھیجے کی اجازت دی جائے۔ (انھوں نے بڑا فی ختم کو اسے کہے تھے ہند اور پاکستان کے درمیان اشتراک عمل کی تجویز بھی پیش کی تھی اور کہا تھا کہ) ہندوستانی افواج کو ایک اتفاق رائے سے لے کر خط سے آگے نہیں بڑھنا چاہیئے۔ عارضی حکومت کے سلسلہ میں انھوں نے کہا تھا کہ یہ قرارداد ملیم ہے۔

اور اس طرح پاکستان نے بھی اس قرارداد کو نافذ کر دیا تھا۔
بہرحال کشمیر کے متعلق اس مرحلہ پر مجلس تحفظ نے ۳۰ جون ۱۹۴۷ء کو جو رخصتی قرارداد منظور کی تھی اس میں کمیشن کو ہدایت کی گئی تھی کہ

"پاکستان کے وزیر خارجہ نے اپنے مراسلہ مورخہ ۱۵ جنوری ۱۹۴۷ء میں جو سوالات اٹھائے ہیں وہ جس وقت بھی مناسب سمجھے ان مسائل کا مطالعہ کر کے اپنے مطالعہ کے نتائج سے مجلس تحفظ کو مطلع کرے۔"

اس طرح کشمیر کے تنازعہ کے اس ابتدائی مرحلہ کے آخر میں مجلس تحفظ نے مذکورہ بالا قرارداد منظور کر کے پاکستان کے اس نظریہ کو تسلیم کر لیا کہ (اس کے زیر غور صرف کشمیر ہی کا سوال نہیں بلکہ ہند اور پاکستان کے باہمی پیدا شدہ تمام تنازعات ہیں۔ ہندوستان کے لئے یہ صورت حال ناقابل قبول تھی چنانچہ ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اس صورت حال کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے مجلس تحفظ کو اطلاع دی تھی کہ

"حکومت ہند کمیشن کے دائرہ عمل کو وسیع کر دئے جانے کے خلاف شدید

1. S/P.V. 285/19.4.48, Pp. 20- 47, S/735, 8.5.48

2. S/819. 3.8.48

اجتناب کرتی ہے اور اس بات کو واضح کر دینا چاہتی ہے کہ وہ اس کے ساتھ
اتفاق رائے نہیں کرتی۔

سلطان آباد میں مجلس تحفظ کی جن کارروائیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے ان کے مطالعہ سے یہ
امور واضح ہو جاتے ہیں کہ وہ ابتدائی سے ہندوستان کی بنیادی شکایت کو نظر انداز کرتی رہی
تھی اور وہ اسے دوسرے غیر متعلق مسائل کے ساتھ وابستہ کر کے اس کی اہمیت کو کم کر دینا
چاہتی تھی حتیٰ کہ مجلس تحفظ کے بعض ممتاز اراکین قبائلی حملہ آوروں کو بھی عللاً ایک مسئلہ
ذہنی کی حیثیت دے دینا چاہتے تھے۔ ہندوستان اس مرحلہ میں بار بار یہ اعلان کرتا رہا تھا
کہ اس نے اپنے ساتھ کثیر کا افاق منظور کرتے ہوئے اپنے جمہوری مسلک کے ماتحت
استغواب رائے حاصل کرانے کی جو رضا کارانہ پیش کش کی تھی وہ اس پر قائم ہے لیکن وہ
جنگ بندی کو مقدم سمجھتا ہے مگر پاکستان کا اصرار یہ رہا تھا کہ جب تک استغواب رائے کے
متعلق اس کے زاویہ نظر کے مطابق اطمینان بخش فیصلہ نہ ہو جائے جنگ بندی ممکن نہیں
ہو سکتی۔ پھر ہندوستان اس معاملہ میں پاکستان کو اپنے برابر کا فریق تسلیم کرنے کے لئے
بھی تیار نہیں تھا اور مجلس تحفظ کے اس غیر حقیقت پسندانہ رویہ اور پاکستان کے غیر معقول
اعزاز کے خلاف، غیر مبہم الفاظ میں اپنے عدم اتفاق رائے کا اظہار کرتا رہا تھا۔ اس نے
اس بات پر کوئی تعجب محسوس نہیں کیا جانا چاہیے کہ اس نے ۲۱۔ اپریل ۱۹۴۷ء اور اس کے
بعد جون ۱۹۴۷ء کی قراردادوں کو نامنظور کر دیا تھا اور وہ اس تحفظ کے ان ابتدائی
فیصلوں کی جن خامیوں کو محسوس کرتا تھا وہ لارڈ برٹ وڈ کے الفاظ میں یہ تھیں کہ مجلس تحفظ
نے ان فیصلوں میں۔

نہ تو کسی طحس نتیجہ پر پہونچنے کی کوشش کی تھی اور نہ کوئی واضح فیصلہ

صادر کیا تھا۔ ان میں نہ تو ہندوستانی کے ساتھ کشمیر کے الحاق کے قانون پہلو پر کوئی تبصرہ کیا گیا تھا اور نہ پاکستان کو جارحانہ حملے کا مرتکب قرار دے کر اس کی مذمت کی گئی تھی۔

اور ای تمام باتوں کے باوجود چونکہ ہندوستان کشمیر کے تنازعہ کے فیصلہ کا خواہش مند تھا اس لئے نہ صرف اس نے کمیشی کے ساتھ تبادلہ خیالات کرنے جو پہرہ بادی کی کا اہلہ ساریا تھا بلکہ وہ اجیہا کہ آئندہ واقعات سے ثابت ہو سکے گا تصفیہ اور مصالحت کے ہر مرحلہ میں پیش پیش رہا تھا۔ لیکن جہاں وہ مصالحت کا خواہش مند تھا وہاں نہ تو اپنے اس قانونی حق سے دست بردار ہوا اسے الحاق کے بعد کشمیر پر حاصل تھا اور نہ ان ذمہ داریوں کو نظر انداز کر سکتا تھا جو کشمیر سے متعلق اس پر عائد ہو گئی تھیں۔ چنانچہ وہ اس معاملہ میں مجلس تحفظ کی مداخلت کے ہر دور میں ان ہی دو باتوں کو مد نظر رکھتا رہا تھا۔

بہر حال مجلس تحفظ نے کشمیر کے سوال پر بحث اور کارروائی کے اس ابتدائی مرحلہ میں ۲۰ جنوری ۱۹۴۱ء اپریل اور ۲ جون ۱۹۴۱ء کو جو قراردادیں منظور کی گئیں ان کی بنیاد پر اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندو اور پاکستان کا قیام عمل میں آیا تھا اور ان ہی قراردادوں کی بنا پر اس کے دائرہ عمل کا قیاس کیا گیا تھا۔

I. Two Nations & Kashmir. P. 91

اقوام متحدہ کے اس کمیشن کا سرکاری نام "اقوام متحدہ کا کمیشن برائے ہندو اور پاکستان" United Nations Commission for India & Pakistan

اور مختصر نام انہی (Unqip) تھا لیکن اس کتاب میں اس کا ذکر صرف کمیشن کے نام سے کیا گیا ہے۔

نواں باب

کمیشن کی سرگرمیاں اور جنگ بندی

مجلس تحفظ نے ۲۰ جنوری ۱۹۴۷ء کو کمیشن کے تقرر کا فیصلہ کیا تھا اور ہندوستان نے اس کے لئے ۱۰۔ فروری ۱۹۴۷ء کو چکی سلاوا کیہ کو اپنا نمائندہ منتخب کر لینے کا اعلان کر دیا تھا لیکن ۱۱۔ فروری ۱۹۴۷ء کے دوسرے ہفتہ سے پہلے یہ کمیشن اپنا کام شروع نہیں کر سکا۔ اس وقت میں ایک جانب تو اس کے اراکین کی تعداد کو بڑھا دیا گیا تھا اور دوسری طرف اس کے دائرہ عمل کو وسیع کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ ۲۱۔ اپریل کی قرارداد کے مطابق ۲۳۔ اپریل ۱۹۴۷ء کو مجلس تحفظ نے اس کے بے بیہم اور کو لمبیا کو کمیشن کا رکن مقرر کیا اور ۶۔ مئی کو پاکستان نے اپنی طرف سے ارڈیننس کے تقرر کا اعلان کیا اور چوں کہ ہند اور پاکستان دونوں ۲۱۔ اپریل کی قرارداد کو مسترد کر چکے تھے اس لئے، ۱۱۔ فروری ۱۹۴۷ء کو مجلس تحفظ کے صدر نے متحدہ امریکہ کو کمیشن کا پانچواں رکن مقرر کر دیا۔

یہ کمیشن جن ممالک پر مشتمل تھا ان کے نمائندوں کے نام حسب ذیل ہیں :-

ریکارڈو سیرے Ricardo-J. Siri

ارڈیننس

کیشن کی نگین کے بعد، اس کے ابتدائی تین ہفتے "جنیوا میں بسر ہوئے۔ اس مدت میں ایک طرف تو اس نے اپنی سرگرمیوں کا طریق کار اور کام کے مضابطہ مرتب کئے اور دوسری طرف حالات پر زیادہ سے زیادہ جوہر حاصل کرنے کے لئے ہند اور پاکستان کی حکومتوں کے ساتھ خط و کتابت کرتا رہا اور اس طرح ۵ جولائی ۱۹۴۷ء کو جنیوا سے برصغیر ہند کے لئے روانہ ہوا۔

کیشن کے تقریریں اس تناظر کی بدولت کشمیر کے مسئلہ میں جو مزید پیچیدگیاں پیدا ہو گئی تھیں اس پر جوزف کاربیل نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ماضی کے پیش نظر یہ امر بے حاد افسوس ناک ہے کہ ایک ایسے کیشن کو جس کے تقریر پر اتفاق رائے ہو چکا تھا بلا تاخیر مقررہ کر کے برصغیر ہند نہیں بھیجا گیا۔ اگر یہ کیشن لڑائی کو بند نہ بھی کرا سکتا تو کشمیر میں اس کی موجودگی ہی موسم بہار کی لڑائی اور دیکھ بھانہ پر فوجی اقدامات کو تو فروغ ہی مل سکتا۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا اور اقدامات کی یادداشتوں سے اس فروگزاشت کا کوئی سبب بھی معلوم نہیں ہوتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب زیادہ قوت کے ساتھ تصادم شروع ہو گیا ہے۔"

(فٹ نوٹ گذشتہ صفحہ سے آگے)

VADE-Kerehove	واڈی کرہوے	بلغیم
Joseph Korbel	جوزف کاربیل	چیکو سلاواکیہ
Alfredo Loyantl	الفریدو لوزانو	کولمبیا
J Klahr Huddle	جے کلر ہڈل	متحدہ امریکہ

مسٹر کابیل نے مذکورہ بالا سطور میں میں خوفناک تصادم کا ذکر کیا ہے اس کا پس منظر یہ ہے کہ خود پاکستان کے اعتراف کے مطابق اس مدت میں اس کی باقاعدہ افواج بھی کشمیر میں داخل ہو چکی تھیں اور اگرچہ ہندوستان پہلے ہی دن سے اس حقیقت سے باخبر تھا کہ پاکستان کی باقاعدہ افواج کشمیر کی لڑائی میں باقاعدہ طور پر حصہ لے رہی ہیں۔ چنانچہ ۷ ستمبر ۱۹۴۷ء کو مجلس آئین ساز کے دستور ساز اجلاس میں ہندوستان کے وزیر اعظم نے کمیشن کی سرگرمیوں کی پہلی یادداشت پر بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ :

”جہاں تک دنیا کا تعلق ہے کل شام کے چار بجے تک پاکستان اس کے سامنے اس بات سے انکار کرتا رہا تھا کہ کشمیر کے فوجی تصادم کے ساتھ کسی طرح بھی اس کا کوئی تعلق ہے۔ لیکن ہم جانتے تھے اس سلسلے میں تہایت واضح اور پختہ شہادت موجود تھی اور حقیقت تو یہ ہے کہ بڑی بڑی فوجوں کی نقل و حرکت کو پوشیدہ نہیں رکھا جاسکتا۔“

لیکن اگر اس بات کو فرض بھی کر لیا جائے کہ کشمیر پر جارحانہ حملے کے شروع ہی سے پاکستان کی باقاعدہ افواج اس میں حصہ نہیں لے رہی تھیں اور پاکستان کے اعتراف کے مطابق مئی ۱۹۴۷ء میں پاکستانی افواج کے تیز دیرین کشمیر میں بھیجے گئے تھے تو یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ اگر مجلس تحفظ ۱۹۴۷ء کو کمیشن کے تقرری وہ قرارداد منظور کرنے کے بعد ہی اس کمیشن کو مقرر کر کے اسے برصغیر ہندوستان کے دیہی تو پاکستان کو مئی میں اپنی باقاعدہ افواج کو کشمیر بھیجنے کا موقع نہ مل سکتا اور مجلس کے روبرو آج تک ان غیر ملکی افواج کو ہندوستان کی سرزمین سے واپس کرانے کی راہ میں جو مشکلات حائل ہیں وہ پیش دآئیں۔

مہر حال ۷ جولائی ۱۹۵۱ء کو کراچی پہنچنے کے بعد کمیشن کو پاکستان کے وزیر خارجہ

نے پہلی ہی ملاقات میں جماعتِ اطلاق دی تھی وہ یہ تھی کہ

”اس وقت کشمیر میں پاکستانی افواج کے تین ہاتھ ڈویژن موجود ہیں

اور ان ڈویژنوں کو مئی ۱۹۴۷ء کے نصف اول میں وہاں بھیجا گیا تھا۔“

اور پھر یہ۔ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان نے اس بات کا اعتراف کر لیا کہ فی الحال ”آزاد کشمیر“

فوج کی قیادت بھی پاکستانی فوج ہی کر رہی ہے۔ اور ان انگشتاوقات کے بعد مجلس تحفظ کا

پورا پورا احترام مدنظر رکھنے کے باوجود یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ کشمیر کے سوال پر غور و بحث

کے ابتدائی مرحلہ میں اس نے ہندوستان کی بنیادی شکایت کو ثانوی حیثیت دے کر جو فیصلے

کئے تھے وہ اپنی جگہ عقائد پر مبنی اور اصل مسئلہ کا صحیح حل پیش نہیں کرتے تھے۔

لارڈ ایرڈوڈ نے مجلس تحفظ کے ان فیصلوں کی صحت اور اجابت کو ثابت کرنے کے لئے

لکھا ہے کہ

مجلس تحفظ نے یہ فیصلے اقوام متحدہ کے منشور کے چھٹے باب کے پیش نظر

کے تحت۔ اس لئے مجلس صرف یہ کہہ سکتی تھی کہ ”یہ گرتا چاہیئے“ اور اسی لئے

اس کی سفارشات مخلصانہ توقعات ہی کی حیثیت رکھتی تھیں اور ان کی کامیابی

کا انحصار فریقین کی رضامندی ہی پر تھا۔“

لیکن کیا پاکستان کے مذکورہ بالا اعتراف کے بعد یہ بات مافوق نہیں ہو گئی تھی کہ ہندوستان کی

بجز اقوام متحدہ کے منشور کا چھٹا باب ۶ وفاق ۳۴-۳۸ پر مشتمل ہے اور ان دفعات میں

متنازعہ مسئلے کو پورا امن طریقوں پر طے کرنا اور انھیں طے کرانے کے سلسلہ میں مجلس تحفظ کے اقدامات

اور اختیارات کی وضاحت کی گئی ہے۔

سرزمین پر پاکستان کی باقاعدہ افواج موجود ہی نہیں بلکہ جارحانہ جنگ میں معروف بھی نہیں اور اگر پاکستان کے اس اعتراف کو درست بھی فرض کر لیا جائے کہ یہ باقاعدہ افواج وسط مئی ۱۹۴۷ء میں وہاں بھیجی گئیں تو کیا اس نے مجلس تحفظ کے ۱۷ جنوری ۱۹۴۸ء کی قرارداد کی کھلی ہوئی خلاف ورزی نہیں کی تھی؟ اور ان حقائق کی روشنی میں کیا مجلس تحفظ کو پاکستان کے جارحانہ حملہ آور ہونے کا اعتراف اور اعلان نہیں کر دینا چاہیے تھا؟

پاکستان کے مذکورہ بالا اعتراف کے بعد ہندوستان مجلس تحفظ سے جو کچھ چاہتا تھا وہ اس کے وزیراعظم پنڈت نہرو کے الفاظ میں یہ تھا کہ

اس سلسلہ میں پاکستان کی مذمت کی جانی چاہیے۔ میں پاکستان کے خلاف

کوئی باقاعدہ اور بہت ہی سنجیدہ فیصلہ کرانا نہیں چاہتا لیکن ایک ایسا اعلان

فرو کرنا چاہتا ہوں جس میں کشمیر میں پاکستانی افواج کی موجودگی کا اعتراف

ہو اور ان کی واپسی کا مطالبہ کیا جائے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ مجلس تحفظ نے ہندوستان کے اس معتدل مطالبہ پر بھی کوئی توجہ مبذول

نہیں کی۔ چنانچہ لارڈ برٹوڈ نے بھی مجلس تحفظ کی اس کوتاہی کا اعتراف کرنے کے بعد

مندرجہ ذیل الفاظ میں اس کی تادیب کی ہے کہ

یہ بات تعجب نیز معلوم ہوتی ہے کہ اس مرحلہ پر بھی جب کہ کمیشن کے پاس

سرطرحہ المدخل کا یہ اعتراف موجود تھا کہ کشمیر میں باقاعدہ پاکستانی فوج کا استعمال

کیا گیا ہے، عوام حقیقت حال سے بالکل ناواقف تھے۔ یہ بات قابل غور ہے

کہ اگر اس مرحلہ پر کمیشن کی طرف سے حقائق پر مشتمل کوئی بیان شائع کیا جاتا اور

اس کے ساتھ مجلس تحفظ کی جانب سے محتاط الفاظ میں پاکستان کو ملوث کر دی

جاتی تو کیا اس سے اسے ہندوستانی کا اشتراک عمل حاصل نہ ہو جاتا۔ بلکہ
اندیشہ یہ تھا کہ اس صورت میں وہ پاکستان کے تعاون سے محروم ہو جاتی۔
درلارڈ ہارڈوڈ کے ان الفاظ پر جن میں حقیقت کی جھلک پائی جاتی ہے کسی قسم کا تبصرہ کے
بغیر یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مجلس تحفظ کی یہی وہ کمزوری تھی جس نے اسے حقائق کے
اعتراف سے باز رکھا تھا اور اسی کمزوری نے تصفیہ کے سبب بنیاد کو اتنا ٹیڑھا بنا دیا تھا
جس پر کوئی تغیر ممکن ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے باوجود اور ۲۱۔ اپریل ۱۹۴۷ء
کی قراردادوں کو مسترد کر دینے کے بعد بھی جیسا کہ اس وقت کے مطالعہ سے معلوم
ہو گا ہندوستان اپنے بنیادی موقف سے ہٹے بغیر تصفیہ کی راہ پر اقوام متحدہ کے ہر اقدام
میں اس کے ساتھ تعاون اور اشتراک عمل کرتا رہا۔

اقوام متحدہ کا کمیشن برصغیر ہند میں چھ ہفتہ مقیم رہنے کے بعد ۲۱ ستمبر ۱۹۴۸ء
کو مجلس تحفظ کے لئے اپنی رپورٹ تیار کرنے کی غرض سے جینیوا واپس چلا گیا تھا۔ لیکن برصغیر
ہند میں اپنے قیام کے پہلے ایک ماہ کے دوران میں، ہند اور پاکستان کی حکومتوں کے نمائندوں
نیا دل خیالات کرنے کے بعد اپنے مطالعہ اور مشاہدہ کی روشنی میں جن نتائج پر پہنچا تھا ان کے
پیش نظر اس نے ۱۱۔ اگست ۱۹۴۹ء کو جو قرارداد منظور کی تھی وہ یہ ہے کہ

اقوام متحدہ کا کمیشن برائے ہند اور پاکستان، ریاست جموں و کشمیر کی
صورت حال کے متعلق ہند اور پاکستان کے نمائندوں کے زاویہ رائے نظر پر بھی
طرح غور کرنے کے بعد اور اپنے اس خیال کی بے پرک وہ ہند اور پاکستان کی
حکومتوں کو اس صورت حال کے مستقل تصفیہ میں جو امداد دینا چاہتا ہے اس
کی کامیابی کے لئے اس کے (کمیشن کے) فیصلوں کے لفاظی میں اقوامی امن اور
سلامتی کو خطرہ سے بچانے کے لئے فوری جنگ بندی اور ان محدود حالات

کی اصلاح ضروری ہے۔

(کمیشن نے) اس بات کا فیصلہ کیا ہے کہ وہ ہند اور پاکستان کی حکومتوں کو ایک وقت (اپنی) مندرجہ ذیل تجاویز ارسال کرے :

حصہ اول

جنگ بندی کا حکم

(الف) ہند اور پاکستان کی حکومتیں اس امر پر اتفاق رائے کرتی ہیں کہ دونوں حکومتوں کے درمیان، ہائی کمانڈر ایک وقت لیکن علیحدہ علیحدہ جنگ بندی کا حکم جاری کریں گے۔ یہ حکم ان افواج پر نافذ ہوگا جو ان کی کمان میں، ریاست جموں اور کشمیر میں موجود ہیں (اور یہ حکم) جلد از جلد کسی ایسی قابل عمل تاریخ کو جاری کر دیا جائے گا جو ان تجاویز کو قبول کر لینے کے بعد چار روز کے اندر دونوں حکومتیں باہم اتفاق رائے سے طے کریں گی۔

(ب) ہند اور پاکستانی افواج کے 'ہائی کمانڈ' اس بات پر اتفاق رائے کرتے ہیں کہ وہ ہر ایسا قدم اٹھانے سے احتراز کریں گے جس سے سنیٹا جنوں اور کشمیر میں ان کی زیر کمان افواج کی فوجی قوتوں کو مزید تقویت پہنچے گا امکان ہو۔

ان تجاویز کے سلسلہ میں دونوں ملکوں کے 'ہائی کمانڈ' کی طاقت افواج میں ان تمام افواج کو بھی شامل سمجھا جائے گا جو منظم یا غیر منظم طور پر

فریقین کی طرف سے لڑائی یا اس تعداد میں حصہ لے رہی ہیں)

(ج) ہند اور پاکستان کی افواج کے سپہ سالار اعظم فرما ایک دوسرے سے مل کر موجودہ فوجی ترتیب کے سلسلہ میں ایسی مقامی تبدیلیوں کے متعلق باہم مشورہ کریں گے جنہیں جنگ بندی میں آسانیوں پیدا کرنے کے لئے ضروری سمجھا جائے گا۔

۵) کمیشن اپنی طرف سے اور جہاں بھی مناسب خیال کرے گا، فوجی مشاہدین کا تعین کرے گا اور مشاہدین کمیشن کے ماتحت رہتے ہوئے دونوں ملکوں کے فوجی ہائی کمانڈرز کے اشتراک عمل سے جنگ بندی کے حکم پر عمل درآمد کی ہنگامہ داشت کریں گے۔

۶) حکومت ہند اور حکومت پاکستان اس بات پر اتفاق رائے کا اظہار کرتی ہیں کہ وہ مزید گفت و شنید کے لئے سازگار ماحول پیدا کرنے اور اسے برقرار رکھنے میں امداد دینے کے لئے اپنے اپنے ہتھیروں سے اپیل کریں گی۔

حصہ دوم

عارضی صلح نامہ

حصہ اول میں بیان کردہ فوری جنگ بندی کی تجاویز کو قبول کر لینے کے ساتھ ساتھ دونوں ملکوں کی حکومتیں عارضی صلح نامہ کی بنیاد کے طور پر متدرج ذیل اصول کو بھی منظور کرتی ہیں۔ اس عارضی صلح نامہ کی تفصیلات، دونوں ملکوں کے نمائندوں اور کمیشن کے درمیان گفت و شنید کے بعد طے کرنی جائیں گی۔

(الف)

۱) چونکہ ریاست جموں اور کشمیر کے علاقہ میں پاکستانی افواج کی موجودگی اس وقت کے بعد سے جب کہ حکومت ہندو نے اس معاملہ کو مجلس تحفظ میں پیش کیا تھا، ایک بنیادی اور اہم تبدیلی کی حیثیت رکھتی ہے اس لئے پاکستان ریاست سے اپنی افواج کو واپس بلا لینے پر رضامند ہے۔

۲) حکومت پاکستان، قبائلوں اور پاکستان کے ان ہتھیروں کو جو معمولاً ریاست جموں اور کشمیر میں نہیں رہتے اور جو صرف لڑائی کے مقصد سے ریاست میں داخل

ہوئے ہیں وہاں سے واپس کرانے اور واپس بلانے کے لئے ہر ممکن کوشش کرے گی۔

دس، معاملہ کے قطعی فیصلہ سے پہلے اس علاقہ کا انتظام جسے پاکستانی افواج خالی کریں گی، کمیشن کی نگرانی میں مقامی حکام، انجمن دیں گے۔

(ب)

دس، جپ کمیشن، حکومت ہند کو اس بات کی اطلاع دے گا کہ (اس قرارداد کے) حصہ ۲۔ الف کی وضاحت میں جن قبائلیوں اور پاکستانی شہریوں کا حوالہ دیا گیا ہے وہ واپس چاہئے ہیں اور وہ صورت حال ختم ہو گئی ہے جس کی بنا پر ہندوستان نے مجلس تحفظ کے روبرو کیا ہے۔ ریاست جموں اور کشمیر میں ہندوستانی افواج کی موجودگی کو ضروری بتایا تھا نیز یہ کہ پاکستانی افواج نے ریاست جموں اور کشمیر سے واپسی شروع کر دی ہے اور حکومت ہند اس امر پر رضامندی کا اظہار کرتی ہے کہ وہ بھی کمیشن سے مشورہ کرنے کے بعد ہندوستان کی اپنی بیشتر افواج جموں اور کشمیر سے واپس بلانا شروع کر دے گی۔

(۲) ریاست جموں اور کشمیر کی موجودہ صورت حال کا قطعی فیصلہ ہونے سے پہلے حکومت ہند ونگ ہندی کے وقت طے ہو جانے والی لائنوں کے اندر مقامی حکام کو منظم اور قانون بحال رکھنے میں مدد دینے کے لئے کمیشن کے اتفاق رائے سے اپنی نم سے کم فوج کو رکھ سکے گی۔ کمیشن جہاں بھی ضروری سمجھے گا اپنے مشاہدین کو منبھین کرے گا۔

(۳) حکومت ہند اس بات کی یقین دہانی کی ذمہ داری لے گی کہ ریاست جموں و کشمیر کی حکومت، عوام کے روبرو اس امر کو واضح کرنے کی غرض سے کہ امن قانون

اور منظم ونسق کی حفاظت کی جائے گی اور تمام اہل سانی اور سیاسی حقوق کی فہمت دی جائے گی ۔ اپنے تمام تر امکانی وسائل کو استعمال کرے گی۔

(ج)

ایک دستخط شدہ اعلان کے ذریعے سے عارضی صلحہ مرکا پور امتی یا ایک کیونک کے ذریعے سے وہ اصول جن پر دونوں حکومتوں اور کمیشن کے درمیان اتفاق رہا ہو چکا ہے عوام کی واقفیت کے لئے شائع کر دئے جائیں گے۔

حصہ سوم

حکومت ہند و حکومت پاکستان (دونوں) اپنی اس خواہش کی مزید توثیق کرتی ہیں کہ ریاست جموں اور کشمیر کا مستقبل عوام دبا شننگان کشمیر کی مرضی کے مطابق لے کیا جائے گا اور اس مقصد کے پیش نظر عارضی صلحہ مرکا منظور کر لینے کے بعد دونوں حکومتیں ایسے خوش گو اور سازگار حالات پیدا کرنے کی غرض سے جو آزادانہ اظہار خیال کی یقینی دہائی کرا سکیں کمیشن کے ساتھ تبادلہ خیالات کے لئے تیار ہیں۔

اس قرارداد کا تجزیہ کرنے کے بعد جو نکات واضح ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ اس کے مطابق — (۱) پاکستان کی تمام افواج ، قبائلیوں اور پاکستانی ہتھیروں کو ریاست جموں اور کشمیر سے واپس چلا کر چاہیے تھا اور ہندوستان کی افواج کو مناسب تعداد میں دہلی مقیم رہنا چاہیے تھا (۲) ہندوستانی افواج کی واپسی صرف اسی وقت شروع ہونی چاہیے تھی جب کمیشن حکومت ہند کو اس بات کی اطلاع دیتا کہ قبائلی اور پاکستانی ہتھیاری ریاست سے جا چکے ہیں اور پاکستانی افواج کی واپسی شروع ہو گئی ہے۔ پھر اسی قدر نہیں بلکہ ہندوستانی

افواج کی داپھی بتدیج اور پاکستان کے اتفاق رائے سے نہیں بلکہ کمیشن کی رضا مندی سے عمل میں آتی اور (۳) ہندوستانی افواج اتنی تعداد میں وہاں ضرورت متیں جو کمیشن کے خیال کے مطابق ریاست میں امن، قانون اور انتظام کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہوتیں۔ اور ان نکات کے پیش نظر اس کے علاوہ اور کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا کہ کمیشن نے بالواسطہ طریقہ پر اس بات کو تسلیم کر لیا تھا کہ ہندوستان کے ساتھ کثیر کے الحاق کے بعد قانونی طور پر ہندوستان کو اس ریاست میں جو حقوق حاصل ہیں پاکستان کو وہ حقوق حاصل نہیں ہیں۔ اس کے باوجود معاملہ کی اہمیت کے پیش نظر اس قرارداد کو منظور کرتے ہوئے ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے کمیشن کو جو مراسلہ ارسال کیا تھا وہ اس قرارداد کے سلسلہ میں حکومت ہند کے نام پر منظر کو اچھی طرح واضح کرتا ہے۔

یہ مراسلہ نئی دہلی سے ۲۰۔ اگست ۱۹۴۷ء کو روانہ کیا گیا تھا اور اس کا متن یہ ہے کہ

۱۶۔ اگست کو میں نے اور میرے ساتھی وزیر بے قلمدان نے آپ اور

کمیشن کے دوسرے اراکین کے ساتھ جو اس وقت دہلی میں ہیں، اس قرارداد پر تبادلہ خیالات کیا تھا جو آپ نے ۱۴۔ اگست کو ہمارے حوالہ کیا تھا۔

۱۸۔ اگست کو ہمارے درمیان دوبارہ تبادلہ خیالات ہوا جس کے دوران میں

میں نے ان شکوک اور مشکلات کو واضح کرنے کی کوشش کی تھی جو میری حکومت کے

اراکین اور حکومت کثیر کے نمائندوں نے جن کے ساتھ ہم نے مشورہ کیا تھا

کمیشن کی تجاویز کا ابتدائی لیکن بغور مطالعہ کرنے کے بعد محسوس کی ہیں۔

(۲) کمیشن جب پہلی بار دہلی آیا تھا تو اس وقت اس کے ساتھ مختلف مقررین

پرگھنکو کے دوران میں ہم نے اس کے سامنے اس بنیادی حقیقت کو پیش کیا تھا

جس کی بدولت ہمارے خیال کے مطابق کثیر کا موجودہ تصادم برپا ہوا ہے

یہ حقیقت ملک ہندو کشمیر میں پہلے تو پاکستان کا یا واسطہ اور اس کے بعد براہ راست بلاوجہ جارحانہ حملہ ہے (اور) اگرچہ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت تھی لیکن پاکستان کی حکومت اس سے انکار کرتی رہی۔ گزشتہ ہفتوں میں باقاعدہ پاکستانی افواج کی ایک بہت بڑی تعداد پھر ہندوستان کے علاقہ کشمیر میں داخل ہوئی اور اس نے اس ہندوستانی فوج کا مقابلہ کیا جو ریاست کے دفاع کے لئے وہاں بھیجی گئی تھی اور اب ہمیں معلوم ہے کہ حکومت پاکستان نے اس کا کشمیر میں اپنی باقاعدہ افواج کی موجودگی کا اعتراف بھی کر لیا ہے۔ اس کے باوجود حکومت پاکستان نے ہندوستان کی حکومت کو کسی موقع پر بھی اپنی اس جارحانہ پیش قدمی کی اطلاع نہیں دی (اور) حقیقت یہ ہے کہ اس سے ہمیشہ انکار ہی کیا جاتا رہا ہے اور حکومت کے بار بار دریافت کرتے رہنے کے باوجود پاکستان جواب دینے سے گریز کرتا رہا ہے

مجلس تحفظ کی قرارداد مورخہ ۱۷-جنوری ۱۹۴۷ء کے مطابق ایسی صورت میں کہ یہ معاملہ مجلس کے زیر فور تھا، حکومت پاکستان کو صورت حال میں پیرا ہونے والی کسی اہم بنیادی تبدیلی کی اطلاع فراہمی مجلس تحفظ کو دینی چاہیے تھی۔ پاکستان کی باقاعدہ افواج کا بہت بڑی تعداد میں ریاست (جوں اور کشمیر) پر جارحانہ پیش قدمی کرنا صورت حال میں ایک اہم بنیادی تبدیلی کی حیثیت رکھتا تھا لیکن جہاں تک ہمیں معلوم ہے اب تک بھی مجلس تحفظ کو اس کی کوئی اطلاع نہیں دی گئی۔

کیش اندازہ کر سکتا ہے کہ حکومت پاکستان کا یہ طریقہ عمل اخلاق کے تمام ضابطوں ہی کے منافی نہیں ہے بلکہ بین الاقوامی قانون اور دستور

کے خلاف بھی ہے اور اس کی بدولت حالات میں بہت ہی زیادہ پیچیدگی بھی پیدا ہو گئی ہے۔ میری حکومت کی واحد مخلصانہ خواہش یہ ہے کہ تنازعہ کے امکانات کو جس قدر بھی ممکن ہو سکے مسدود اور امن کو بحال کیا جائے اور ریاست جموں اور کشمیر میں پاکستانی افواج کی اس مزید مداخلت نے جو نئی صورت حال پیدا کر دی ہے، ہماری اس خواہش نے ہمیں اس کا مقابلہ کرنے کے لئے کوئی قدم اٹھانے سے باز رکھا ہے (اور) ہندوستان میں کمیشن کی موجودگی کی بدولت، قدرتی طور پر ہمیں یہ توقع پیدا ہو گئی ہے کہ وہ جو تدبیر بھی اختیار کرے گا وہ موجودہ صورت حال سے جلد براہ راست ہونے کے لئے مؤثر ثابت ہو سکے گی اور اس کی بدولت جارحانہ حملے کا اعادہ نہ ہو سکے گا۔

(۳) ۱۸- اگست کی ملاقات کے بعد، ہم نے کمیشن کی قرارداد پر پوری توجہ کے ساتھ غور کیا ہے اس کے بہت سے حصے ایسے ہیں جو اگر مختلف اور صورت حال کے بنیادی حقائق کے زیادہ مطابق اور خصوصاً ہندوینوں کے علاقہ پر پاکستان کے کھٹے ہوئے جارحانہ حملے کے سلسلے میں زیادہ واضح ہوتے تو بہتر ہوتا۔ پھر بھی ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اگر مزید غور و بررسی کے بغیر کشمیر کے مسئلہ کو حل کرنے کی غرض سے اطمینان بخش حالات پیدا کرنے کے لئے کوئی کامیاب کوشش کی جائے تو فی الحال ہمیں چند ضروری امور پر اپنی توجہات کو مرکوز کر کے ان ہی کے متعلق تحفظات حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے اور اسی سبب پر میں نے آپ کی خدمت میں مذکورہ ذیل امور پیش کئے تھے کہ (۱) اس قرارداد کے حصہ دوم کے پیرا الف، فقرہ ۳ کی نہ تو اس طرح وضاحت کی جائے اور نہ اس پر اس طرح ٹکا گیا جس سے

(الف، ریاست جموں اور کشمیر کے اس حصہ پر جو پاکستانی فوجیں خالی کریں گی حکومت جموں اور کشمیر کے حق حکومت و ملکیت پر کوئی اعتراض وارد ہو سکے۔

(ب) برائے نام آزاد کشمیر کی حکومت کو تسلیم کرنے کا کوئی پہلو نکل سکے یا

(ج، عارضی صلح کے دوران میں اس علاقہ کو اس طرح مستحکم کیا جائے جو ریاست کے لئے نقصان رساں ثابت ہو۔

(۲) ہمارے ناویہ منظر سے (ایسے) بیرونی جارحانہ حملے سے تحفظ کی یقین دہانی جس کی بدولت ریاست پچھلے دس مہینوں میں بہت زیادہ نقصان اٹھا چکی ہے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور داخلی امن اور قانون کو برقرار رکھنے کی ضرورت سے کسی طرح بھی کم اہمیت نہیں رکھتی اس لئے کشمیر سے ہندوستانی فوج کی واپسی اور وہاں باقی رہنے والی ہندوستانی افواج کی تعداد کے سوال کو اس اہم اور نمایاں عنصر پر مبنی ہونا چاہیئے اور کشمیر میں جو ہندوستانی افواج مقیم ہیں ان کی تعداد ہر وقت اتنی ہونا چاہیئے کہ وہ داخلی بد امنی کے خلاف مؤثر ضمانت ثابت ہونے کے ساتھ ہر قسم کے بیرونی حملوں کی مدافعت کی یقین دہانی کے لئے کافی ہو سکیں۔

(۳) جہاں تک حصہ سوم کا تعلق ہے اگر یہ بات طے کی جائے کہ ریاست کے مستقبل کے سوال کو استصواب رائے عامہ کے ذریعے سے طے کیا جائے گا تو پاکستان کو نہ تو استصواب رائے کی تنظیم اور رائے شماری

میں حصہ لینے کا کوئی حق ہوگا اور نہ وہ ریاست کے اندرونی انتظام میں کوئی مداخلت کرے گا۔

(۴) اگر میں آپ کے مفہوم کو غلط نہیں سمجھتا تو قرارداد کے حصہ دوم، الف کی دفعہ ۳ سے کوئی ایسی صورت حال پیدا نہیں ہوتی جس پر آپ نے اپنے اس مراسلہ کے پیرا ۳ (۱) میں اعتراض کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ آپ نے اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ کمیشن (پاکستانی افواج کے) خالی کئے ہوئے علاقوں پر حکومت جموں اور کشمیر کے علاوہ کسی اور کا حق حکومت تسلیم کرنے کا مجاز ہی نہیں ہے۔

جہاں تک پیرا گراف ۳ (۲) کا تعلق ہے کمیشن نے تحفظ کی شدت ترین ضرورت کو تسلیم کر لیا ہے اور وہ وقت جبکہ ریاست سے ہندوستانی افواج کی واپسی شروع ہوگی وہ مدارج جن کے مطابق یہ واپسی عمل میں آئے گی اور ریاست میں مقیم رہنے والی ہندوستانی افواج کی تعداد ایسے معاملات، حکومت ہند اور کمیشن کے درمیان طے ہوں گے۔

سب سے آخر میں آپ نے اس بات سے اتفاق رائے کر لیا ہے کہ قراردادوں کے حصہ سوم میں اس کی موجودہ ترتیب کے استبدال سے کسی طرح بھی یہ بات تسلیم نہیں کی گئی ہے کہ پاکستان کو استعصا اب رائے عامہ میں کسی طرح کا دخل بھی حاصل ہوگا۔

(۵) اس وضاحت کے پیش نظر میری حکومت نے امن کے مقصد کو تقویت دینے کی غرض سے خواہش سے متحرک ہو کر اور اس طرح اقوام متحدہ کے اصول اور وقار کی سر بلندی کے لئے اس قرارداد کو منظور کر لینے کا فیصلہ کیا ہے۔

کمیشن کے چیرمین کی جانب سے ۲۵۔ اگست ۱۹۴۷ء کو نئی دہلی سے وزیر اعظم ہند کے مذکورہ بالا مراسلے کا جواب دیا گیا تھا وہ یہ ہے کہ

ہیں جناب کے اس مراسلے کی رسید بھیجی ہوئے فز محسوس کرتا ہوں جو جناب نے ۲۰۔ اگست ۱۹۴۷ء کو ارسال فرمایا تھا اور جو اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہند اور پاکستان کی اس قرارداد سے متعلق ہے جو ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کو آپ کی خدمت میں پیش کی گئی تھی۔ کمیشن نے مجھے اجازت دی ہے کہ میں جناب کو اس کی اس رائے سے مطلع کروں کہ آپ نے اپنے مکتوب کے پیرا گراف (د) میں قرارداد کی جو وضاحت فرمائی ہے وہ خود کمیشن کی وضاحت کے عین مطابق ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ جہاں تک نکتہ الف (ج) کا تعلق ہے، خالی کردہ علاقہ کے باشندوں کو تمام ترجائز سیاسی سرگرمیوں کی آزادی حاصل ہوگی۔ اس سلسلہ میں "خالی کردہ علاقہ" سے مراد بڑا ست جموں اور کشمیر کے وہ علاقے ہیں جن پر فی الحال پاکستانی فوجی کنٹرول کا مؤثر اقتدار قائم ہے۔

کمیشن کی یہ خواہش بھی ہے کہ میں اس کی طرف سے جناب کی خدمت میں اس پر اس کے خلفاء اطمینان کے احساس کی اطلاع پہنچا دوں کہ حکومت ہند نے اس قرارداد کو منظور کر لیا ہے اور اس نے جس جذبہ کے ماتحت یہ فیصلہ کیا ہے وہ جذبہ قابل تحسین ہے۔

مذکورہ بالا مراسلات کے پیش نظر اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ حکومت ہند نے امن اور سلامتی کو برقرار رکھنے کے جذبہ سے متاثر ہو کر اور اقوام متحدہ کے اصول اور رفتار کو سر بلند کرنے کی غرض سے ۱۳۔ اگست ۱۹۴۷ء کی قرارداد کو ان

مقامدار اقدامات کے علاوہ جو اس قرارداد میں واضح طور پر شامل تھے ان مزید شرائط اور ضمانتوں کے ساتھ منظور کیا تھا کہ — خالی کردہ علاقوں کی مقامی انتظامیہ کی طرح بھی ہجوں اور کشمیر کی حکومت کے حاکمانہ اور اسکا نہ صرف حق پر اثر اٹھانہ نہیں ہوگی۔ ہندوستان، افواج کی واپس کا وقت، واپسی کے مدارج اور ریاست میں تعین دہنے والی ہندوستانی افواج کی تعداد ایسے سوالات حکومت ہند اور کمیشن کے درمیان طے ہوں گے اور ان معاملات میں پاکستان کو مطلق دخل حاصل نہ ہوگا۔ برائے نام آباد کشمیر کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ ریاست میں ہندوستانی افواج اتنی تعداد میں مقیم رہیں گی جنہیں بریتانی جارحانہ حملوں کی مداخلت کے لئے اہمیت نہ بخش مدد تک کافی سمجھا جاسکے گا اور مستعرباب رکا عامہ سے پاکستان کا کوئی تعلق نہ ہوگا اور کمیشن نے حکومت ہند کی ان شرائط یا ضمانتوں کو پوری طرح حق بجانب قرار دیتے ہوئے غیر مبہم الفاظ میں ان کی توثیق کر دی تھی۔

ہندوستان کے اس حقیقت پسندانہ اور مصالحتانہ طرز عمل کے مقابلہ میں ۱۳۔ اگست ۱۹۴۷ء کی قرارداد کے متعلق پاکستان کا جو رویہ رہا تھا اس پر نظر ڈالنے سے ایک مرتبہ پھر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ وہ گفت و شنید اور مصالحت کی کوششوں کے ہر مرحلہ میں نئے نئے مسائل شامل کر کے فیصلہ کی راہ میں کس طرح رکاوٹیں پیدا کرتا رہا ہے اور اس مرحلہ پر اس کے طرز عمل کے متعلق بائیلبرجی نے لکھا ہے کہ

پاکستان نے عملاً ۱۳۔ اگست کی قرارداد کو مسترد کر دیا تھا لیکن ابتداء میں اس نے یہ کہہ کر کہ جنگ بندی کے سوال کو باقی ماندہ تمام تجاویز سے علحدہ رکھا جانا چاہیئے (اس تجویز کے متعلق) اپنے خیالات کو محفوظ رکھا تھا۔ کمیشن نے اس خیال کے ساتھ اتفاق رائے کیا تھا کہ غیر مشروط جنگ بندی مناسب ہے اور اس بات کو ضبط تفسیر میں لایا تھا کہ — اس کی ابتلائی سرگرمیاں اسی مقصد پر مرکوز ہی تھیں — لیکن اس نے اپنی تقریر میں ان جملوں کا اضافہ

بھی کیا تھا کہ — جہن اور کشمیر میں پاکستانی افواج کی موجودگی صورت حال میں ایک بنیادی تبدیلی ہے اور یہ تبدیلی غیر مشروط جنگ بندی کے فوری اور مؤثر نفاذ میں رکاوٹیں پیدا کر رہی ہے۔

پاکستان نے کچھ اور فضا ختیں بھی چاہی تھیں اور ۳۰ ستمبر ۱۹۴۷ء کو اسے اس کی مراسلت کا جواب دے دیا گیا تھا اور تین روز کے بعد اس نے ۱۱-۱۰-۱۹ گت کی قرارداد کو منظور بھی کر لیا تھا لیکن اس طرح اور ایسی شرائط کے ساتھ جو تقریباً اس کی نامنظوری کی مترادف تھیں، پاکستان نے جو طویل مراسلہ روانہ کیا تھا اس کے مندرجہ ذیل نکات خصوصیت کے ساتھ توجہ کے مستحق ہیں کیوں کہ ان سے اس سلسلہ میں پاکستان کے طرز عمل کے بعض خاص گوشوں پر روشنی پڑتی ہے اور ایک مرتبہ پھر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس تنازعہ کے قطعی فیصلہ میں کون سی بڑی بڑی رکاوٹیں عامل رہی ہیں۔ پاکستان نے اپنے اس طویل مراسلہ میں (الف) پاکستان اور (برائے نام) آزاد کشمیر کی حکومتوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ اور متنازع ثابت کرنے کی کوشش کی تھی اور لکھا تھا کہ آزاد کشمیر کی حکومت ایک خود مختار حکومت ہے اور فیصلہ کے سلسلہ میں ایک لازمی فریق کی حیثیت رکھتی ہے (اس طرح پاکستان نے قرارداد کی تقریباً نامنظوری کا جواز ثابت کیا تھا اور تنازعہ کے ایک لازمی فریق یعنی (برائے نام) آزاد کشمیر کے خیالات پر غور کرنے سے انکار کو مسلسل جہود اور قنصل کی وجہ قرار دے کر اس جہود کا بار کشمیر پر ڈال دیا تھا)

(ب) درخواست کی گئی تھی کہ پاکستانی اور ہندوستانی افواج کی متوازن اور بیک وقت واپسی کا انتظام کیا جانا چاہیئے اور یہ واپسی کمیشن سے مشورہ

کے بعد دونوں فریقوں کے مابین کسی نادر کے ماتحت عمل میں آئی جا رہی ہے۔
 (ج) یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ (نام نہاد) اکوڑ کشمیر کی افواج علی حالیہ قائم رکھی
 جائیں یعنی انھیں غیر مسلح یا منتشر نہ کیا جائے۔ اور حکومت ہند نیز حکومت کشمیر
 فوجی یا انتظامی عمل کو (نام نہاد) اکوڑ کشمیر میں داخلہ کی اجازت دینے سے انکار
 کر دیا تھا۔

(د) یہ بات فرض کر لی گئی کہ کمیشن کی ہندو اشدت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ
 انتہائی معاملات پر اپنا کنٹرول رکھ سکے جیسا کہ اس میں مداخلت کا حق ہوگا۔
 (د) ایک مرتبہ پھر تمام ہندوستانی افواج کی واپسی پر زور دیا گیا تھا۔ اور آخر
 میں کہا تھا کہ پاکستان اس قرارداد کو ان شرائط کے ساتھ منظور کرتا ہے کہ (الف)
 ہندوستان کمیشن کی ان تمام دھماکتوں کو منظور کرے جو کمیشن نے پاکستان کی درخواست
 پر کی ہیں (ب) ہندوستان مجلس تحفظ کی ۲۱۔ اپریل ۱۹۴۷ء کی منظور کردہ قرارداد
 کو ان تشریحات کے مطابق منظور کرے جو اس کے ممبروں نے کی تھیں اور (ج)
 ہندوستان ان تشریحات کو بھی تسلیم کرے جو کمیشن نے پاکستان کے دو پرو
 کی ہیں حتیٰ کہ وہ ان تشریحات کے اس مفہوم کے ساتھ بھی اتفاق رائے کر لے جو
 پاکستان سمجھتا ہے۔

کمیشن نے پاکستان کے اس جواب کو اس کی طرف سے اس قرارداد کا استرداد
 کے مترادف سمجھا تھا اور ۱۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کو اس کا جواب دیتے ہوئے لکھا تھا کہ۔
 پاکستان کی یہ شرائط پاکستان کے دائرہ اختیار سے تجاوز ہیں۔ چنانچہ ان کی بدولت
 زور فوری جنگ بندی کی ممکن ہو سکتی ہے اور دونوں حکومتوں اور کمیشن کے
 درمیان کوئی نتیجہ خیز گفت و شنید ہی شروع کی جا سکتی ہے۔

پاکستان کے اس غیر مصالحتہ رویہ کے مقابلہ میں، ہندوستان کی خواہش مصالحت کا اعلان
 اس بات سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ ۲۰۔ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کے وزیر اعظم نیپلٹ جواہر لال نہرو
 نے کمیشن کے نام اپنے ایک مراسلہ میں لکھا تھا کہ — شمالی علاقہ سے پاکستانی افواج کی واپسی کے
 بعد اس کے منظم و نسق کے اختیارات ریاستی حکومت کو منتقل کر دیئے جائیں اور اس کے دفاع کا حق
 ہمیں حاصل ہونا چاہیئے۔ اس مراسلہ کے جواب میں ۲۵۔ اگست کو کمیشن کی طرف سے جو مراسلہ موصول ہوا
 تھا اس میں لکھا تھا کہ — اس معاملہ پر اصل قرارداد پر عمل درآمد کے وقت غور کیا جائے گا —
 اور اس کے بعد وزارت امور خارجہ کی طرف سے کمیشن کو اطلاع دے دی گئی تھی کہ — ہندوستان
 ۱۳۔ اگست ۱۹۴۷ء کی قرارداد کی منظوری کے لئے شمالی علاقہ کے سوال کو بنیادی شرط نہیں
 بنانا چاہتا۔

بہر حال پاکستان کے اس غیر مصالحتہ طرز عمل کی بدولت اس مرحلہ پر مسئلہ کشمیر کے تصفیہ
 میں جو تھقل پیدا ہو گیا تھا اس سے دل برداشتہ ہو کر ۱۹۔ ستمبر ۱۹۴۷ء کو کمیشن جنیوا میں چلا گیا
 اور وہاں اس نے اپنی جو پہلی رپورٹ مرتب کی وہ ۲۲۔ نومبر ۱۹۴۷ء کو مجلس تحفظ کو بھیج دی گئی۔
 اسی زمانہ میں اقوام متحدہ کی مجلس عمومی (جنرل اسمبلی) کا پورا تھااجلاس شروع ہو چکا تھا
 اور اس میں شرکت کی غرض سے ہند اور پاکستان کے نمائندے، اقوام متحدہ کے صدر مقام میں
 موجود تھے۔ چنانچہ ان کی وہاں موجودگی سے فائدہ اٹھا کر کمیشن نے ۱۱۔ دسمبر ۱۹۴۷ء کو ان کو رپورٹ
 اپنی نمونہ ریزولوشن پیش کی۔ یہ تجاویز مفہوم کے اعتبار سے ۱۳۔ اگست ۱۹۴۷ء کی قرارداد کے تیسرے
 حصہ کا منیہر تھیں اور انہیں استصواب رائے کے بنیادی اصول کا عنوان دیا گیا تھا۔ اور ان
 تجاویز پر ہند اور پاکستان کا اتفاق رائے حاصل ہو جانے کے بعد کمیشن نے ۵۔ جنوری ۱۹۴۹ء کو

لے 'شمالی علاقہ' سے مراد ریاست جہوں اور کشمیر کا وہ حصہ ہے جو شمال میں پاکستان، افغانستان،
 سوویت یونین اور عوامی چین کی سرحدوں سے ملتا ہے۔

مندرجہ ذیل قراردادیں اعلان کر دیا تھا کہ

اقوام متحدہ کا کمیشن برائے ہند اور پاکستان

ہند اور پاکستان کی حکومتوں کے علی الترتیب ۲۳- دسمبر اور ۲۵ دسمبر ۱۹۴۷ء کے وہ

مراسلات موصول ہونے کے بعد جن میں انھوں نے ۱۳- اگست ۱۹۴۷ء کی قرارداد

کے ضمیمہ کے طور پر ان مندرجہ ذیل تجاویز کو تسلیم کیا ہے کہ

(۱) ہندیا پاکستان کے ساتھ ریاست جموں اور کشمیر کے الحاق کا سوال آزادانہ اور

غیر جانبدارانہ استصواب رائے کے ممبروں کی طریقہ سے طے کیا جائے گا۔

(۲) استصواب رائے اس وقت کر لیا جائے گا جب کمیشن کو اس بات کا یقین ہو جائے گا

کہ اس کی منظور کردہ ۱۳- اگست ۱۹۴۷ء کی قرارداد کے حصہ اول اور دوم میں جنگ بندی

اور عارضی صلح کے لئے بنیادیں تخلیقات کا ذکر کیا گیا ہے ان پر عمل درآمد کیا جا رہا ہے

اور استصواب رائے کے اختیارات مکمل ہو گئے ہیں۔

(۳) (الف) اقوام متحدہ کے سرکاری جنرل کمیشن کے اتفاق رائے سے کسی ایسے

شخص کو استصواب رائے عامہ کا ناظم مقرر کریں گے جو بین الاقوامی اعتبار سے

ممتاز شخصیت کا حامل اور عمومی طور پر قابل اعتماد ہوگا اور اسی طور پر اس

منصب پر ان کا تقرر جموں اور کشمیر کی حکومت کرے گی۔

(ب) ناظم استصواب، استصواب رائے کی تنظیم اور انجام دہی اور استصواب رائے

کی آزادی اور غیر جانبداری قائم رکھنے کی غرض سے اپنے لئے جن اختیارات کو ضروری

سمجھے گا وہ اختیارات ریاست جموں اور کشمیر سے دے لے گی۔

(ج) ناظم استصواب کو اپنی ضرورت کے مطابق اپنے علم، مصلحتیں اور

مشاہدین مقرر کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔

(دہ) الف (کمیٹن) کی قرارداد ۱۳۔ اگست ۱۹۴۷ء کے حصہ اول اور دوم پر عمل درآمد ہو جانے کے بعد اور اس وقت جب کمیٹن کو اس بات کا اطمینان ہو جائے گا کہ پراس حالات بحال ہو گئے ہیں، کمیٹن اور ناظم استصواب رائے حکومت ہند سے مشورہ کر کے ہندوستانی اور ریاستی سطح فوج کے انحصار کے متعلق کسی آخری صورت کا فیصلہ کرے گا لیکن اس فیصلے میں ریاست کے تحفظ اور استصواب رائے کی آزادی کا پوری طرح خیال رکھا جائے گا۔

(دب) ۱۳۔ اگست کی قرارداد کے حصہ دوم الف کی دفعہ ۲ میں جس علاقہ کا حوالہ دیا گیا ہے اس میں موجود مسلح افواج کے انحصار کے متعلق آخری صورت کا فیصلہ بھی کمیٹن اور ناظم استصواب رائے مقامی حکام کے مشورہ سے کریں گے۔

(د) ریاست کے تمام انتظامی اور فوجی حکام نیز بڑے بڑے سیاسی عناصر سے امید کی جاتی ہے کہ وہ استصواب رائے کی تیاریوں اور اسے انجام تک پہنچانے میں ناظم استصواب کے ساتھ اشتراک عمل کریں گے۔

(د) الف (ریاست) کے ان تمام شہریوں کو جو فسادات کے باعث چلے گئے ہیں واپس آنے کی دعوت دی جائے گی اور انھیں آزادی کے ساتھ واپس آنے اور شہریوں کی طرح اپنے تمام حقوق سے ناگزیر اٹھانے کا اختیار حاصل ہوگا۔ لوگوں کو ان کے وطن میں بھیجے اور بلانے کی سہولیتیں دینے کے لئے دو کمیٹن مقرر کئے جائیں گے جن میں سے ایک پاکستان کے نامزد کئے ہوئے افراد پر مشتمل ہوگا اور دوسرا ہندوستان کے۔ یہ کمیٹن ناظم استصواب رائے کی زیر ہدایت اپنا کام انجام دیں گے اور ہند اور پاکستان کی حکومتیں نیز ریاست جموں اور کشمیر کے تمام حکام اس دفعہ کو برائے کار لانے کے لئے ناظم استصواب رائے کے

ساتھ پورا پورا اتفاق عمل کریں گے۔

(ب) تمام اشخاص (ریاست کے ہنزیوں کے علاوہ) جو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو یا اس کے بعد قانونی مقاصد کے علاوہ دوسرے مقاصد سے ریاست میں داخل ہوئے ہیں انہیں ریاست سے چلا جانا ہوگا۔

(۱۷) ریاست جموں اور کشمیر کے تمام حکام ناظم استصواب رائے کے ساتھ اتفاق عمل سے ان امور کی یقین دہانی کریں گے کہ

(الف) استصواب رائے کے سلسلہ میں کسی قسم کی دھکی نہیں دی جائے گی اور غیب اور تحریص سے کام نہیں لیا جائے گا نیز رشوت اور غیر مناسب اثرات کا استعمال نہیں کیا جائے گا۔

(ب) پورن ریاست میں جاری سیاسی سرگرمیوں پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جائے گی۔ ریاست کے تمام باشندے، بلا امتیاز عقیدہ، ذات یا چاہت ہندیا پاکستان کے ساتھ افاق کے سوال پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لئے رائے دینے میں بالکل آزاد رہیں گے اور ان کی حفاظت کی جائے گی۔ تقریر، تحریر اور اجتماع کی آزادی دی جائے گی، نیز ریاست کے اندر سفر کرنے اور قانونی طور پر ریاست سے باہر جانے اور ریاست میں داخل ہونے پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جائے گی۔

(ج) تمام سیاسی قیدی رہا کر دیئے جائیں گے۔

(۱۸) ریاست کے ہر حصے میں اقلیتوں کا قابل اطمینان تحفظ کیا جائے گا اور

(۱۹) کسی کو اختلاف رائے کی بنا پر سزا نہیں دی جائے گی۔

(۲۰) ناظم استصواب رائے تمام مسائل کو جن میں اسے امداد کی ضرورت ہوگی، اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہند اور پاکستان کے علم میں لائے گا اور کمیشن استصواب رائے

کے تاہم کو اپنی طرف سے ایسی ذمہ داریوں کو انجام دینے کی اجازت دے سکے گا جو تاہم استصواب کو سپرد کی گئی ہیں۔

(۹) استصواب رائے عامہ کی تکمیل کے بعد تاہم استصواب اس کے نتائج سے کمیشن اور جنوں اور کشمیر کی حکومت کو مطلع کرے گا اور اس کے بعد کمیشن مجلس تحفظ کے روبرو اس امر کی توثیق کرے گا کہ استصواب رائے میں آزادی اور غیر جانبداری یہی ہے یا نہیں۔

(۱۰) عارضی مصلحت پر دستخط ہونے کے بعد کمیشن کی قرارداد ۱۳- اگست ۱۹۴۷ء کے صدر سوم میں بیان کردہ تجویز کے مطابق، باہم مشورہ کے ذریعہ سے مذکورہ بالا تجاویز کی تفصیلات طے کرنی جائیں گی اور مشورہ میں تاہم استصواب کو پوری طرح شامل رکھا جائے گا۔

ہندو اور پاکستان کی حکومتوں سے سفارشات کرتا ہے کہ کمیشن کی قرارداد ۱۳- اگست ۱۹۴۷ء کی بنا پر ان کے درمیان جو سمجھوتہ ہوا ہے اس کے مطابق وہ جنگ بندی کا حکم دینے کے لئے فوری قدم اٹھائیں اور یہ جنگ بندی یکم جنوری ۱۹۴۹ء کی نصف نسبت سے ایک منقطع قی مل میں آجائے اور

طے کرتا ہے کہ اسے د کمیشن کو اپنی ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے جو اس پر ۱۳- اگست ۱۹۴۷ء کی قرارداد اور مذکورہ بالا اصول کی بدولت عائد ہوتی ہیں مستقبل قریب ہی میں برصغیر ہند واپس چلا جانا چاہیے۔

استصواب رائے کے بنیادی اصول کو مذکورہ بالا قرارداد کی شکل دینے سے قبل جب انہیں

۱۱- دسمبر ۱۹۴۷ء کو تجاویز کی صورت میں پیش کیا گیا تھا تو ہندوستان نے ان کے متعلق بعض نکات

کی وضاحتیں طلب کی گئیں اور ان امور پر مطمئن ہو جانے کے بعد کہ
(الف) استعواب رائے سے متعلق کیشن کی تجویز کو منظور کرنے سے قبل پاکستان
۱۳۔ اگست ۱۹۴۷ء کی قرارداد کے حصہ اول اور دوم پر عمل درآمد کرنے کا۔
(ب) قائم استعواب رائے کے اختیارات محدود ہوں گے اور وہ محض
استعواب رائے کے تنفیسی امور ہی کے ساتھ تعلق رکھے گا۔

(ج) استعواب رائے کے دوران میں آزادی تقریر کی اصطلاح میں پاکستان
کے طرفداروں کا یہ حق شامل نہ ہو گا کہ وہ لوگوں کے مذہبی جذبات کو ابھاریں
اللہ

(د) دیگر نام نهاد آزاد کشمیر کی افواج کو منتشر کرنے کے علاوہ انہیں بہت
پڑے پیانے پر غیر مستعد بھی کیا جائے گا۔

اس طرح ہند اور پاکستان کی طرف سے ۱۵ دسمبر ۱۹۴۷ء کی ان تجاویز کو منظور کر لئے جانے
کے بعد جنس کیشن نے ۵ جنوری ۱۹۴۸ء کو ایک قرارداد کی شکل دے دی تھی اور جنس کیشن نے
دونوں حکومتوں نے ۱۳۔ اگست ۱۹۴۷ء کی قرارداد کو بھی تسلیم کر لیا تھا یہ کم جنوری ۱۹۴۸ء کی شب
کو کشمیر میں جنگ بندی اعلیٰ میں آئی اور اس کے ساتھ ہی :-

کشمیر کے قازمہ میں اقوام متحدہ کی مصالحتی کشمیریوں کا پہلا مرحلہ ختم ہو گیا

دسواں باب

عارضی صلح کی کوششوں میں ناکامی

گزشتہ باب میں بتایا جا چکا ہے کہ اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندو اور پاکستان کی مساعی کی بدولت یکم جنوری ۱۹۴۷ء کی شب کو کشمیر میں جنگ بند ہو گئی، مگر لیکن آئندہ واقعات کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس مرحلہ پر ایک مرتبہ گزشتہ واقعات پر ایک منظر دال لی جائے۔

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ ہندوستان نے ۲۰- اگست ہی کو بعض اختلافت کے باوجود کمیشن کی ۱۳- اگست ۱۹۴۷ء کی قرارداد کو منظور کر لیا تھا اور اس منظوری کے وقت اسے کمیشن کی طرف سے ان باتوں کا یقین دلایا گیا تھا کہ — ریاست بھون اور کشمیر کا وہ حصہ جو پاکستانی افواج کے قبضہ میں ہے اصولاً ریاست ہی کا حصہ سمجھا جائے گا۔ نام نہاد آزاد کشمیر کی حکومت کو کسی حال میں بھی تسلیم نہیں کیا جائے گا اور ماضی صلح کے دوران میں اس علاقہ کو اس طرح مستحکم نہیں کیا جائے گا جس سے ریاست کو نقصان پہنچے۔ ریاست کی دفاعی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے وہاں مناسب تعداد میں ہندوستانی فوج رکھی۔ پاکستان ریاست سے اپنی افواج اور اپنے ہتھیاروں کو واپس بلالے گا اور استعجاب رائے نیز ریاست کے داخلی انتظام میں اسے کوئی دخل حاصل نہ ہوگا اور پاکستانی افواج ریاست کے سب علاقوں کو خالی کریں گی ان کے منظم و نسق کی ذمہ داری کمیشن کی نگرانی

میں مقامی حکام پر عائد ہوگی اور جہاں تک شمالی علاقہ کا تعلق ہے ہندوستان نے ان کے دفاع اور انتظام کے متعلق اپنے ذمہ داریء منظر کو واضح کر دینے کے باوجود کمیشن کی اس بعینہ دہائی کو تسلیم کر لیا تھا کہ اس معاملہ پر اس وقت غور کیا جائے گا جب ۱۳- اگست ۱۹۴۷ء کی قرارداد پر عمل درآمد کا وقت آئے گا۔ لیکن پاکستان کی جانب سے اس قرارداد کو بالواسطہ طریقے پر مسترد کر دیا گیا تھا۔

اس مسئلہ پر مصالحت کرانے میں ناکام ہو جانے کے بعد کمیشن نے ۱۱- دسمبر ۱۹۴۷ء کو:

تجاویز پیش کی تھیں اور ان تجاویز کو بھی ہندوستان نے جن تشریحات اور بعینہ دہائیوں کی روشنی میں منظور کیا تھا ان کا خلاصہ یہ ہے کہ — پاکستان ۱۳- اگست کی قرارداد کے حصہ اول اور دوم پر عمل کرے گا۔ ناظم استصواب رائے کے اختیارات محدود ہوں گے۔ استصواب رائے کے دوران میں پاکستان کے طرفداروں کو ان کے مذہبی جذبات کو نہیں بھڑکائیں گے اور نام نہاد آزاد کشمیر کی مسلح افواج کو منتشر اور غیر مسلح کیا جائے گا۔ اس طرح حکومت کی طرف سے ۱۳- اگست ۱۹۴۷ء کی قرارداد کو اس کے بعد ۱۱- جنوری ۱۹۴۹ء کی اس قرارداد کو ۱۱- دسمبر ۱۹۴۷ء کی تجاویز پیش حق ان تمام دفتروں کے ساتھ منظور کیا گیا تھا جو کمیشن نے دونوں قراردادوں کے سلسلے میں کی تھیں اور انھیں منظور کرتے ہوئے ہندوستان نے اپنے کسی بنیادی مطالبہ سے انحراف نہیں کیا تھا۔ اس کے برعکس پاکستان نے ۱۳- اگست کی قرارداد کو مسترد کر دیا تھا لیکن اس ۱۱- دسمبر

۱۹۴۷ء کی تجاویز کو جو ۱۳- اگست کی قرارداد کے حصہ سوم کے ایک ضمیمہ کی حیثیت رکھتی تھیں تسلیم کر لیا تھا اور اس طرح اس نے ۱۳- اگست کی پوری قرارداد پر اپنی منظوری کی ہر نسبت کر دی تھی۔ اس صورت حال کے پیش نظر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے منظر میں یہ تبدیلی کیوں واقع ہوئی تھی؟ اور چونکہ اس سوال کا جواب بھی اُس وقت واقعات کو سمجھنے کے لئے ایک ضروری عنصر کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے یہاں اس جواب کو بھی ذکر پیش کر دینا مناسب

ٹائیکل بریجر نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے دوسرے چند اسباب بیان کرنے کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ:-

... ایک بات جس نے بلاشبہ پاکستان کے فیصلہ پر اثر ڈالا تھا یہ تھی کہ ۱۹۴۷ء کے موسمِ خزاں میں 'کشمیر میں' ہندوستان کی فوجی پولیٹیشی نمایاں طور پر مضبوط ہو گئی تھی۔۔۔ موسمِ گرما کی ہم اپریل میں شروع ہوئی تھی۔ اس ہم کے دوران میں ہندوستانی افواج نے سرعت کے ساتھ پیش قدمی کر کے 'سلام آباد' ہنڈواڑہ اور تھوال پر، جو سرحدی شہر مظفر آباد سے صرف ۸ میل کے فاصلہ پر واقع ہے قبضہ کر لیا تھا.... ایکویبر کے وسط میں پاکستانی افواج نے تھوال پر دوبارہ قبضہ کر لینے کی ناکام کوشش کی تھی۔ نوبر میں ہندوستانی افواج نے جو اپنی حملہ شروع کیا اور وہ کہہ ہم مقام دلاس کو پاکستانی فوجوں سے واپس لے لیا۔ اس طرح شمال و مشرق کی طرف سے وادی پر حملہ کا ایک زبردست خطرہ دوہرہ ہو گیا اور لدارخ پر جو دباؤ پڑ رہا تھا وہ بھی جاتا رہا پھر چھ روز کے بعد ہندوستانی افواج نے پونچھ کے ایک سال سے زیادہ مدت کے محاصرہ کو بھی ختم کر دیا۔

چیناں چ پونچھ کا محاصرہ ختم ہو جانے کے تین روز بعد پاکستان کے وزیر خارجہ سرتھار شاد خاں نے مجلس تحفظ کو، توجہ دلائی تھی کہ:-

اسے اس معاملہ میں فوری قدم اٹھانا چاہیئے۔ ورنہ پاکستانی اس بات پر مجبور ہو جائے گا کہ وہ اپنے تمام وسائل سے کام لے کر پونچھ اور میرپور کے اضلاع

-
1. Twelve Months of War in Kashmir, published by P.I.B. Govt. of India, Oct. 1948

کو ہندوستان کے قبضہ میں جانے سے روکنے کے لئے جو اپنی عمل شروع کر دے۔

پھر جس روز مجلس تحفظ کو سرگزر الدھماں کا یہ مراسلہ موصول ہوا تھا اسی روز ہندوستانی افواج نے قادی لڈار کے اہم رسل و رسائل اور تجارت کے مرکز کرنل کو بھی پاکستانی افواج سے واپس لے کر ایشیا کی تجارتی شاہراہوں کو خطرہ سے محفوظ بنا دیا تھا جو قادی لڈار سے گزرتی ہیں اور اس طرح تبت اور یار قند کے درمیان دوبارہ تجارت کو ممکن بنا دیا تھا۔ اور ہندوستانی افواج کی اس کامیابی کے تیسرے ہی روز۔

سرگزر الدھماں نے قادی لڈار جنگ بندی کے معاہدہ پر دستخط کرنے کے لئے اپنی

آمانگی کا اظہار کر دیا تھا۔

مذکورہ بالا واقعات کے پیش نظر یہ نتیجہ اخذ کرنا کوئی مشکل کام نہیں کہ ہندوستانی افواج کی یہ مسلسل اور ہم گیر کامیابیاں پاکستان کے سابقہ فیصلوں پر اثر انداز ہوئی تھیں۔ لیکن اس کے علاوہ دو اور ایسے اسباب بھی تھے جنہوں نے پاکستان کو ۱۱ دسمبر ۱۹۴۷ء کی تجویز کو قبول کر لینے پر آمادہ کیا تھا اور ان میں پہلا سبب تو یہ تھا کہ اپنے اقتصادی حالات کی بدولت اس کے لئے کثیر کی جگہ کو جاری رکھنا ممکن نہیں تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اس تمام مہلت سے فائدہ اٹھا کر اس نے نام نہاد آزاد کشمیر کی افواج کو زیادہ منظم اور مضبوط بنا دیا تھا اور اس طرح کثیر کے مسئلہ کے تصفیہ کی ماہ میں ایک نئی اور زبردست رکاوٹ پیدا کرنے کا سامان پیدا کر دیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہنا ہے چاند ہرگ کہ ۱۱ دسمبر ۱۹۴۷ء کی تجویز اور ان کے توسط سے ساراگت مسئلہ کی قرارداد کو منظور کرتے وقت بھی اس کے پیش نظر جو مقصد تھا وہ فیصلہ کی ان تمام کوششوں کو ناکام بنانا تھا۔

1. S/1087, 23.11.48
2. The Hindustan Times, 27.11.48

اس کے برعکس ہندوستان نے ۱۱ دسمبر ۱۹۴۷ء کی تجاویز کو اس وقت منظور کیا تھا جب ہندوستانی اقوام ریاست بٹوں و کشمیر کی سرحدوں کے اندر کامیاب پیش قدمیوں میں مصروف تھیں اور ان پیش قدمیوں کے دوران میں ریاست کے مختلف حصوں کو بارہ مہلہ آوروں سے واپس لے رہی تھیں۔ لیکن چون کہ ہندوستان کشمیر کے تنازعہ کو پیمانہ اور آئینی طریقہ پر طے کرنا چاہتا تھا اس لئے اس نے اپنی اس بالادستی کے باوجود جنگ بندی کی تجویز کو قبول کر لیا تھا۔

بہر حال جنگ بندی کے بعد خطہ جنگ بندی کے تعین کا سوال ۷ ماہ تک طے نہیں ہو سکا اور کمیشن نے اپنے فیصلہ کے مطابق فروری ۱۹۴۸ء کے پہلے ہفتہ میں برصغیر ہند واپس آنے کے بعد اپنی قہجرات اور مساعی کو جن دو کاموں پر مرکوز رکھا وہ خطہ جنگ بندی کا تعین اور استعصواب ملے کی تیاریوں کا میدان ہموار کرنے کی غرض سے ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء کی قرارداد کے حصہ اول کی باقی ماندہ دفعات نیز حصہ دوم پر عمل درآمد کی صورتیں پیدا کرنا تھا۔ چنانچہ کمیشن کا پہلا مقصد ۲ جولائی ۱۹۴۸ء کو اس معاہدہ کے ذریعہ سے حاصل ہو گیا جو خطہ جنگ بندی کے تعین کے لئے کراچی میں ہوا تھا۔ اور جس میں فریقین کو اس امر کی اجازت دے دی گئی تھی کہ وہ خطہ جنگ بندی کے اندر اپنی اپنی جگہ اپنی دفاعی پوزیشن کو درست کر سکتے ہیں لیکن انہیں کشمیر میں فوجوں کے بڑھانے کی ممانعت کر دی گئی تھی اور کمیشن کو اجازت دے دی گئی تھی کہ وہ جہاں بھی چاہے اپنے مشاہدین متوزع کر سکتا ہے۔ اس طرح کمیشن جنگ کو بند کرانے اور خطہ جنگ بندی کے تعین میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن جہاں تک عارضی صلح کا تعلق تھا کمیشن اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

برصغیر ہند میں دوبارہ واپس آنے کے بعد سے ستمبر ۱۹۴۸ء میں اپنی واپسی تک عارضی صلح

کے سلسلہ میں کمیشن جو کوششیں کرتا رہا تھا ان کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

سب سے پہلے کمیشن نے کراچی، ممبئی اور سری نگر میں مشورے کرنے کے بعد

دونوں فریقوں کو فوجی اور استقامی امور پر گفتگو کرنے کی غرض سے ایک مشترکہ کانفرنس

منعقد کرنے کی دعوت دی۔ یہ کانفرنس جس میں کمیشن کی ٹروس سب کیٹی، اے بی شاہل
 قتی، ۹ مارچ کو دہلی میں منعقد ہوئی۔ اس میں پاکستان نے عارفی صلح کے لئے اسی
 تجاویز پیش کیں جو ان شرائط پر مبنی تھیں جو سر لٹرائٹ خاں مختلف مواقع پر پیش
 کیے تھے (اور جنہیں ہندوستان نے کسی موقع پر بھی منظور نہیں کیا تھا) چنانچہ
 اس کانفرنس میں بھی ہندوستان نے انہیں مسترد کر دیا اور یہ کانفرنس ناکام
 ہو گئی۔۔۔۔۔ پھر ایک اور ناکام کوشش کے بعد کمیشن اس نتیجہ پر پہنچا کہ اسے
 خود عارفی صلح کی جستجو پر مرتب کرنی چاہیے۔ چنانچہ اس نے یہ تجاویز مرتب
 کر کے ۱۵ اپریل کو ہندوستان کی حکومتوں کو بھیج دیں لیکن فریقین نے انہیں
 بھی مسترد کر دیا۔ اس کے بعد کمیشن نے ۲۸ اپریل کو اپنی وہ ترمیم شدہ شرائط بھیج
 اور سال کیں جس کا خلاصہ تھا کہ۔۔۔ جہاں تک شمالی علاقہ کا تعلق ہے اگر کمیشن اور
 یا ناظم استصواب لائے اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس کے دفاع کے لئے ہندوستانی افواج
 کا وہاں رکھا جانا ضروری ہے تو ہندوستان کو ایسا کرنے کی اجازت دے دی
 جائے گی۔ کمیشن نے ۱۸ اگست ۱۹۴۷ء کو قرارداد کے مطابق تمام پاکستانی فوجوں نیز
 بیشتر ہندوستانی افواج کی واپسی کا مفصل پروگرام بھی بنایا تھا اور اس بات کا
 اعادہ بھی کیا تھا کہ پاکستانی افواج جس علاقہ کو جانی کریں گی اس کا استعمال مقامی
 حکام کمیشن کی نگرانی میں کریں گے۔ اور ۱۳ اگست ۱۹۴۷ء کو ۵ جنوری ۱۹۴۹ء کی
 قراردادوں کی ان دفعات کی مزید توثیق کی تھی جس میں سیاسی قیدیوں کی رہائی،
 شہری حقوق کے تحفظ کی ضمانت اور امن و قانون کی بقا کا ذکر کیا گیا تھا۔۔۔ فریقین
 نے ان تجاویز کو بھی منظور نہیں کیا۔۔۔۔۔ اور ہندوستان نے اپنے مراسلات مورخہ
 ۱۸ مئی ۱۹۴۷ء اور ۱۹ جون ۱۹۴۷ء میں غیر مبہم الفاظ میں ان پر اپنے بیانیہ اعتراضات

کو واقع کر دیا۔ یہ اعتراضات ان نکات پر تھے کہ ان تھامز میں (نام تھامز) آڈیو کشمیر کی افواج کو منتشر اور غیر متح کر کے گاؤں کی ذکر موجود نہیں اور شمالی علاقہ کے متعلق سمجھوتہ غیر اطمینان بخش ہے۔ اور پاکستان نے ۳۰ مئی کو ان تھامز کو (ظہار غیاں) کیا تھا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ شمالی علاقہ میں ہندوستانی افواج کے قیام پر سختی کے ساتھ اعتراض کرتا ہے اس علاقہ میں حکومت ہند یا حکومت کشمیر کے کسی افسر کو داخلہ کی اجازت نہ دے جانے کا مطالبہ کیا تھا (اور اپنی اس بات کا عادیہ کیا تھا کہ ہندوستانی اور پاکستانی افواج کو بیک وقت کشمیر سے واپس ہونا چاہیئے۔

مصلحت کی حیثیت سے گفت و شنید میں ناکام ہونے کے بعد کمیشن نے یہ تجویز پیش کی کہ ۲۲ اگست ۱۹۴۹ء کو سیاسی پہلو پر بات چیت کرنے کے لئے وفارقی سطح پر ایک کانفرنس منعقد کی جائے۔ دونوں نے اس کانفرنس کے انعقاد پر آمادگی کا اظہار کیا لیکن ہندوستان اس کانفرنس میں شمالی علاقہ اور نام تھامز (آزاد کشمیر کی فوجوں کے سوا فوج کو بھی نہیں بٹھانا چاہتا تھا۔ لیکن پاکستان انہیں حذف کر دینے پر مصرع تھا۔ اس لئے یہ طریقہ بھی ناکام ہو گیا اور ۱۸ اگست کو کمیشن نے اپنی یہ تجویز واپس لی۔۔۔۔۔ کمیشن نے اس نفل کو ختم کرنے کے لئے ۱۸ اگست ۱۹۴۹ء کو آخری تجویز پیش کی تھی کہ تمام متنازعہ قیامات میں ثالثی فیصلہ کو قبول کر لیا جائے لیکن ہندوستان نے اس تجویز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

ہندوستان نے کمیشن کی اس آخری تجویز کو مبرا پر مسخر کیا تھا اس کا اعلان "پاکستان ٹائمز" کے ان جملوں کیا جاسکتا ہے کہ:-

1. S/1430, Addendum 1, Dec 9, 1949 (The Third Interim Report of UNCIP to Security Council)

ہم اس بات کو سمجھنے سے قاصر نہیں رہ سکتے کہ اس تمام معاملہ کو غیر ضروری

طو پر بڑی طاقتوں کی اقتدار پسندی کی کشمکش کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے۔ لہ

لیکن عارضی صلح کے سلسلہ میں کمیشن کی ان تمام تر مرکزہ میوں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستان نے اپنی شکایت کو مجلس تحفظ میں پیش کرتے وقت جن امور کو موقف بنایا تھا وہ اس تمام مدت میں پورے استقلال کے ساتھ ان کا پابند رہا تھا اور وہ کمیشن کی جن تجاویز کو مسترد کرتا رہا تھا وہ وہی تجاویز تھیں جنہیں اس کے موقف کو نظر انداز کیا گیا تھا۔

بہر حال ۱۹۴۹ء کے اواخر میں کشمیر کے مسئلہ کی صورت یہ تھی کہ وہاں جنگ بند ہو جانے کے بعد خطہ جنگ بندی کا تعین ہو چکا تھا لیکن عارضی صلح کے سلسلہ میں جس پر استصواب رائے کا انعقاد تھا کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا تھا اور مائیکل پیڈجر کے الفاظ میں

تنازعہ کی اس مرحلہ پر اور درحقیقت آئندہ چار سال کی مدت میں، عائد

صلح کے راستہ میں (نام نہاد) آزاد کشمیر کی فوجوں کو منتشر کرنے، مسلح افواج کو کشمیر سے

واپس بلانے اور شمالی علاقہ کی حیثیت کو متعین کرنے کے سوالات رکاوٹ بنے ہوئے تھے

اس سلسلہ میں یہ امر ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ جس طرح مجلس تحفظ کی ہدایت کے خلاف

پاکستان نے خود اپنے اعتراف کے مطابق مئی ۱۹۴۹ء میں اپنی باقاعدہ افواج کو کشمیر میں بھیج دیا تھا

اسی طرح اس نے مجلس تحفظ اور کمیشن کی اس ہدایت کے برعکس کشمیر میں فوجی قوتوں کو مزید تقویت

دی جائے اس نے اگست ۱۹۴۹ء سے ستمبر ۱۹۴۹ء کے موسم بہار تک (نام نہاد) آزاد کشمیر کی فوجوں کو

اس درجہ قوی بنا دیا تھا کہ ان کی تعداد ۲۵ ہٹالینوں تک پہنچ گئی تھی۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۴۹ء میں سردار

محمد ابراہیم خاں نے اس امر کا اعتراف کیا تھا کہ :-

1. The Pakistan Times 2.9.49

2. The Struggle for Kashmir P. 102

کشمیر میں جنگ بندی کے بعد نومبر کی مدت میں تمام تہاد (آزاد کشمیر کی حکومت) اپنی افواج کی تنظیم کرتی رہی ہے اور اب وہ پہلے کے مقابلہ میں سو گئی بہتر ہیں لے اور خود کمیشن نے ان افواج کے متعلق لکھا تھا کہ

اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ اب آزاد افواج اتنی طاقت ور ہو چکی ہیں کہ ان کی وجہ سے فوجی صورت حال بدل گئی ہے۔ اس صورت حال سے افواج خصوصاً ہندوستانی افواج کی واپسی کا سوال اس لئے بے حد مشکل بن گیا ہے کہ اس وقت تک تمام تہاد ویز میں دونوں ملکوں کی باقاعدہ افواج کی واپسی کے مقصد کو پیش نظر رکھا گیا تھا۔ لے

ان حالات میں کمیشن عارضی ضابطہ کرانے میں ناکامیاب ہوا کہ ستمبر ۱۹۴۹ء میں برصغیر ہند سے واپس چلا گیا اور اس نے اس سلسلہ میں اپنی پوزیٹو رپورٹ مرتب کی اس میں یہ سفارشات کیں کہ۔
(الف) کمیشن کی بجائے مصالحت کرانے کا کام کسی ایک فرد کے سپرد کر دیا جائے اور اسے تمام مسائل کو حل کرنے کے لئے وسیع اختیارات دئے جائیں۔
(ب) ریاست کو غیر فوجی بنانے (افواج کے انخلا) کے سوال کو مجموعی طور پر لے کیا جائے یعنی تمام افواج کی بیک وقت واپسی کو قیودی قرار دیا جائے۔
(ج) استصواب طے کے سلسلے میں تمام اختلافات کو لازمی طور پر ثالث کے فیصلہ سے طے کیا جائے۔

اور کمیشن کی ان سفارشات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ کمیشن کی یہ قراردادیں جو اس نے ۱۱ اگست ۱۹۴۹ء اور ۱۱ جنوری ۱۹۴۹ء کو منظور کی تھیں اس مسئلہ میں پیدا ہو جانے والی نئی الجھنوں کو حل کرنے

کی صفاتیتوں سے محروم تھیں لیکن اس نے جو سفارشات کی تھیں وہ مذکورہ بالا قراردادوں کے محد سے ہٹ گئی تھیں چنانچہ کمیٹی کے چیئرمین سر جوزف کاربیل نے اکثریت کی رپورٹ سے اختلاف کرتے ہوئے اپنا رپورٹ میں لکھا تھا کہ:-

یہ بتادیتا ہوں کہ معلوم ہوتا ہے کہ کمیشن مصالحت کی جو کوششیں کرتا رہا ہے ان

سے اس تمام مسئلہ کو حل کرنے میں کوئی تعمیری فائدہ نہیں پہنچا۔

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ کمیشن نے اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ (نام نہاد) آناڈکثیر کی افواج اس قدر طاقت ور ہو گئی ہیں کہ ان کی وجہ سے فوجی صورت حال بدل گئی ہے اور افواج خصوصاً ہندوستانی افواج کی واپسی کا سوال بے حد مشکل بن گیا ہے۔ لیکن اول تو اس نے اپنی سفارشات میں آناڈکثیر کی فوجوں کے سوال کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ دوسرے اس نے اپنی قراردادوں کے ان حصوں سے بھی انحراف کیا تھا جن میں پاکستانی فوج کے فوری انخلا کی یقین دہانی کی گئی تھی اور ہندوستانی افواج کے بیشتر حصہ کی واپسی کو اپنے اوپر ہندوستان کے باہمی مشورہ پر منحصر رکھا تھا۔ اور ان سفارشات میں دونوں ملکوں کی افواج کی بیک وقت واپسی کو فوری قرار دے دیا تھا پھر اسی قسم نہیں بلکہ اس نے اپنی ۵ جنوری ۱۹۴۷ء کی اس قرارداد کو بھی جو استصواب رائے کے اصول پر مشتمل تھی عملاً ترک کر کے استصواب رائے سے متعلق تمام تر مسائل کو ثالث کے فیصلہ پر منحصر کر دیا تھا۔ چنانچہ سر جوزف کاربیل نے اپنی جگہ رپورٹ میں لکھا تھا کہ

”سراگت کی قرارداد کی جگہ کوئی ایسی قرارداد منظور کی جاتی چاہیے جس میں اس

معدے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں خصوصاً (نام نہاد) آناڈکثیر کی فوج کے ایک

طاقت ور فوج بن جانے کو باقاعدہ طریقہ پر مد نظر رکھا جائے۔“

اور یہ بات ظاہر ہے کہ ان سفارشات کے مطابق آئندہ اس مسئلہ کو حل کرنے کی جو کوششیں کی

جدا کی رہیں وہ مذکورہ بالا اجرائی کو شششوں سے بالکل مختلف اور متضاد ہونے کے باعث کامیاب نہیں ہو سکتی تھیں۔

یہاں اس امر کو بھی ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل نے مارچ ۱۹۴۹ء کے اہم تقریب میں امریکن امیرالبحر جیسیٹ ٹرنر کو ناظم استصواب رائے کے منصب کے لئے منتخب کیا تھا لیکن چوں کہ عارضی صلح کی شرائط پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکا تھا اس لئے انہوں نے باقاعدہ طور پر اپنے فرائض کی انجام دہی بھی شروع نہیں کی تھی۔ لیکن جب ستمبر ۱۹۴۹ء میں اس نے استصواب رائے سے متعلق اختلافی مسائل کو لازمی طور پر کسی ثالث کے سپرد کر دئے جانے کی سفارش کی تو اس کے ساتھ ہی اس نے ایڈمرل ٹرنر کا نام بطور ثالث بھی تجویز کیا لیکن چوں کہ ثالثی کی یہ تجویز بھی قابل عمل ثابت نہیں ہوئی اس لئے وہ اپنی اس نئی حیثیت میں بھی کوئی کام نہیں کر سکے۔

بہر حال عارضی صلح کی شرائط پر سمجھوتہ کرانے کی تمام تر کوششوں میں ناکام ہو جانے کے بعد کمیشن نے اس تنازعہ کو مجلس تحفظ میں بھیج دیا اور ۱۹۴۹ء کو مجلس تحفظ نے کمیشن کی سفارشات کی روشنی میں تنازعہ کے جزلے لے۔ جی۔ ایل۔ مک تاشن کو جو اس وقت مجلس تحفظ کے صدر بھی تھے اپنی جانب سے غیر رسمی طور پر مصالحت کرانے والا مقررہ کر کے انہیں مصالحت کی کوششیں جاری رکھنے کی ہدایت کی اور انہوں نے ۲۱ دسمبر ۱۹۴۹ء کو ریاست ہماچل اور کشمیر کو غیر فوجی بنانے کے لئے نو نوٹوں لکھوں کے دو پروپوزل تجاویز پیش کیں وہ یہ تھیں کہ

۱۔ الف پاکستان کی باقاعدہ افواج واپس چلی جائیں اور ریاست کے دفاع نیز داخلہ امن اور قانون کے تحفظ کے لئے جن ہندوستانی افواج کی ضرورت نہ ہو وہ بھی واپس چلی جائیں۔

۲۔ (ب) مقامی افواج کو غیر مسلح اور منتشر کر کے کم کر دیا جائے اور ان متاخری افواج میں ریاست ہماچل اور کشمیر کی مسلح افواج اور یلیٹیا پیر (نام نہاد) آئندہ کشمیر کی افواج

کو بھی شامل سمجھا جائے۔

(ج) ریاست کو غیر فوجی بنانے کی اس تجویز میں شمالی علاقہ کو بھی شامل سمجھا جائے

اور اس علاقہ میں اس وقت انتظام کا جو نظام قائم ہے اسے اقوام متحدہ کی نگرانی

میں برقرار رکھا جائے۔

ان تجاویز کے ساتھ ساتھ جرنل مک نائٹن نے یہ سفارش بھی کی تھی کہ ان تجاویز پر عمل درآمد کرانے کے لئے کمیشن کی بجائے کسی ایک شخص کو مقرر کر دیا جائے۔ اور جرنل مک نائٹن کی ان تجاویز کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کمیشن کی آخری تجاویز کے مطابق — ہند اور پاکستان کی مسلح افواج کو بیک وقت ریاست سے واپسی کی ہدایت کی گئی تھی اور اس طرح ۱۳ اگست ۱۹۴۷ء کی قرارداد کے حصہ (ب) کی دفعہ (۱) اور ۵ جنوری ۱۹۴۷ء کی قرارداد کی دفعہ (۴) کے فقرہ (الف) کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ دوسرے ریاست جموں اور کشمیر کی قانونی حکمرانی کا قاعدہ افواج کو (نام نہاد آزاد کشمیر کی ان افواج کی سطح پر لاکھڑا کیا تھا جنہیں جناب بندی کے بعد مجلس تحفظ کی ہدایات کو نظر انداز کر کے منظم کیا گیا تھا اور اس طرح اس خط کتابت کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا جو اگست ۱۹۴۷ء کے اواخر میں وزیراعظم ہند اور کمیشن کے چیئرمین کے درمیان ہوئی تھی اور جس میں کمیشن کی جانب سے اس بات کا یقین دلایا گیا تھا کہ ۱۳ اگست ۱۹۴۷ء کی قرارداد کی مذکورہ اس طرح وضاحت کی جائے گی اور نہ اس پر اس طرح عمل درآمد کیا جائے گا جس سے برائے نام آزاد کشمیر کی حکومت کو تسلیم کر لینے کا کوئی پہلو برآمد ہو سکے۔ اور سب سے آخر میں جرنل مک نائٹن نے اپنی تجاویز میں شمالی علاقہ کے انتظامی نظام کو جو اس وقت بھی پاکستان ہی کے ہاتھوں میں تھا علیٰ حالہ برقرار رکھے۔ کی سفارش کر کے اس علاقہ کو عملاً ریاست جموں اور کشمیر سے علاحدہ کر کے اس پر پاکستان کے قبضہ

کو بحال رکھا تھا۔ اور چون کہ حکومت ہند کے لئے کسی ایسی تجویز کو منظور کرنا ممکن نہیں ہو سکتا تھا جس میں اصل قرارداد سے کھلا ہوا انحراف کیا گیا ہو اس لئے اس نے ان تجاویز میں یہ ترمیمات پیش کیں کہ صرف (نام نہاد) آرڈینری کو منتشر کیا جانا چاہئے اور شمالی علاقے کے دفاع اور انتظام کے حقوق علی الترتیب حکومت ہند اور ریاست جموں اور کشمیر کی حکومت ہی کو حاصل ہونے چاہئیں۔ اس طرح اگرچہ جرنل بک ناٹھ کی مساعی مصالحت بھی ناکام ہو گئی تھیں۔ لیکن مجلس محفوظ نے ۱۴ مارچ ۱۹۵۷ء کو برطانیہ، متحدہ امریکہ، کیوبا اور ناروے کی تحریک پر جو قرارداد منظور کی تھی وہ جرنل بک ناٹھ کی مذکورہ بالا تجاویز ہی پر مبنی تھی اور اس قرارداد کا مفہوم یہ تھا کہ

ان تجاویز کی روشنی میں ریاست سے پانچ ماہ کی مدت میں افواج کے انخلا کا منصوبہ بنایا اور اس پر عمل درآمد کیا جائے اور اگر ان تجاویز میں کوئی ترمیم مقصود ہو تو اسے فریقین کی تصفیہ سے کر لیا جائے۔ کمیشن اور جرنل بک ناٹھ کی سفارشات کے مطابق مصالحت کرانے اور افواج کے انخلا کو منصوبہ پر عمل درآمد کرانے کے لئے ایک شخص کا تقرر کیا جائے اور اسے اس بات کا اختیار دیا جائے کہ اگر وہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے کسی اور تجویز کو مناسب سمجھے تو اس سے دونوں حکومتوں یا مجلس تحفظ کو مطلع کر دے۔

اور اس قرارداد کے محرکین نے اس کے مقاصد کی تشریح کرتے ہوئے بتایا تھا کہ ریاست کو، فوج سے خالی کرانے کے پروگرام کو ایک ہی سمجھا جانا چاہئے۔ (یعنی اس کے کسی حصہ کو ترک نہیں کیا جاسکتا) اور اس پر ایک ہی وقت عمل درآمد کیا جانا چاہئے۔ اسے ریاست میں موجود تمام افواج پر حاوی ہونا چاہئے اور اسے ریاست کے تمام علاقوں پر نافذ کیا جانا چاہئے۔

1. S/1461. 24.2.50
2. S/P V 460 3.8.50

مجلس تحفظ کی مذکورہ بالا قرارداد پر تبصرہ کرتے ہوئے مائیکل پرمچر نے لکھا ہے کہ:-

اس قرارداد پر پاکستان کا اطمینان غیر قطری نہیں تھا کیوں کہ مک ناٹن کی تجاویز

میں جی پی آر قرارداد بمعنی تھی کشمیر کے تنازعہ میں ہندوستان کے ساتھ اس کے مساوی

قریبی ہونے کے دعویٰ اور مطالبہ کو پہلے سے زیادہ واضح طور پر تسلیم کیا گیا تھا۔ مزید برآں

کمیشن کی سابقہ قراردادوں کے برعکس ۴ مارچ ۱۹۵۷ء کی قرارداد میں دونوں ملکوں

کی افواج کے بیک وقت اور (نام نہاد) آزاد کشمیر کی فوجوں کے ساتھ حکومت کشمیر کی

فوجوں کو منتشر کرنے کی تجویز بھی کی گئی تھی۔

اور اس قرارداد پر اس کے محرکین کی تشریحات کے پیش نظر ہندوستان کی طرف سے اسے

منظور کر لئے جانے کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ چنانچہ ہندوستان کے مندوب سر ہنگل راؤ نے

۴ مارچ ہی کو اس بات کا اعلان کر دیا تھا کہ — ہندوستان نے جوں کہ جزل مک ناٹن کی تجاویز

کو منظور نہیں کیا اس لئے وہ ان تجاویز پر مبنی قرارداد کو بھی منظور نہیں کر سکتا لیکن وہ کمیشن کی جگہ

ممنوعہ کر لئے کیلئے کسی ایک شخص کے تقرر کو منظور کرتا ہے اور مجلس تحفظ کی اسی قرارداد کی بنا پر ۱۲ اپریل

۱۹۵۷ء کو کمیشن کی جگہ اقوام متحدہ کی طرف سے کشمیر کے تنازعہ میں مصالحت کرانے کے لئے آسٹریلیا

کے ایک نوجوان وکسن کا تقرر عمل میں آیا تھا۔

ہندوستان میں مجلس تحفظ کی مذکورہ بالا قرارداد کا جو رد عمل ظاہر ہوا تھا اس کا اندازہ ٹائمز

آف انڈیا کے ان الفاظ سے بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ

مک ناٹن کی ناکامی کا سبب یہ ہے کہ کمیشن کی طرح انھوں نے بھی اس مسئلہ کے

بنیادی، اخلاقی اور قانونی پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا تھا۔

1. The Struggle for Kashmir, P.108

2. The Times of India 9.2.50

لیکن کشمیر میں اس کا رد عمل باقی ماندہ ہندوستان سے کہیں زیادہ شدید اور تلخ تھا چنانچہ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اس وقت کے نائب وزیراعظم جنتی غلام محمد نے ۲۷ فروری ۱۹۵۷ء کو کہا تھا کہ :-

اقوام متحدہ پر ہمیں جو اعتماد تھا وہ مٹ کر رہ گیا ہے..... اور جب تک ایک

کشمیری بھی زندہ ہے ماب ناطح کی تیار ویر منظور نہیں کی جاسکتی ہے

بہر حال اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے سرکاروں کو کس ۲۷ مئی ۱۹۵۷ء کو برصغیر ہندوستان میں آئے اور تقریباً تین ماہ تک مصالحت کی جدوجہد کرتے رہنے کے بعد ۲۲ اگست کو انھیں کھلے طور پر اس بات کا اعتراف کر لینا پڑا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اپنی ان ہی مساعی مصالحت کے دوران میں موصوف نے ۲ جولائی ۱۹۵۷ء کو دہلی میں ہندو اور پاکستان کے وزرا اعظم کی ایک کانفرنس بھی منعقد کی تھی جس میں انھوں نے نہایت صفائی کے ساتھ کہا تھا کہ :-

اس بات کے اسباب و حال میں مجھے کے بغیر کہ کشمیر پر حملہ کیوں ہوا میرا نظریہ

یہ ہے کہ جب حملہ آور عناصر نے ریاست جوں اور کشمیر کی سرحد کو عبور کیا تھا تو ان کا

یہ فیصلہ بین الاقوامی قانون کے خلاف تھا۔۔۔ اور جب مئی ۱۹۵۷ء میں پاکستان کی باقاعدہ

افواج ریاست کے علاقہ میں داخل ہوئی تھیں تو ان کا یہ عمل بھی بین الاقوامی قانون کے مطابق

نہیں تھا۔

اس طرح اقوام متحدہ کے نمائندہ کی حیثیت سے سرکاروں کو کس نے ۱۹۵۷ء کے وسط میں یہ بات

تسلیم کر لی تھی کہ ریاست پر قبائلیوں کا حملہ اور وہاں باقاعدہ پاکستانی افواج کا مداخلہ دونوں میں توازی

قانون کے خلاف تھے۔ اور ہندوستان کے دعویٰ کا ایک بنیادی جواز بھی یہ ہی تھا کہ پلٹ جواہر لال

1. The Hindustan Times, 1.3.50

2. S/1191, 15.9.50.

وائے افسروں کو نمائندگی، معائنہ، احتیاج و اعتراض اور شکایت کرنے کے اختیارات بھی حاصل ہوں گے اور ان افسروں کی تحریری اجازت حاصل کئے بغیر کشمیر کی حکومت کوئی گرفتاری عمل میں نہ لاسکے گی۔

ریاست جٹوں اور کشمیر کے متعلق ابتدا ہی سے پاکستان کا جو رویہ رہا تھا اگر اس میں سے جزوی مشورہ سے پہلے کے واقعات کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو بھی ان حقائق سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس نے مئی ۱۹۴۷ء میں اقوام متحدہ کی ممانعت کے باوجود، خود اپنے اعتراف کے مطابق اپنی باقاعدہ افواج کو واپس بھیج دیا تھا اور پھر جنگ بندی کے بعد ۱۳ اگست ۱۹۴۷ء بروز جمعہ ۱۹۴۷ء کی قراردادوں کے الفاظ اور مفہوم کے برعکس اس نے (نام نہاد) آزاد کشمیر کی افواج کو ایک زبردست فوجی قوت بنا دیا تھا۔ حتیٰ کہ کمیشن نے بھی اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ اس حال میں خصوصیت کے ساتھ ہندوستانی افواج کے اغلا کا سوال بہت ہی پیچیدہ ہو گیا ہے۔ اس لئے جہاں تک افواج کی واپسی کا تعلق ہے ہندوستان اس مرحلہ پر اس وقت تک کسی تجویز کو منظور کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا تھا جب تک اسے اس بات کا یقین نہیں دلا دیا جاتا ہے کہ اس کی پیش کردہ افواج کی واپسی کے بعد پاکستان اندر ریاست پر حملہ نہیں کر دے گا اور چوں کہ اس وقت تک اقوام متحدہ کی طرف سے پاکستان کے تمام تر جراحات اقدامات اور اس کی خلاف ورزیوں کو نظر انداز کیا جاتا رہا تھا اور تمام تر سابقہ یقین دہانیوں کو پس پشت ڈالا جاتا رہا تھا اس لئے اس نے ریاست سے افواج کے اغلا کی اس تجویز کو منظور کر دیا اور جہاں تک ریاست کشمیر کی افواج کو منتشر کرنے کے سوال کا تعلق تھا اس نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ صرف حکومت ہی اپنی افواج کو منتشر کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کر سکتی ہے۔

شمال علاقہ کے متعلق حکومت ہند اپنے اس سابقہ فیصلہ پر قائم رہی ہے کہ اسے اس

علاقہ کے دفاع کے لئے اپنی افواج کو وہاں متعین رکھنے کا حق حاصل ہوتا چاہیے اور اگر اس معاملہ میں پاکستان سے مشورہ کیا جائے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اسے اس علاقہ میں رہنے کا حق حاصل ہے۔

نام نہاد کثیر میں تمام نرا انتظامات کو اقوام متحدہ کے افسروں کی نگرانی میں بحرہٹوں کے تبادلہ کر دینے کا مطلب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ ہندوستان ریاست کے اس حصہ سے متعلق اپنے قانونی حق سے دست بردار ہو جائے۔ لیکن ہندوستان اس حق سے دستبردار نہیں ہو سکتا تھا۔ اور جہاں ناک ریاست جموں اور کشمیر میں اقوام متحدہ کے افسروں کے تقرر اور ان کو وسیع اختیارات دینے کا تعلق تھا حکومت ہند جموں اور کشمیر کی قانونی حکومت کے حقوق اور اختیارات میں اس کھلی ہوئی تخفیف اور مداخلت کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔ اس لئے سرٹکس کی تجویز کے اس حصہ کو بھی منظور نہیں کیا جاسکتا تھا۔

اپنی ان تجاویز کی ناکامیابی کے بعد سر آرون ڈکسن نے یہ تجویز پیش کی کہ استصواب رائے کے دوران میں پوری ریاست کے لئے ایک متحدہ حکومت بنادی جائے۔ اس تجویز میں ہوتیوں متبادل صوبوں میں پیش کی گئی تھیں وہ یہ تھیں کہ

(الف) ایسی مشترکہ حکومت قائم کی جائے جس کی کابینہ میں کشمیر کے دونوں

حصوں کے نمائندے مساوی تعداد میں شامل ہوں۔ یا

(ب) ایسی غیر سیاسی حکومت قائم کی جائے جو غیر متعلیہ، افراد پر مشتمل ہو

اس میں مسلمانوں اور ہندوؤں کو مساوی نمائندگی دی جائے۔ اور اس کا چیرمین

اقوام متحدہ کی طرف سے متور کیا جائے۔ یا پھر

(ج) ایسی غیر سیاسی حکومت قائم کی جائے جو تمام اقوام متحدہ کے نمائندوں ہی

پر مشتمل ہو۔

لیکن ان تینوں متبادل صورتوں میں بھی ریاست جموں اور کشمیر میں ہندوستانی اور ریاست کی جائز حکومت کے حقوق اور اختیارات کو نہ صرف کم ہی کر دیا گیا تھا بلکہ اسے پاکستان کی سطح پر بھی لا کر رکھا گیا تھا اور ہندوستان اپنے بنیادی موقف سے ہٹ کر ان میں سے کسی صورت کو بھی منظور نہیں کر سکتا تھا۔ اپنی اس کوشش میں بھی ناکامیاب ہو جانے کے بعد سرگودھس نے آخری تجویز پر پیش کی تھی کہ ریاست کے جن حصوں کے باشندوں کی خواہشات واضح اور معلوم ہیں انہیں استصواب رائے کے بغیر ہندوستان اور پاکستان کے ساتھ الحاق کی اجازت دے دی جائے اور باقی ماندہ حصوں میں استصواب رائے کرا لیا جائے۔ اور یہی کہ اس تجویز میں دونوں ملکوں میں سے کسی ایک ملک کے حقوق میں بھی مداخلت نہیں کی گئی تھی اور اس میں عوام کی خواہشات کو مد نظر رکھا گیا تھا اس لئے اس بات کو جانتے ہوئے بھی کہ اگر پولی ریاست میں الحاق کے سوال پر بحیثیت مجموعی استصواب رائے کیا جائے گا تو اس کا نتیجہ ہندوستان ہی کے حق میں برآمد ہو گا۔ ہندوستان اس تجویز کو منظور کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا لیکن پاکستان نے اسے مسترد کر دیا تھا۔ اور اس طرح ۲۲ اگست ۱۹۴۷ء کو سرحدوں کے مسئلے پر اعلان کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ وہ اپنا مقصد حاصل کرنے میں بالکل ناکام ہوئے ہیں۔

سرحدوں کے مسئلے کی کوششوں کی ناکامی کا پاکستان میں جو رد عمل ظاہر ہوا تھا یہاں اس کا تذکرہ کر دینا اس لئے ضروری ہے کہ اس سے ایک مرتبہ پھر کشمیر کے متعلق پاکستان کے ادبائے اختیار کی حقیقی ذہنیت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس سلسلہ میں پاکستان کے سابق گورنر جنرل اور وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین نے ۱۸ ستمبر ۱۹۴۷ء کو گلگت میں ایک تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ:-

کشمیر کی آزادی کا معاملہ ہر پاکستانی کے لئے بنیادی عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے
پاکستان کی قرارداد کا ایک لازمی ضابطہ جزو ہے اور جب تک پولی کشمیر آزاد نہیں ہو جائے گا
پاکستان غیر مکمل رہے گا۔

اور ۱۵ ستمبر ۱۹۵۵ء کو صوبہ سرحد کے وزیراعظم عبدالقیوم خان، اسمبلی میں اعلان کیا تھا کہ:-

اگر ہندوستانی آزادانہ انتخاب دے دے تو ہندوستان ہوا تو جنگ کے علاوہ اور

کوئی چارہ کار باقی نہیں رہے گا۔ اور صوبہ سرحد نیز پاکستان کی مرکزی حکومت، دونوں

پاکستان کے باشندوں کی خواہشات کا احترام کریں گی۔

اور ۱۵ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو پاکستان کی مرکزی اسمبلی میں کشمیر پریسٹ کے دوکان میں وزیراعظم قیامت علی

خان مرحوم نے کہا تھا کہ:-

پاکستان کے لئے کشمیر ایک اہم ضرورت کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس اجلاس میں مشرقی پاکستان کی مسلم لیگ کے صدر نے کہا تھا کہ:-

آخری دلیل تو اس ہے کہ

اور پھر تقریباً ڈیڑھ ماہ کے بعد سردار محمد ابراہیم خاں نے کہا تھا کہ اب کشمیر کے مسئلہ کا

واحد حل اس بات میں پوشیدہ ہے کہ ہم جنگ آزادی کو از سر نو شروع کر دیں۔

پاکستان کے ذمہ دار سرکاری اور غیر سرکاری افراد کے نامکودہ بالا بیانات سے ۱۹۵۰ء کے

اور ان میں ایک مرتبہ پھر یہ بات واقع ہوئی تھی کہ پاکستان کی رائے میں ریاست جموں اور کشمیر کے

مسئلہ کا اس کے علاوہ اور کوئی حل نہیں ہے کہ یہ ریاست اس کے ساتھ ملحق ہو جائے اور اس نے

اس وقت تک اقوام متحدہ کی جو کھلی ہوئی خلاف ورزیاں کی تھیں اور وہ اس مسئلہ کے حل کی مختلف

مناسب تجاویز کو قبول کرنے یا قبول کر لینے کے بعد ان سے جو انحراف کرتا رہا تھا اس کا سبب بھی

یہ ہی تھا کہ وہ کسی دلیل اور فیصلہ کے بغیر ریاست جموں اور کشمیر کو اپنا ایک جزو لائیفیکیشن قرار دیتا تھا۔

1. The Civil & Military Gazette . 30.9.50

2. The Struggle for Kashmir P.111

3. The Dawn 6.10.50

4. The Civil & Military Gazette, 27.11.50

ڈکن رپورٹ کے متعلق ہندوستان کا یہ نظریہ رہا تھا اسے اگست ۱۹۵۷ء کے اخبار میں
ہندو یونین کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے ان الفاظ میں واضح کیا تھا کہ۔۔۔
صرف پاکستان کی خوشنودی کے لئے، کشمیر کی موجودہ حکومت کو نکال باہر کرنے
کی تجویز دراصل حملہ آور کو ملنے کرنے اور اس کی ہمت بڑھانے کی تجویز تھی اور اس کا
مطلب یہ تھا کہ آپ حملہ آور کی کامیابی کے خواہش مند ہیں۔۔۔۔۔ درحقیقت میرے
نزدیک یہ طریق کار اس سوال کو حل کرنے کے سلسلے میں غیر معمولی طویل فی منطق ہے
اور جہاں تک حکومت ہند کا تعلق ہے، خواہ تاڑ کچھ بھی کہیں نہ ہوں اس کے لئے
اسے منظور کرنا ناممکن ہے۔ اور یہاں یہ معاملہ ختم ہو جاتا ہے لہ

اور اس مرحلہ پر یہ بتا دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اقوام متحدہ کے اس غیر منطقی
طریق کار کا ہندوستان پر جو دھم عمل لایا ہوا تھا اس کے متعلق دنیا کے ہوش مند اور حقیقت پسند
حلقوں کی رائے کیا تھی۔ چنانچہ اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے مائیکل بن پیرنے لکھا ہے کہ اس
رپورٹ کے متعلق

پاکستان کے مقابلے میں ہندوستان کی بے لوثیت زیادہ واضح تھی جس کا سبب
یہ تھا کہ ہندوستان کی نظریں کو دیا کا مسئلہ، کشمیر کے مسئلہ کے عین مطابق تھا۔ جس طرح
شمالی کوریا کو، جمہوریہ کوریا پر جادہ خانہ حملہ کرنے کا عزم گردانا گیا تھا بالکل اسی طرح
ہندوستان نے بھی پاکستان کے خلاف کشمیر پر حملہ کرنے کا الزام عائد کیا تھا۔ لیکن
اقوام متحدہ کے اقدام کے متعلق ہندوستان کی درخواست کے سلسلے میں جادہ خانہ
حملہ کے پہلو پر بہت کم توجہ دی گئی تھی۔ اس کے برعکس ہندوستان پاکستان کے تعلقات
کے ان دوسرے پہلوؤں پر زور دیا گیا تھا جنہیں ہندوستان، زیر بحث مسئلہ سے بالکل

غیر متعلق سمجھتا تھا لیکن ددو توں ایک ہی جیسے مسائل میں اقوام متحدہ کے عمل کا تضاد یہ تھا کہ گوریا کے معاملہ میں اس نے فوری قدم اٹھایا تھا اور ۸ م گھنٹوں کے اندر

اندر فوجی کارروائی کرتے کی قرارداد منظم کر دی تھی لہ

مختصر یہ کہ اگرچہ اقوام متحدہ نے ابتدا ہی سے ہندوستان کی حقیقی شکایت کو نظر انداز کرتے رہنے کی حکمت عملی اختیار کی تھی لیکن سرآؤن ڈکسن نے قیابلیوں کے حملہ اور پاکستان کی باقاعدہ افواج کے ریاست میں داخلہ کو بین الاقوامی قانون کی صریح خلاف ورزی قرار دے کر اس حقیقت کی تصدیق کر دی تھی کہ پاکستان، کشمیر پر جارحانہ حملہ کا مجرم ہے اور اس وقت کم از کم اقوام متحدہ سے اس امر کی توقع کی جاتی تھی کہ وہ کشمیر کے تنازعہ سے متعلق اپنی حکمت عملی پر نظر ثانی کریں گی لیکن جب ہندوستان نے دیکھا کہ خود سرآؤن ڈکسن کی تجاویز میں بھی جارح اور مجروح کے درمیان کوئی فرق اور امتیاز روا نہیں رکھا گیا ہے حتیٰ کہ ان تجاویز میں بعض ایسے اجزاء بھی شامل ہیں جن کی شمولیت کا مقصد پاکستان کو خوش کرنا اور جارحانہ حملہ آور کی بہت بڑھانا ہے تو اس کے پاس انہیں مسترد کر دینے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں تھا۔

گیا رھواں باب

گراہم مشن

گزشتہ باب میں بتایا جا چکا ہے کہ سرائون ڈکسن نے اپنی رپورٹ میں تقسیم اور استصواب
رائے کے تصور پر بہت ہی ایک نئی تجویز بھی پیش کی تھی اور یہ کہ کثیر میں سرائون کی مجموعی تجاویز
کے خلاف نئی تبدیلیں ظاہر ہوا تھا اور گزشتہ صفحات کے مطالعہ سے یہ بات بھی واضح ہو چکی
ہے کہ حکومت ہند نے ہمارا ہر ہری سنگھ کی اس درخواست الحاق کو جسے کثیر کے عوامی رہنماؤں
اور عوام کی کامل تائید اور حمایت حاصل تھی اس شرط پر منظور کیا تھا کہ حالات کے اعتبار پر آجائے
اور ریاست میں امن اور قانون بحال ہو جانے کے بعد الحاق کا آخری فیصلہ استصواب رائے
سے کرایا جائے گا اور حکومت ہند کے اس فیصلہ کا صاف مطلب یہ تھا کہ جب تک کثیر کے
بائندے خود کثرت رائے سے اس فیصلہ کو تبدیل نہیں کریں گے یہ فیصلہ اپنی جگہ مکمل سمجھا
جائے گا اور اس فیصلہ کو تبدیل کر دینے یا اس پر قائم رہنے اور اسے مستحکم بنانے کے سلسلہ
میں ریاست کے بائندے اپنی سرگرمیوں میں پوری طرح آزاد رہیں گے۔ اور یہاں اس
امر کے اعادہ کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی کہ کثیر کا قضیہ ۱۹۴۷ء کے اواخر میں شروع
ہوا تھا اور کثیر کے بائندوں کے لئے یہ صورتِ حال بے چینی کی موجب بنتی جا رہی تھی۔

اس صورتِ حال کے متعلق خود کشمیر کے باشندوں کے احساسات کا اندازہ اس وقت کے نائب وزیراعظم بخشی غلام محمد کے ان الفاظ سے بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ:-

مجلس تحفظ، الحاق کے سوال کا کوئی مناسب حل تلاش کرنے میں جو غیر فوری تاخیر صادر نہ ہو تھی اس کی وجہ سے ریاست کی اقتصادی اور سماجی ترقی مسدود ہو کر رہ گئی تھی اور اس حال میں جب کہ باقی ماندہ ہندوستان میں عوام جمہوریت کی تعمیر کی راہ پر گامزن تھے ریاست (جموں اور کشمیر) نہ صرف شدید محنت و مباحثہ کا موضوع ہی بنی ہوئی تھی بلکہ اس کے باشندے اپنی ترقی کے راستوں کو بند بھی پاتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان نے جب کشمیر کے سوال کو ادارہ اقوام متحدہ میں پیش کیا تھا تو نیشنل کانفرنس اور ریاست کے باشندوں کی اکثریت نے ہندوستان کے اس اقدام پر اس وجہ سے اطمینان محسوس کیا تھا کہ اس طرح انھیں ہندوستان کے ساتھ ریاست کے الحاق کی توثیق اور تصدیق کا ایک موقع مل جائے گا۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۴۸ء کے آغاز میں نیشنل کانفرنس کا ہر خصوصی کنوینشن منعقد ہوا تھا اس میں منظورہ کردہ ایک قرار داد میں کہا گیا تھا کہ:-

اس لئے ان حالات میں یہ کنوینشن، ہندوستان کے، ریاست کے عارضی الحاق کی توثیق کرتا ہے۔ مزید برآں اس بات کا عہد کرتا ہے کہ وہ نیا کشمیر کی بنیاد پر ہندوستان کے ساتھ قطعی الحاق کی پوری طرح حمایت کرے گا ہم (کنوینشن میں ایک ہندو)

I. Kashmir Decides its Destiny P.3

پروف۔ آل جرنل اور کشمیر نیشنل کانفرنس کا وہ منصوبہ جس میں ریاست کے دستور، سیاسی، اقتصادی سماجی اور ترقیری نصب العین کا تعلق کیا گیا ہے۔

اس منصوبہ (یا کشمیر) کی تکمیل اور تعمیل کو اپنا مقدم ترین فریضہ سمجھتے ہیں۔ اس کنونشن کو کامل توقع ہے کہ ہندوستان کی حکومت اور عوام کشمیر کے باشندوں کو ان کے اس فریضہ کی تکمیل اور ان کی سیاسی اور اقتصادی آزادی کے نصیباء یوں کے حصول میں ہر ممکن مادی، اخلاقی اور سیاسی امدادیں گے۔

اور اس کنونشن کے فوراً بعد ہی شیخ عبداللہ نے جنہیں اس وقت کشمیری عوام کا اعتماد حاصل تھا اور جو اس زمانہ میں باشندگان کشمیر کی صحیح نمائندگی اور رہنمائی کر رہے تھے عید سعید کے موقع پر سری نگر میں ایک مجمع عام کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ:-

ہماری نیشنل کانفرنس کے خصوصی کنونشن نے جو فیصلہ کیا ہے وہ ان شرائط اور مصائب کا جو کشمیر کے امن پسند اور بے گناہ باشندے ایک سال سے پاکستانی فوج کے ہاتھوں برداشت کرتے رہے ہیں منطقی نتیجہ تھا۔ میں نے پچھلے سال پینڈت نہرو کے سامنے اس بات کا جو عہد کیا تھا کہ کشمیر ہندوستان کا ایک حصہ ہو گا۔ میرا وہ عہد اب دائمی رشتہ میں بدل چکا ہے۔ ہم ریاست کی تاریخ کے نازک ترین دور میں، ہندوستانی فوج اور عوام کی طرف سے ملنے والی امداد کو کبھی بھی قراؤش نہیں کر سکتے۔ ہندوستانی سپاہی، مقامی باشندوں کو بھوکوں مرنے سے بچانے کے لئے انہیں اپنا دشمن بھی دیتے رہے ہیں۔ یہ فیصلہ ایک سال تک ہندوستان کے طرز عمل کا اچھی طرح تجربہ کرتے رہنے کے بعد کیا گیا ہے۔

اور یہ ایک ایسا فیصلہ ہے جو ریاست کی تمام آزادی کے معقبات پر ہمیشہ اثر انداز رہے گا۔ ہندوستان کے ساتھ ہمارے الحاق کا فیصلہ اس حقیقت پر مبنی ہے کہ ہندوستان جس حکمت عملی اور لائحہ عمل پر کاربند ہے، ہمارے ایسی یا ایسی ادھار

پروگرام بھی اس کے میں مطابق ہے۔۔۔۔۔ ہم اپنے اس فیصلہ پر اس لئے بھی خوش

ہیں کہ اسلام کے اصول کے مطابق ہی ہے لہ

بہر حال ان اقتباسات سے جہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ریاست جموں اور کشمیر کی نمائندہ
قومی جماعت "نیشنل کانفرنس" اپنی جگہ ایک طرف تو ہندوستان کے ساتھ ریاست کے الحاق
کو قطعی اور آخری سمجھتی تھی اور دوسری طرف اس نے مجلس تحفظ ہندو کثیر کے سوال کو پیش کرتے
جائے گا اس بنا پر خیر مقدم کیا تھا کہ اس طرح اس کے فیصلہ الحاق پر اقوام متحدہ کی ہر تصدیق
بھی ثابت ہو سکے گی۔ لیکن جب اسے یہ بات محسوس ہونے لگی کہ مجلس تحفظ اس سوال کو پشت گان
کشمیر کی خواہش کے مطابق طے کرنے میں غیر معمولی تاخیر سے نام لے رہی ہے اور اس تاخیر
کے باوجود اس کے متفقہ حل کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو اس کے صبر کا پیمانہ بھی بربود ہو گیا۔
چنانچہ شیخ محمد عبداللہ نے نیشنل کانفرنس کے ایسویں اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے
اس صورت حال پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا تھا کہ:-

اقوام متحدہ کے منشور دجا دہ میں قوموں کی بنیادی آزادی کے اعلان

قولاً ہی بعد ہمارے وطن کو بلا وجہ و عشیاء حملے کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ ہم نے

اس جارحانہ حملہ کے انکار اور انسداد کے لئے جس کی بدولت ریاست کے ہزار ہا

بے گناہ باشندوں کو ناقابلِ بیان مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے، ادارہ اقوام متحدہ کو

توجہ دلائی تھی لیکن ہادی امداد اور اعانت کی یہ درخواست بے نتیجہ ثابت ہوئی

اور ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ جارحانہ حملہ آور کے خلاف واضح فیصلہ صادر کرنے

کی بجائے ہندوستان اور ہم سے ہمارے حقوق کے بحال کا ثبوت طلب کیا جا رہا

ہے۔ منشور کے بنیادی اصول کو نافذ کرنے سے اس انکار کی بدولت ادارہ اقوام متحدہ

کشمیر کے مسئلہ کا کوئی پُر امن حل دیا وقت کرنے کی کوششوں میں بھی برابر ناکام ہوتا رہا ہے اور مجلس تحفظ ریاست کے مستقبل کے سوال کے عوام کی خواہشات کے مطابق طے کرانے کے نام پر ایسے عجیب اور حیرت انگیز طریقے اختیار کرتے رہے ہیں جنہیں الحاق کے بنیادی سوال کے ساتھ دور کا تعلق بھی نہیں تھا۔ ہم کامل اقلیت اور انسانی وادی کے ساتھ بار بار یہ کہتے رہے ہیں کہ چونکہ ریاست کے باشندوں کے مستقبل کا سوال صرف ان ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے اس اہم ترین سوال پر انہیں اظہار خیال کا موقع دیا جائے اور اس کے لئے ہم نے تجویز کیا تھا کہ ریاست میں ایسے حالات بحال کئے جائیں جو حملہ سے پہلے موجود تھے اور اس کی مؤثر ضمانت دی جائے کہ آئندہ ریاست پر کوئی جارحانہ حملہ نہیں ہوگا۔ معاملہ کی حقیقی صورت یہ تھی اور مجلس تحفظ اس بنیادی تجویز کو مان لیتی تو اس تنازعہ کا پُر اس طریقہ پر تصفیہ ہو گیا ہوتا۔ لیکن مجلس تحفظ نے حملہ آور کے مدعوں کو مان کر اسے اس جارحانہ حملہ کے پھل کھانے کے لئے آزاد چھوڑ دیا۔ ان حالات میں استعصاب رائے آزادانہ اور غیر جانبدارانہ استعصاب رائے کا مذاق اڑانا ہی نہیں بلکہ ریاست کے تحفظ کے لئے مریض خطرات پیدا کرنے کا موجب بھی ثابت ہوتا ہے

اور اس کے بعد موصوف نے بتگور میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ:-

"کشمیر اقوام متحدہ سے انصاف حاصل کرنے کے لئے تین سال تک صبر کے ساتھ انتظار کرتا رہا لیکن یہ جماعت کشمیر کے ساتھ انصاف کرنے میں کامیاب

نہیں ہوئی بلکہ مفاد پسند طاقتوں کو کثیر کے مسئلہ پر دوا فساد اور غیر متعلق

اثرات ڈالنے کا موقع دیتی رہی ہے۔

یہ سب ان احساسات کا خلاصہ ہوتا ہے کہ وسط میں ریاست جموں اور کشمیر کے باشندوں اور ان کے نمائندوں اور رہنماؤں کے ذہنوں میں پیدا ہوا ہے جس سے اور جن کی تقدیر میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ چنانچہ ان احساسات کی فضا میں جب ۱۹۵۷ء کے وسط میں سرآون ڈکس کی تجاویز سامنے آئیں تو ریاست کے باشندوں اور رہنماؤں کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ مجلس تحفظ اس مسئلہ کو جس طریقہ پر طے کرنا چاہتی ہے وہ اس طریقہ پر سے طے کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اگرچہ مجلس تحفظ نے اس سوال کو طے کرنے کے لئے عوام کے خود ادا دینت کے اصول کو قیلم کر لیا ہے لیکن وہ اس پر عمل درآمد کے لئے جو طریقہ اختیار کرنا چاہتی ہے ان سے نہ صرف تعادم اور تقابلی ہی کو تقویت ملے گی بلکہ ایشیا کے اس حصہ میں مزید الجھنیں اور نزاکتیں بھی پیدا ہو جائیں گی۔ کثیر کے باشندوں کی سیاسی نمائندہ تنظیم نیشنل کانفرنس اس صورت حال کو غماز کے ساتھ دیکھتی ہوئی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ یہ صورت حال ریاست کی سالمیت اور خود مختاری کے لئے ایک عظیم خطرہ ہے اور وہ اس نتیجہ پر پہنچی تھی کہ مجلس تحفظ نے جائزہ جملہ آراء کے ساتھ پورائے راء رکھی ہیں ان کے پیش نظر مجلس کے بعض مفاد پسند اراکین سے جو اس معاملہ میں مداخلت کر کے ریاستی باشندوں پر اپنا فیصلہ نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ انصاف اور غیر جانبداری کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ چنانچہ

نیشنل کانفرنس نے اس نذر کی بناء پر کہ ہندوستان کے ساتھ ریاست کا

الحاق قانونی، اخلاقی اور سیاسی لحاظ سے بالکل جائز ہے اور ریاست کے باشندوں کو

کو ان کی سماجی ترقی کے ان مواقع سے محروم نہیں رکھا جاسکتا جو انہیں ہندوستان کے جزو لائیکم ہونے کی حیثیت سے حاصل ہونے چاہئیں۔ اس سنو سٹان اسمبلی کے سوال پر جمیدگی کے ساتھ غور کیا جانے لگا جس کا فکر ہندوستان کے آئین اور ریاست کے حکمران کے اس اعلان مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۵۲ء میں کیا گیا تھا جس کی بنا پر اختیارات عوام کے نمائندوں کو منتقل کئے گئے تھے۔

چنانچہ اکتوبر ۱۹۵۲ء میں کانفرنس کی جرنل کونسل نے مجلسِ عالمہ کو ہدایت کی تھی کہ وہ جلد از جلد ریاست کی دستور ساز اسمبلی طلب کرے۔

ایک طرف نوکشیہ کے باشندے، ہندوستان کے ساتھ اپنے الحاق کی توثیق نیز استصواب رائے عامہ کے متعلق ہندوستان کی شرط کو پورا کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھے اور دوسری طرف ابھی مجلسِ تحفظ نے اس رپورٹ پر غور بھی شروع نہیں کیا تھا جو سرٹو کسی نے پیش کی تھی لیکن یہ تعطل فردی ۱۹۵۲ء کے اواخر میں اس وقت ختم ہوا جب اس سلسلہ میں مجلسِ تحفظ کے روبرو، برطانیہ اور متحدہ امریکہ نے ایک ایسی مشترکہ قرارداد پیش کی جس کا مفہوم یہ تھا کہ:-

(الف) اقدامِ متحدہ کی طرف سے، سرٹو کسی کی بجائے مصالحت کرانے والے کسی دوسرے شخص کا فقرہ کیا جائے اور اسے ۱۳ اگست ۱۹۵۲ء نیزہ جنوری ۱۹۵۳ء کی قراردادوں کی بنیاد پر ریاست سے افواج کے اخلاء کا اہتمام کرانے کی ہدایت کی جائے۔

(ب) اسے ہدایت کی جائے کہ وہ نوکسن رپورٹ کی سفارشات (ریاست کی تقسیم) اور استصواب رائے کے دوران میں وہاں غیر ملکی افواج کے قیام پر برہمی

خود کرے۔

(د) اس قرارداد میں ہندو پاکستان سے کہا گیا تھا کہ اگر مصالحت کرانے والا اپنی کوششوں میں ناکام ہو جائے تو انہیں سہ اگست مسئلہ اور ۵ جنوری مسئلہ کی قراردادوں کی تشریح اور عمل درآمد کے سلسلہ میں ثالث کے فیصلوں کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ اور

(د) اس بات پر تنقید کی گئی تھی کہ ہندوستان نے کشمیر میں دستور ساز اسمبلی

کے قیام کی اجازت دے دی ہے۔

لیکن یہ امر محتاج تشریح نہیں کہ اس قرارداد میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جو اس سے پہلے سامنے نہ آچکی ہو۔ اور یہ قرارداد بھی ان ہی نظریات پر مبنی تھی جنہیں ہندوستان نے اس وقت تک بھی تسلیم نہیں کیا تھا۔ چنانچہ ہندوستان نے یکم مارچ ۱۹۵۷ء کو یہ قرارداد بھی منسوخ کر دی اس موقع پر ہندوستان کی طرف اس خیال کا اظہار کیا گیا تھا کہ:-

”ریاست آہستہ آہستہ کسی کسی طرز کی منظم زندگی اختیار کرتی جا رہی ہے۔“

حالت میں اگر مجلس تحفظ سرحدوں کی سفارش پر عمل کرے گی تو اس سے بہت زیادہ

نقصان پہنچے گا اس لئے اب اس معاملہ کے فیصلہ کو قریض ہی پر چھوڑ دیا جائیگا۔

اس کے بعد ۲ مارچ ۱۹۵۷ء کو مذکورہ بالا قرارداد کے محرکین نے اس میں ترمیم کر کے

اسے دوبارہ مجلس تحفظ کے دوبارہ پیش کیا۔ اس ترمیم شدہ قرارداد میں سے

استغراب رائے عامہ کے دوران میں ریاست میں غیر کی افواج کی موجودگی

بیز ریاست کی تقسیم کے شعور کو نکال دیا گیا تھا۔

1. S/2017 and S/P.V. 532, 21.2.51
2. S/P.V. 533, 1.3.51
3. S/2017/Rev.I, 21.3.51

لیکن ثالث کے فیصلوں کو تسلیم کرنے کے مشورہ کو علیٰ حالہ بردہ قرار دے دیا گیا تھا یہ تسلیم شدہ قرار داد ۳۰ مارچ ۱۹۵۱ء کو منظور کی گئی تھی لیکن اس پر رائے شماری کے وقت، ہندوستان (جو خود بھی جلسہ تحفظ کاڑکن تھا) سوویت یونین اور یوگوسلاویہ نے رائے نہیں دی تھی اور یوگوسلاویہ کے نمائندہ نے کہا تھا کہ:-

یہ طریق کار نہ صرف ناکامیاب ہی ثابت ہو گا بلکہ اس وقت افہام و تفہیم کے جو امکانات موجود ہیں انھیں بھی کمزور کر دے گا۔ مناسب یہ ہے کہ سرٹوکسن کی سفارش کے مطابق، اس معاملہ کو حل کرنے کے لئے فریقین ہی کو کوشش کرنے کا موقع دینا چاہیئے اور جلسہ تحفظ کو ان کے اختلافات کو کم سے کم کرنے میں ان کی امداد کرتے رہنا چاہیئے۔

بہر حال پاکستان نے اس قرار داد کو منظور کر لیا تھا اور مائیکل بیرچر کے الفاظ میں پاکستان کی اس منظوری کے اسباب یہ تھے کہ:-

اس میں کشمیر کی مجوزہ دستور ساز اسمبلی کی مذمت کی گئی تھی اور اس کے اس مطالبہ پر بایو انفرامی ہر ثبت کر دی گئی تھی کہ گفت و شنید اور مصالحت کی ناگہمی کی صورت میں تمام اختلافی امور کے متعلق ثالث کے فیصلوں کو تسلیم کیا جائے گا۔ لیکن ہندوستان نے اس قرار داد کو منظور کرنے سے انکار کر دیا تھا اور ہندوستان کے وزیر اعظم نے اسے مسترد کرتے ہوئے کہا تھا کہ:-

اصل قرار داد، حدود بر غیر معمولی اور قابل اعتراض تھی اور اگرچہ اس کی آخری شکل کسی قدر ترمیمی یافتہ ضرور ہے لیکن اس میں بھی بعض دفعات خصوصاً

1. S/P.V. 538 and 539, 29/30-3-51
2. The Struggle for Kashmir, P.118

ناشی سے تعلق رکھنے والی وفد (ایسی ہیں جو قطعاً ناقابلِ قبول ہیں)۔

ان حالات میں۔ ۳ مارچ ۱۹۵۱ء کی قرارداد کے مطابق اقوام متحدہ کے سرکاروں کو کس کی بجائے ڈاکٹر فرناک گرامہ کو کشمیر کے تنازعہ کو طے کرانے کے لئے اپنا نمائندہ مقرر کیا اور انہیں یہ ہدایت کی گئی کہ وہ تین ماہ کے بعد اپنی سرگرمیوں کی رپورٹ پیش کریں لیکن ڈاکٹر گرامہ ۳۰ جون ۱۹۵۱ء سے پہلے برصغیر نہیں پہنچ سکے۔ لیکن ان کے برصغیر ہند پہنچنے سے پہلے ہی۔ ۳۰ اپریل ۱۹۵۱ء کو یو ایچ کے سنگھ کی طرف سے جو اس زمانہ میں اپنے والد بہادر جہری سنگھ کی عدم موجودگی میں ان کے قائم مقام اور سربراہ ریاست تھے۔ ریاست کے لئے دستور ساز اسمبلی کے قیام کا اعلان کیا جانے لگا تھا۔

یہاں اس بات کو بھی ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ جس طرح ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کے وقت اس کے سلسلہ میں ہندوستان کی طرف سے کوئی تحریک نہیں کی گئی تھی اور الحاق کا فیصلہ ریاست کے حکمران نے وہاں کے عوامی رہنماؤں کی تائید اور حمایت سے مناماند اور رضا کارانہ طریقہ پر کیا تھا اسی طرح دستور ساز اسمبلی کے قیام کے فیصلہ میں بھی ہندوستان کو کوئی دخل حاصل نہیں تھا۔ حتیٰ کہ نومبر ۱۹۵۱ء میں جب مجلس تحفظ میں ڈاکٹر گرامہ کی پہلی رپورٹ پر بحث کی جا رہی تھی تو ہندوستان کے وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے ایک بیان میں اس معاملہ سے متعلق ہندوستان کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ:-

ہم نے مجلس تحفظ کے دو بار اپنے بیان میں اس بات کو بالکل واضح کر دیا ہے کہ جہاں تک ہمارا تعلق ہے کشمیر کی مجلس دستور ساز اسمبلی تحفظ کے کسی فیصلہ کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی اور وہ فیصلہ اپنی جگہ برقرار رہے گا۔

1. The Hindustan Times, 3.4.51

2. Two Nations and Kashmir P. 107

لیکن ہندوستان چوں کہ ابنا ہی سے کشمیر کے باشندوں کے حق خود انادیت کو تسلیم کرتا رہا ہے اس لئے وہ ریاستی باشندوں کی جائز سیاسی سرگرمیوں پر کسی مرحلہ میں بھی کوئی پابندی عائد نہیں کر سکتا تھا۔ بہر حال ان حالات میں کہ ہندوستان نے ۳۰ مارچ ۱۹۵۱ء کی قرارداد کو مسترد کر دیا اور کشمیر کے باشندوں نے بے نقیصی اور تذبذب کی حالت سے نجات حاصل کرنے کے لئے نہ صرف مجلس دستور ساز طلب کرنے کا فیصلہ ہی کر لیا تھا بلکہ انھوں نے ستمبر ۱۹۵۱ء میں اس کے انتخابات بھی کر لئے تھے، ڈاکٹر گرام نے برصغیر ہند پہنچنے کے بعد اکتوبر ۱۹۵۱ء میں اپنی پہلی رپورٹ پیش کی۔

ڈاکٹر گرام نے اپنی رپورٹ میں، ریاست جموں اور کشمیر سے افواج کے انخلا کی تجویز کو ہندوستان کے ایک معاہدہ کی صودت میں پیش کیا تھا۔ اس تجویز پر بیک وقت اور مسلسل عمل درآمد کو فرو دی قرار دیا تھا اور اس کی تعمیل و تکمیل کے لئے ۹۰ دن کی مدت مقرر کی تھی۔ اس تجویز کا خلاصہ یہ تھا کہ اس مدت میں

(الف) قبائلی ریاست میں مستقل طور پر نہ رہنے والے پاکستانی اور پاکستانی افواج کا انخلا عمل میں آجائے۔

(ب) (ریاست نام) آزاد کشمیر کی فوجوں کو وسیع پیمانہ پر منتشر اور غیر متحد کیا جائے۔

(ج) بیشتر ہندوستانی افواج کو واپس بلا لیا جائے۔ اور

(د) نوے دن کے بعد ہندوستانی افواج کی مزید ایسی عمل میں آئے اور

کشمیر کی ریاستی فوجوں میں تخفیف کی جائے کہ

ڈاکٹر گرام نے ناظم استصواب کے متعلق اپنی رپورٹ میں یہ سفارش کی تھی کہ:-

اس کے تقرر کے متعلق ہندوستان اس امر کا یقین دلائے کہ کشمیر کی حکومت

زیادہ سے زیادہ نوے دن کے اندر اس کا رسمی تقرر کر دے گی لہ

اور تاشی کے متعلق انھوں نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ

ریاست سے افواج کے انخلاء سے متعلق تمام تر اخلاقی مسائل میں اقوام متحدہ

کے نمائندہ کا فیصلہ قطعی اور قابل تسلیم ہوگا لہ

ہندوستان اس مجوزہ معاہدہ کے پہلے یعنی افواج کے انخلاء سے تعلق رکھنے والے

جزوہ کو اس شرط پر منظور کرنے کے لئے تیار تھا کہ نام نہاد آزاد کشمیر کی

تمام افواج کو غیر مسلح اور منتشر کر دیا جائے اور خط جنگ بندی کے پار

مقبوضہ علاقہ میں صرف چار ہزار مسلح شہری پولیس کو جس میں (نام نہاد)

آزاد کشمیر کے دو ہزار حامی بھی شامل ہوں باقی رکھا جائے اور اس کی کمان پاکستانی

افروں کی بجائے اقوام متحدہ کے مقرر کئے ہوئے افسروں کے ہاتھوں میں ہوتے

پاکستان مجوزہ معاہدہ کے اس جزوہ کو جس میں (نام نہاد) آزاد کشمیر کی افواج

کو منتشر اور غیر مسلح کرنے کی تجویز کی گئی تھی اس شرط کے ساتھ قبول کرنے پر آمادہ تھا کہ

نوے دن کے بعد بیشتر ہندوستانی افواج ہی کو نہیں بلکہ باقی ماندہ ہندوستانی

افواج کو واپس بلا لیا جائے۔ لیکن حواصل وہ یہ بات چاہتا تھا کہ خط جنگ بندی

کی دونوں اطراف میں چار چار فوجی بلا لیں مقرر رہیں لیکن اگر ان کی تعداد میں معمولاً

بہت فرق قائم رہے تو اس پر اسے کوئی اعتراض نہ ہوگا لہ

1-2. S/2375, 15.10.51

3-4. The Struggle for Kashmir

اقوام متحدہ کے توسط سے کشمیر کے سوال کو طے کرانے کی جس تندر کوششیں ہوتی رہی تھیں، گذشتہ صفحات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کی ناکامی کا بنیادی سبب یہ رہا تھا کہ ہندوستان اس تنازعہ میں پاکستان کو مساوی درجہ کا فریق تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھا اور وہ قانونی اور اخلاقی طور پر خود کو ریاست کے دفاع اور تحفظ کا ذمہ دار سمجھتا تھا اور جہاں تک قبائلیوں کے حملہ اور ریاست میں باقاعدہ پاکستانی افواج کے داخلہ کا تعلق ہے۔

اقوام متحدہ کے نمائندہ سرانوں نے ان امور کو بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی قرار دیا تھا جس کے بعد جارج اور مجروح کی مساوات کو تسلیم کر لینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن ہندوستان کے اس واضح اور غیر مبہم تاویع نظر کو جاننے کے باوجود ڈاکٹر گرام کے مجوزہ معاہدہ کے پہلے جزو کو قبول کرنے کے لئے جو شرط پیش کی تھی اس سے ایک مرتبہ پھر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ پاکستان مجبوتہ کی کسی معقول تجویز کو منظور کرنے پر آمادہ نہیں تھا جہاں تک اسے دن کے اندر ریاست جموں اور کشمیر کی طرف سے ناظم انصواب کے رسمی تقرر کا تعلق تھا ہندوستان نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ اس تقرر کے لئے مناسب وقت وہ ہو گا جب خط جنگ بندی کی دونوں اطراف میں حالات اس کے لئے سازگار ہو جائیں گے اس لئے ہندوستان کی خواہش تھی کہ اس جزو کو، مجوزہ معاہدہ کے مودہ سے خارج کر دیا جائے۔ لیکن پاکستان اسے برقرار رکھنے پر مقرر تھا اور اگرچہ ہندوستان، ریاست سے افواج کے انخلاء کے سلسلہ میں پیدا ہونے والے اختلافات میں اقوام متحدہ کے نمائندہ کے نہایت فیصلوں کو تسلیم کر لینے کی تجویز کو نا منظور کر چکا تھا لیکن اس نے ڈاکٹر گرام کی اس سفارش پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ اور بعض اختلافات کے باوجود گرام رپورٹ کے متعلق، اقوام متحدہ میں مامور ہندوستانی مندوب سٹرنیچ رائے کے الفاظ میں ہندوستان کا رد عمل یہ تھا کہ :-

یہ رپورٹ منصفانہ ہے۔۔۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فریقین کے لئے قابل قبول

حل کا نکل آنا بعید از قیاس نہیں ہے لہ

اس کے برعکس اس رپورٹ کے متعلق، قواجم ناظم الدین کے الفاظ میں جو سرطریقت علی

خاں کے قتل کے بعد پاکستان کے وزیراعظم مقرر ہوئے تھے پاکستان کا دعوہ عمل یہ تھا کہ

ہمیں اس رپورٹ سے بے حد افسوس ہوا ہے اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ

اس میں حالات کو بہتر بنانے کی طرف کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا لہ

گرام رپورٹ کی اشاعت کے تین ہفتے بعد جب اقوام متحدہ کی مجلس عمومی (جنرل اسمبلی) کا چھٹا

سالانہ اجلاس پیرس میں منعقد ہوا تو مجلس تحفظ نے متحدہ امریکہ اور برطانیہ کی تحریک پر یہ قرارداد

منظور کی کہ:-

اقوام متحدہ کے نمائندہ کو، ریاست سے اقوام کے متعلق فریقین

کے درمیان سمجھوتہ کرانے کی کوششوں کو جاری رکھنا اور ہر حال میں چھ ہفتے کے

اند اندہ اپنی رپورٹ مجلس تحفظ کے پاس بھیج دینا چاہئے لہ

چنانچہ اس قرارداد کے مطابق ڈاکٹر گرام نے پیرس میں، دونوں ملکوں کے مندوبین سے

تبادلات خیالات کرنے کے بعد ۸ دسمبر ۱۹۵۱ء کو اپنی جو رپورٹ پیش کی اس میں اس بات کا

اعتراف کیا تھا کہ وہ چاروں اختلافی مسائل کا فوج کے انخلاء کی مدت، خود فوجوں کی واپسی،

انخلاء کی تکمیل کے بعد ریاست میں باقی رہنے والی افواج کی تعداد اور ناظم استصواب رائے

کے تقرر) میں سے کسی ایک پر بھی سمجھوتہ کرانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ لیکن انہوں نے آخری

1. The Hindustan Times 22.10.51

2. The Pakistan Times 23.10.51

3. S/2392, S/P.V. 566, 10.11.51

وزنکات پر زیادہ زور دیا تھا اور اپنی پہلی رپورٹ میں یہ ترسیلات تجویز کی تھیں کہ :-

(الف) ریاست سے افواج کے انخلاء کی کارروائی کو تیس دن کی بجائے

۵۰ جولائی ۱۹۵۲ء تک مکمل ہو جانا چاہیئے اور

(ب) افواج کی واپسی کی تکمیل کے بعد ریاست میں کم سے کم فوجیں رہتی چاہئیں

اور ان کی تعداد کاتبین، ہندو اور پاکستان کی ان افواج کے تناسب سے کیا جانا

چاہیئے جو یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو جنگ بندی کے وقت وہاں موجود تھیں۔

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ مجلس تحفظ نے ۳۱ مارچ ۱۹۵۲ء اور یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو

جو قراردادیں منظور کی تھیں، مصالحت سے متعلق ڈاکٹر گراہم کی تمام تر کوششیں ان ہی

قراردادوں پر مبنی تھیں اور ان میں غیر مبہم طریقہ پر ان امور کی یقین دہانی کی گئی تھی کہ —

قبائلیوں، باقاعدہ پاکستانی فوجوں اور ان پاکستانیوں کے، ریاست سے انخلاء کے بعد جو کشمیر

کے باشندے نہیں ہیں ہندوستانی افواج کا انخلاء شروع ہوگا لیکن ریاست کے دفاع اور داخلی

امن اور قانون کو برقرار رکھنے کی ضرورت کے پیش نظر وہاں مناسب تعداد میں ہندوستانی

افواج کو باقی رکھا جائے گا۔ لیکن ڈاکٹر گراہم نے اپنی دوسری رپورٹ میں افواج کی تعداد

کے متعلق جو سفارش کی تھی اس میں مذکورہ بالا یقین دہانی کا کوئی شاٹہ بھی باقی نہیں رہا تھا۔

اور ریاست سے متعلق ہندوستان کی دفاعی ذمہ داریوں کو نظر انداز کر کے اسے ریاست

میں برائے نام یا پھر تقریباً پاکستان کے مساوی فوجیں رکھنے کا پابند بنانے کی کوشش کی

گئی تھی۔ لیکن جیسا کہ آئندہ سطور سے واضح ہو سکے گا۔ مجلس تحفظ نے اقتدار پسندانہ سیاست

کے ماتحت ابتداء ہی سے کشمیر کے سوال کو طے کرنے کے لئے جو غیر حقیقت پسندانہ رویہ اختیار

کیا تھا اور جس کی بدولت پاکستان خود کو اس معاملہ میں ہندوستان کا مساوی الحیثیت فریق

سمجھنے لگا تھا، اس کی بناء پر پاکستان اب اپنے مقابلہ میں، ہندوستان کی اس مساوی حیثیت کو بھی برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر گرامش کی دوسری رپورٹ پر اظہار خیال کرتے ہوئے پاکستان کے وزیر اعظم نے کہا تھا کہ:-

ہم، پاکستانی، اب اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ مجلس تحفظ کبیر معاملہ بازداشت

اپنے ہاتھوں میں لے کر، ہندوستان کو اس بات کی ہدایت کرنی چاہیے کہ وہ اپنی

افواج کو ریاست سے واپس بلا لے اور اس کے بعد مجلس تحفظ کو اپنی نگرانی میں

آزادانہ استصواب رائے کراتا چاہیے۔

اس کے برعکس ڈاکٹر گرامش کی سفارشات سے متفق رائے نہ ہونے کے باوجود، ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے کلکتہ میں چار لاکھ افراد کے مجمع میں تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ:-

ہندوستان نے کثیر میں استصواب رائے کرانے کا جو وعدہ کیا تھا وہ اس

پر قائم رہے گا۔

ڈاکٹر گرامش کی دوسری رپورٹ کی اشاعت کے ایک ماہ بعد، جنوری ۱۹۵۲ء کے وسط میں جیپ مجلس تحفظ نے اس پر بحث شروع کی تو ڈاکٹر گرامش نے مجلس تحفظ کو بتایا کہ وہ ابھی تک افواج کے انخلاء کی مدت کے تعین، انخلاء کے بعد ریاست میں مقیم رہنے والی افواج کی تعداد، اور ناظم استصواب رائے کے تقرر کی تاریخ پر سمجھوتہ کرانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ لیکن جیپ کہ ہندوستان کے مندوب مسٹر بیٹل فادر نے کہا تھا:-

اگر بات طے ہو جاتی کہ افواج کے انخلاء کے بعد ریاست میں باقی رہتے

1. The Dawn, 27.12.51

2. The National Standard 2.1.52

والی افواج کی تعداد کیا ہوگی اور کتنی افواج کی واپسی ضروری ہے نیز یہ کہ بولائے عمل
طے ہو جائے اس پر اطمینان بخش طریقہ سے عمل درآمد ہو جائے گا تو باقی ماندہ دو ذیل
سوالات آسانی کے ساتھ طے ہو سکتے ہیں۔

مسٹر سنیل داد کے مذکورہ بالا بیان سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس مرحلہ پر عارضی
صلح کے معاہدہ میں جو چیز حائل تھی وہ صرف یہ تھی کہ افواج کے انخلاء کے بعد کشمیر میں ہندوستان
کی کتنی فوج مقیم رہنی چاہیئے۔ اس وقت تک کشمیر کے متعلق پاکستان کا بوطہ نہ عمل رہا تھا، ہندوستان
اسے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا اور وہ جانتا تھا کہ مجلس تحفظ کی ہدایت کے باوجود پاکستان نے ۱۹۴۷ء
میں اپنی باقاعدہ افواج کشمیر میں بھیجی تھیں اور جناب بندی کے بعد اس نے مجلس تحفظ کی واضح
ہدایت کے برخلاف نام نہاد آزاد کشمیر کی برائے نام افواج کو ایک زیر دست فوجی قوت میں
تبدیل کر دیا تھا اس لئے ہندوستان کے اس اندیشہ کو بے جا قرار نہیں دیا جاسکتا کہ پاکستان
آئندہ بھی کوئی ایسا قدم اٹھا سکتا ہے جس سے ریاست کا تحفظ خطرہ میں پڑ جائے اور چونکہ
ہندوستان پر ریاست کے تحفظ کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور ۱۳ اگست ۱۹۴۷ء کی قرارداد
میں بھی اس کی اس ذمہ داری کی توثیق کی جا چکی تھی اس لئے اس کے اس مطالبہ کو کسی طرح بھی
غیر منصفانہ قرار نہیں دیا جاسکتا کہ اسے ریاست سے اپنی افواج واپس بلا لینے کے بعد بھی وہاں
دفاعی ذریعہ نظر سے فوج کی معقول اور مناسب تعداد رکھنے کی اجازت حاصل ہونی چاہیئے۔ لیکن
پاکستان اس کے اس جائز مطالبہ کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ حتیٰ کہ اس نے ڈاکٹر گرامم
کی اس سفارش کو بھی مسترد کر دیا تھا جو انھوں نے اپنی دوسری رپورٹ میں، اس سلسلہ
میں ایک تبصرہ کی شکل میں پیش کی تھی۔

ان حالات میں جب مجلس تحفظ نے ڈاکٹر گرامم کی دوسری رپورٹ پر بحث شروع

کی تو، سوویت یونین کے مندوب مسٹر جیکب ملک نے پہلی مرتبہ کثیر کے سوال پر سوویت یونین کے نظریہ کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا تھا کہ :-

کیا وہ ہے کہ اپنا کثیر کا سوال طے نہیں ہو سکا اور متحدہ امریکہ نیز برطانیہ کی طرف سے اسے طے کرانے کے جتنے منصوبے بھی پیش کئے گئے وہ سب ناکام ثابت ہوئے ؟ اس بات کو سمجھ لینا کچھ مشکل کام نہیں کہ یہ منصوبے سامراجی ذہنیت پر مبنی تھے اور ان کا مقصد متحدہ امریکہ اور برطانیہ کی طرف سے کثیر کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنا، ہندوستان کے متنازعہ کو طول دینا اور کثیر کو اپنا ایک زیرِ حفاظت علاقہ بنا لینا تھا۔ اور سب کے بعد ان منصوبوں کا مقصد کثیر میں، متحدہ امریکہ اور برطانیہ کی قویوں کو بھیج دینا ہے جہاں تک مجلس تحفظ کی ۳۰ مارچ ۱۹۵۷ء کی قرارداد کے اس جزو کا تعلق ہے جس میں، کثیر کی مجوزہ دستور ساز مجلس پر تنقید کی گئی ہے اس کا مقصد ریاست کے اندرونی معاملات میں مداخلت کے علاوہ اور کچھ نہیں اور یہ امر اقوام متحدہ کے منشور کے اصول کی کھلی ہوئی خلاف ورزی ہے کثیر کا سوال کامیابی کے ساتھ اسی صورت میں حل ہو سکتا ہے کہ کثیر کے باشندوں کو ان کا دستور سے متقبل طے کرنے کا موقع دیا جائے اور اس معاملہ میں باہر سے کوئی مداخلت نہ کی جائے۔ یہ مقصد کثیر کی باشندوں کی طرف سے جمہوری اصول پر منتخب کی ہوئی ایک مجلس دستور ساز کے ذریعہ سے بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔

لیکن مسٹر جیکب ملک کی اس حقیقت افروز تقریر کے باوجود مجلس تحفظ اپنے نظریہ کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئی اور اس نے برطانوی مندوب کی تحریک پر ۳۰ جنوری ۱۹۵۷ء

کو یہ تجویز منظور کی کہ ڈاکٹر گراہم کو اپنی کوششیں جاری رکھتی اور دو ماہ کے اندر اپنی رپورٹ مجلس تحفظ کو بھیج دینی چاہیے۔

اس قرارداد کے مطابق ڈاکٹر گراہم نے ۲۲ اپریل ۱۹۵۲ء کو اپنی چوتھری رپورٹ پیش کی اگرچہ اس میں بھی اس بات کا اعتراف کیا گیا تھا کہ وہ افواج کے انخلاء کے سلسلہ میں سمجھوتہ کرانے سے قاصر رہے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے یہ اطلاع بھی دی تھی کہ:-

ہندوستان نے اپنی پیش تر افواج کا انخلاء شروع کر دیا ہے اور اس امر پر رضامند ہو گیا کہ وہ غیر مشروط، طور پر اٹھارہ ہزار سپاہیوں پر مشتمل اپنے ایک ڈویژن کو واپس بلائے گا اور اس طرح یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو کشمیر میں ہندوستانی افواج کی جو تعداد تھی وہ ۵۰ فی صد سے کم رہ جائے گی۔ پھر اس نے ۱۹۴۹ء کے موسم گرما میں پاکستان کی سرحد پر جو فوجیں بھیج دی تھیں انھیں بھی واپس بلا لیتے اور انھیں ان کی زائد امن کی چھادنیوں میں رکھے کا فیصلہ کر لیا ہے اور جہاں تک ناظم استصواب رائے کے تقرر اور کام شروع کرنے کا تعلق ہے اگر اس امر پر کوئی سمجھوتہ ہو جائے کہ افواج کے انخلاء کے بعد خط جنگ بندی کی دونوں اطراف میں کتنی فوجیں رہیں گی تو ہندوستان اس سوال (ناظم استصواب کے تقرر) پر بھی سمجھوتہ کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہ کرے گا۔

ڈاکٹر گراہم نے اپنی اس رپورٹ میں یہ بھی لکھا تھا کہ پاکستان نے اطلاع دی ہے کہ کشمیر سے قبائلی اور وہ پاکستانی جو معمولاً کشمیر کے باشندے تھے وہیں واپس چلے گئے ہیں اور یہ کہ یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو خط جنگ بندی کے پار پاکستانی افواج کی جو تعداد موجود تھی وہ اب نصف سے کم رہ گئی ہے اور آخر میں ایک مرتبہ پھر اس بات پر زور دیا تھا کہ سمجھوتہ کی راہ

میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ سوال ہے کہ افواج کے انخلاء کے بعد خط جنگ بندی کے دونوں طرف مقیم رہنے والی افواج کی تعداد کیا ہونی چاہیئے۔ ڈاکٹر گمراہم نے یہ بھی لکھا تھا کہ اس معاملہ میں ہندوستان اپنے بنیادی نظریہ پر قائم ہے اور دونوں ملکوں سے سفارش کی تھی کہ انھیں کشمیر میں اپنی فوجی قوتوں کو بڑھانے سے پرہیز کرنا چاہیئے، اپنے اس عدم پرقائم رہنا چاہیئے کہ وہ قوت کا استعمال نہیں کریں گے اور قوت کے استعمال کا کوئی موقع نہ آئے دیں گے جنگ بندی کو برقرار رکھیں گے اور ۱۵ جولائی ۱۹۵۲ء تک مزید افواج کو واپس بلا لیں گے اور آفریں انھوں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ انھیں ان کی کوششیں جاری رکھنے کی اجازت دی جائے اور اس کے ساتھ ہی امن خیال کا اظہار بھی کیا تھا کہ چوں کہ کشمیر سے افواج کے انخلاء کا آخری مرحلہ، استصواب راستے کے مرحلہ کے ساتھ گہرا تعلق رکھتا ہے اس لئے اس مرحلہ میں انھیں استصواب راستے کے مجوزہ ناظم ایڈمرنٹل کے ساتھ مشورہ کرتے رہنے کی اجازت دی جائے۔

اس مرحلہ پر ہندوستان، سمجھوتہ کی راہ میں حائل مذکورہ بالا سب سے بڑی رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے گفت و شنید پر رضا مند تھا لیکن اسے ڈاکٹر گمراہم کی اس تجویز کے ساتھ اتفاق رائے نہیں تھا کہ اس مرحلہ پر انھیں استصواب راستے کی مجوزہ ناظم ایڈمرنٹل، منفرکہ ساتھ مشورہ کرنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن اس موقع پر پاکستان کی طرف سے پھر یہ مطالبہ کیا جانے لگا کہ:-

جیسا کہ مجلس تحفظ کی قرارداد مورخہ ۳۰ مارچ ۱۹۵۲ء میں تجویز کیا گیا ہے

تقدم اختلافات کو ثالث کے سپرد کر دیا جائے لے

ڈاکٹر گمراہم نے مجلس تحفظ کے روبرو اپنی چوتھی رپورٹ ۱۶ ستمبر ۱۹۵۲ء کو پیش کی تھی

اور اراکتویر کو اپنے ایک طویل بیان میں اپنی اولہ اپنے پیشروں کی مساعی مصالحت کا احاطہ کرنے کے بعد انھوں نے اپنی ۶ جولائی ۱۹۵۲ء کی اس تجویز کو بے بنیاد قرار دے کر کہ پاکستان اپنی طرف تین ہزار سے چھ ہزار تک اور ہندوستان اپنی جانب بارہ ہزار سے اٹھارہ ہزار تک فوجیں رکھنے کا حق دار ہو گا یہ تجویز پیشین کی کہ اس پر دونوں ملکوں کے نمائندوں کے درمیان جنیوا میں مذاقاتی سطح پر گفت و شنید کر لی جائے۔ ان کی اس تجویز پر عمل درآمد کیا گیا لیکن یہ تجویز بھی کامیاب نہیں ہو سکی۔ اس کے بعد انھوں نے یہ تجویز پیشین کی کہ پاکستان اپنی طرف چھ ہزار افواج رکھے اور گلگت اسکاؤٹس کے نام سے تین ہزار پانچ سو افراد مشتمل جو بے قاعدہ فوج موجود ہے وہ اپنی جگہ باقی رہے اور ہندوستان کو اٹھارہ ہزار فوج رکھنے کی اجازت حاصل ہو اور اس میں کشمیر کے ریاستی بلیشیا کے چھ ہزار سپاہیوں کو شامل نہ سمجھا جائے لیکن ان کی یہ تجویز بھی یاد آؤ نہ ہو سکی جس کے بعد انھوں نے کشمیر میں باقی رکھی جانے والی افواج کے لئے یہ اصول تجویز کیا کہ:-

ان کی تعداد کم سے کم ہو اور یہ تعداد امن و قانون میں جنگ بندی کے معاہدہ کے تحفظ کے ناوہ نظر سے مقرر کی جائے اور اس کے ساتھ اسی استصواب داسے کی آئندہ کو بھی مد نظر رکھا جائے اور جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے اس کی طرف باقی رہنے والی افواج کے سلسلہ میں ریاست کے تحفظ کا بھی پوری طرح خیال رکھا جائے لہ

اسی طرح کسی قدر پیچیدہ الفاظ اور نامادہ ہی میں یہی لیکن ڈاکٹر گراہم نے بھی اپنی جگہ اس بات کو تسلیم کر لیا تھا کہ کشمیر کے تحفظ کی تمام ذمہ داری ہندوستان پر عائد ہوتی ہے اور

ڈاکٹر گراہم کی یہ تھی 1 S/2783, 19.9.52, S/P.V. 603. 10.10.52

پورٹ کا خلاصہ بھی ان ہی دستاویزات پر مبنی ہے۔

اسے اس قدر داری کو پورا کرنے سے بے ریاست میں اپنی افواہ مناسب لہذا دینے کے
حق حاصل ہے لیکن جیسا کہ اس تنازعہ کی گزشتہ پوری تاریخ سے واضح ہوتا ہے پاکستان
پھر کہ ریاست جموں اور کشمیر کے متعلق کسی ایسے حل کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھا
جو انصاف پر مبنی ہو اس لئے اس نے ڈاکٹر گراہم کی اس تجویز کو منظور کرنے سے منع
صرف انکار ہی کہ دیا بلکہ اس پر پاکستانی اخبارات، مدیرین حتیٰ کہ ارباب حکومت کی طرف
مختصر ترین تنقیدات بھی کی گئیں۔ چنانچہ اس تجویز پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈان
نے لکھا تھا کہ:-

... ہمیر بات واضح ہو گئی ہے کہ وہ (ڈاکٹر گراہم) آزاد اور نئے جانشین
نمائندہ نہیں ہیں.... سرحدی قبائل کا گرم خون کھول رہا ہے اور پاکستان کے
بائندوں کی بے اطمینانی ایک ایسے طوفان کی صورت اختیار کرتی جا رہی ہے
قانون دیکھنا ممکن نہیں ہو سکتا ہے

اس سلسلہ میں، پاکستان کی برسرِ حکومت جماعت مسلم لیگ نے اپنی کونسل کے اجلاس
میں جس میں صوبائی و ذلّٰ اعظم اور مرکزی کابینہ کے اراکین نے شرکت کی تھی، ایک قرارداد
میں اقوام متحدہ پر سخت تنقید کرتے کے بعد حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا تھا کہ اسے
ہر ممکن طریقہ سے کشمیر کے باشندوں کو آزاد کرنا چاہیئے۔
اور اس اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے، امرہ کشمیر کے وزیر ڈاکٹر محمود حسین نے اعلان
کیا تھا کہ:-

اگر اقوام متحدہ کو اس تعطل کے ختم کرنے میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی تو

ہم کوئی اہم قدم اٹھاتے ہیں آزاد ہوں گے لہ
حق کر مراد عبدالرب نیشنل نے بول اس زمانہ میں وزیر صنعت تھے اپنے ایک بیان میں
غیر مبہم طریقہ پر یہ بات کہی تھی کہ :-

کشمیر ہمارا ہے اور ہم اسے ہر ممکن طریقہ سے حاصل کر کے رہیں گے۔

میدان جنگ انتخاب میں رائے دہندگی کی جگہ نہیں ہے بلکہ اس کے (میدان جنگ)

لئے جبری اور بہادری آمیزوں کی ضرورت ہے لہ

پاکستان کے مذکورہ بالا رفرنس کے برعکس ہندوستان اس تجویز کو منظور کر لینے پر آمادہ

تھا چنانچہ اس کے متعلق ہندوستان کا نظریہ یہ تھا کہ :-

ریاست سے افواج کے اتحلاء سے متعلق ہم ستمبر ۱۹۵۲ء کی تجویز میں بواہل

تجویز کیا گیا ہے وہ صحیح بنیاد پر مبنی ہے اور اس تجویز میں سمجھوتہ کے عناصر موجود ہیں

بہر حال حالات کے اس پس منظر میں ۵ نومبر ۱۹۵۲ء کو متحدہ امریکہ اور برطانیہ کی جانب

سے مجلس تحفظ میں ایک نئی قرارداد کا جو مسودہ پیش کیا گیا اس کا مفہوم یہ تھا کہ :-

ہندو پاکستان کو فوراً اس سوال پر باہمی سمجھوتہ کے لئے گفت و شنید شروع

شرع کر دینی چاہیے کہ افواج کے اتحلاء کے بعد خط جنگ بندی کی دونوں اطراف

میں کتنی فوجیں رکھی جانی چاہئیں

قرارداد کے اس مسودہ میں ڈاکٹر گراہم کی تجویز کے مطابق پاکستان کو تین ہزار سے چھ ہزار

ہنگ اور ہندوستان کو بارہ ہزار سے اٹھارہ ہزار تک افواج رکھنے کا مشورہ بھی دیا گیا اور

1. The Struggle for Kashmir P.139

2. The New York Times 15.10.52

3. S/P.V. 605, 10.10.52, P.37

4. S/2839, 5.11.52

مملکت اسکاؤٹس نیز کشمیر کی ریاستی فوج کو اس تعداد سے علاوہ رکھا گیا تھا۔ ڈاکٹر گرام کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اپنی کوششوں کو جاری رکھیں اور ہندو اور پاکستان سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ اس قرارداد کی منظوری کے تیس دن کے اندر اپنی گفت و شنید کے نتیجے سے مجلس تحفظ کو مطلع کر دیں۔

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ ۵ نومبر ۱۹۴۷ء کی قرارداد کے مسودہ میں، افواج کے انخلاء کے بعد کشمیر میں ہندو اور پاکستان کی باقی رکھی جانے والی افواج کا ہونا مستقر کیا گیا تھا ہندوستان ابتدائی سے اسے نامنظور کر چکا تھا لیکن اس قرارداد پر تقریر کرتے ہوئے، برطانوی مندوب سر ٹیڈون جیب نے جن خیالات کا اظہار کیا تھا ان کی وجہ سے اس معاملہ میں مزید پیچیدگیاں پیدا ہونے کا امکان پیدا ہو گیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ: اب تک مجلس تحفظ میں اس سوال کو طے کرنے کے لئے جن خطوط پر کوششیں کی جاتی رہی ہیں، لندن ان سے ہٹ کر اسے طے کرنے کے امکانات کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

سر ٹیڈون جیب کی اس تقریر پر ترمیم کرتے ہوئے مائیکل بن بچرنے لکھا ہے کہ:-
اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکسن نے کشمیر کی تقسیم اور استصواب رائے کی جو فائدہ تجویز پیش کی تھی اسے فراموش نہیں کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ برطانوی مندوب نے فریقین کے عقد کے لئے یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ استصواب رائے کے دوران میں کشمیر میں غیر ملکی فوجیں رکھی جائیں۔ اور اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا تھا کہ برطانیہ اس امر کو استصواب رائے کی آزادی کے لئے موزوں نہیں سمجھتا کہ ہندوستان کی تجویز کے مطابق خطہ ہنگ بندی کی پاکستانی جانب صرف مسلح

شہری پولیس متعین رہے اور اسے (ہندوستان کو) اس کی طرف قورج رکھنے کی اجازت دی جائے لے

اور سرگلیڈون جیب کی مذکورہ بالا تقریر سے یہ اندازہ کھینچ لیتا کوئی مشکل کام نہیں رہ جاتا کہ ڈاکٹر گرہم نے اپنی ۴ ستمبر ۱۹۵۲ء کی تجویز میں کشمیر سے متعلق ہندوستان کی جن دفاعی اور داخلی ذمہ داریوں کو تسلیم کیا تھا برطانیہ ان کی توثیق کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس کے برعکس وہ کشمیر کو تقسیم کرانے اور وہاں غیر ملکی فوجیں بھجوانے کی طرف مائل تھا۔ اور اس معاملہ میں پاکستان اور ہندوستان کو ایک ہی سطح پر رکھنا چاہتا تھا لیکن کیا سرگلیڈون جیب کے ان خیالات سے ان شبہات کو تقویت نہیں پہنچتی تھی جو ۱۷ جنوری ۱۹۵۲ء کو ڈاکٹر گرہم کی دوسری رپورٹ پر تقریر کرتے ہوئے سوویت یونین کے مندوب سر جیکب ملک نے پیش کئے تھے ؟

یہ بات غلط ہے کہ ہندوستان ابتدا ہی سے جس تجویز اور نظریہ کو مسترد کرتا رہا تھا وہ اس پر حملہ نہیں اُسے منظور نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس تجویز کو مسترد کرتے ہوئے محترمہ دے لکشمی پٹیل نے کہا تھا کہ:-

کشمیر میں، اس کے تحفظ کے لئے کم سے کم ۱۰ ہزار ہندوستانی افواج کا رہنا ضروری ہے۔ بشرطیکہ دھام نہاد، آزاد کشمیر کی تمام افواج کو غیر مسلح کر دیا جائے۔ لیکن اگر کوئی متبادل توصلہ مقررہ کی جائے تو اُسے سوئے بازی اور کسی کو مطمئن کرنے کے خیال پر مبنی کرنے کی بجائے تحفظ کی حقیقی ضرورت کے مطابق مقرر کیا جانا چاہیئے۔ جہاں تک کشمیر میں غیر ملکی فوجوں کے بھیجنے کی تجویز کا تعلق ہے۔ ہمارے لئے یہ امر تعجب خیز ہے کہ ہمیں ان غیر ملکی افواج کو دیا

میں بلا لینے کا مشورہ دیا جاتا ہے جس کی واپسی ہماری آزادی کا ایک اہم پہلو ہے۔ ہمارے لئے یہ بات کوئی معنی نہیں رکھتی کہ یہ تجویز کس کی طرف سے پیش کی گئی ہے اور ان افواج کو کس لڑھٹاب سے ریاست میں بھیجنے کے لئے کہا جاتا ہے لیکن ہم کسی حال میں اس کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔

یہاں یہ بتا دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ متحدہ امریکہ اور برطانیہ کی اس مشترکہ قرارداد پر بحث کے دوران میں سر طر اللہ خاں نے یہ اعلان کیا تھا کہ:-

ہندوستان کو کشمیر میں ۲۸ ہزار فوج جس کی پابندی فوج میں بھی شامل ہو رکھنے کی اجازت دے دی جائے لیکن وہ وہاں سے اپنی بکتر بند فوج اور توپ خانہ کو ہٹائے ہم ۳۱ اگست ۱۹۴۷ء کی قرارداد کی تمام دفعات کو پورا کرنے کے لئے تیار ہیں۔ قبائلی اور پاکستانی رضا کار، ریاست سے واپس چاہئے ہیں اور پاکستانی اپنی افواج کو بھی واپس بلا لے گا۔

لیکن اس اعلان میں (نام نہاد) آزاد کشمیر کی فوجوں کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا تھا اور اس کے بڑے بڑے جنگی ہتھیاروں کو بھی نظر انداز کر دیا گیا تھا جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ اگر سر طر اللہ خاں کی اس پیش کش کو منظور کر لیا جاتا تو (نام نہاد) آزاد کشمیر کی افواج بکتر بند بکتر اور پورے سامان جنگ سے مسلح رہیں لیکن ہندوستان کو اپنے توپ خانہ اور اپنی بکتر بند فوج کو واپس بلا لینا پڑتا اور ظاہر ہے کہ ہندوستان اس تجویز کو کسی حال میں بھی منظور نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ ہندوستان کے وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے سر طر اللہ خاں کی اس تجویز پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ:-

1. S/P.V. 608, 8.12.52

2. S/P.V. 609, 16.12.52

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی صورت میں جب کہ ڈاکٹر گراہم افواج کی تعداد کو گھٹانے کے سوال پر بنیاد لاء خیالات کر رہے ہیں اور انہوں نے تجویز کیا تھا کہ پاکستان چند ہزار فوج رکھ سکتا ہے۔ سر طغرالد کی تجویز کے مطابق پاکستان کو کشمیر میں ۲۵ ہزار سے ۳۵ ہزار تک فوجیں رکھنے کا موقع مل سکتا ہے کیوں کہ وہ ان افواج کو پاکستان کی نہیں بلکہ (نام نہاد) آزاد کشمیر کی افواج کہتے ہیں۔ درحقیقت یہ ایک انوکھی تجویز ہے اور ان ہی لوگوں کو متاثر کر سکتی ہے جو سمجھ اور معاملہ کی اصلیت سے ناواقف ہیں لے

بہر حال ۲۳ دسمبر ۱۹۵۲ء کو جب کشمیر کے سوال اور اس قرارداد پر عام مباحثہ ہوا تو اس میں حصہ لینے والے مجلس تحفظ کے چھ اناکین میں سے پانچ نے اس قرارداد کی حمایت کی لیکن سوویت یونین کے مندوب سر طغرالد نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ:۔ کشمیر کے مستقبل کے سوال کو، باشندگان کشمیر کی ایسی مجلس متصور ساز ہی کو طے کرنا چاہیئے جسے وہ خود جمہوری اصول کی بنیاد پر منتخب کریں لے

اس کے باوجود مجلس تحفظ نے اسی روز متحدہ امریکہ اور برطانیہ کی ناکورہ بالا مشترکہ قرارداد کو منظور کر لیا اور اگرچہ ہندوستان نے اسے مسترد کر دیا تھا لیکن اس نے مصالحت کی بات چیت کرنے کے لئے اپنی آمادگی کا اظہار کیا۔

اس قرارداد کی منظوری کے بعد ڈاکٹر گراہم اور ہند اور پاکستان کے نمائندوں کے درمیان جو بات چیت ہوتی رہی اس کے نتیجے میں ۲۳ جنوری ۱۹۵۳ء کو ڈاکٹر گراہم نے مجلس کو یہ اطلاع دی کہ فریقین موجودہ تعطل کو ختم کرنے پر رضامند ہیں۔ چنانچہ فریقین کی اس

1. The New York Times 21.12.52

2. S/P.V, 611, 23,12,52

آبادگی سے قائدہ اٹھانے کے لئے ۱۹ فروری سے ۱۹ فروری ۱۹۵۳ء تک جلیو ایس، فریقین کے درمیان مصالحت کی جو گفت و شنید ہوتی رہی اسی کے دوران میں لڈاکر گراہم نے یہ تجویز پیش کی کہ :-

پاکستان کی جانب چھ ہزار مسلح فوج رکھی جائے لیکن یہ فوج پاکستان کی انتظامی اور فوجی کمان کے تحت نہ ہو اور اس میں آہن پوش فوج اور توپ خانہ کو شامل نہ کیا جائے۔ ہندوستان ریاست میں ۲۱ ہزار فوج رکھے لیکن اس میں ریاست کی مسلح فوج کو بھی شامل سمجھا جائے اور ہندوستان بھی اپنی آہن پوش فوج اور توپ خانہ کو واپس بلا لے لے

اور اس امر کے باوجود کہ ہندوستان ریاستی فوج کے علاوہ ریاست میں اپنی ۲۱ ہزار مسلح فوج رکھے پھر امر اکر نہ رہا تھا اس نے کشمیر میں ریاستی فوج کو شامل کر کے اپنی ۲۱ ہزار فوج رکھنے کی تجویز کو منظور کر لیا لیکن جہاں تک دھام نہاد (آزاد کشمیر میں چھ ہزار مسلح افواج رکھنے کی تجویز کا تعلق ہے اسے مسترد کرتے ہوئے اس نے اپنے اس مطالبہ کا اعادہ کیا کہ وہاں چار ہزار شہری مسلح پولیس رکھی جائے البتہ اس نے اس امر پر رضامندی کا اظہار کیا ہے کہ اس تعلقہ میں معمولی سا اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ دھام نہاد (آزاد کشمیر کی حکومت کو ختم کر دیا جائے۔ پاکستان کے مقرر کئے ہوئے افسر دست بردار ہو جائیں اور دھام نہاد (آزاد کشمیر کے مقامی حکام کے ساتھ حکومت پاکستان کا کوئی تعلق باقی نہ رہے۔ لیکن پاکستان نے ان مطالبات کو منظور کرتے سے انکار کر دیا اور اس کے بعد لڈاکر گراہم کو بھی کم و بیش ڈھائی سال کے بعد اس مسئلہ کو حل کرنے کے سلسلہ میں اپنی مساعی کی ناکامی کا اعتراف کر کے اس سے دست بردار ہو جانا پڑا۔

مجلس تحفظ کے دو برہ کشمیر کے تنازعہ کے پیش ہونے کے وقت سے ڈاکٹر گراہم کی مساعی مصالحت کی ناکامی کے وقت تک، کمیشن، جرنل مائٹن، سرائون ڈکسن اور خود ڈاکٹر گراہم کی طرف سے اس مسئلہ کو طے کرانے کے لئے جو تجاویز پیش کی جاتی رہی تھیں اور جو اقدامات کئے گئے تھے ان پر تبصرہ کرتے ہوئے مائیکل برنہ پچھنے کو کچھ لکھا ہے یہاں اس کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے:-

ڈاکٹر گراہم کی مصالحت سے جو مرکزی حقیقت واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ریاست سے افواج کے انخلاء کا سوال اس بات پر مبنی ہو کر رہ گیا ہے کہ افواج کے انخلاء کے بعد خط جنگ بندی کی دونوں جانب باقی رہنے والی افواج کی تعداد اور نوعیت کیا ہونی چاہیئے۔ لیکن جیسا کہ نوڈ ڈاکٹر گراہم نے اعتراف کیا ہے یہ ہی سوال اختلاف کی گہرائیوں کا مظہر بھی ہے۔ یہ سوال دونوں حکومتوں کے درمیان (۱) کشمیر کی حیثیت (۲) خط جنگ بندی کی دونوں جانب متعلقہ حکومتوں کی ذمہ داری کی نوعیت اور (۳) ۱۳ اگست ۱۹۴۷ء کو ۵ جنوری ۱۹۴۸ء کی متفقہ قرارداد اصل کے سلسلہ میں ان کے فرائض کے متعلق متضاد تصویلات کی بدولت پیدا ہوا ہے۔

اقوام متحدہ کے دو برو، اس تمام مدت میں ان ہی امور پر زور دیا جاتا رہا ہے اور مجلس تحفظ کی قراردادوں، مصالحت کرانے کے لئے کمیشن کی کوششوں، جرنل مائٹن اور سر آڈن ڈکسن کی تجاویز اور سب کے بعد ڈاکٹر گراہم کی مساعی کا بورڈ عمل ظاہر ہوتا رہا ہے وہ بھی ان ہی تصویلات کے مطابق تھا۔ پانچ سال سے زیادہ مدت تک ہندوستان اپنے اس دعویٰ پر قائم چلا آ رہا ہے کہ ہندوستان کے ساتھ کشمیر کا الحاق قانوناً جائز ہے۔ پاکستان نے

قبائلیوں کو کشمیر پر حملہ کرتے ہیں مدد دے کر اپنے ہمسایہ ملک کے خلاف جارحانہ اقدام اٹھایا ہے۔ اس لئے اسے استغواب رائے عامر سے متعلق کسی فیصلہ میں کوئی دخل حاصل نہیں ہونا چاہیئے لیکن پاکستان الحاق کو غیر قانونی قرار دیتا رہا ہے۔ وہ قبائلیوں کے حملہ کو جارحانہ اقدام تسلیم کرنے سے انکار کرتا رہا ہے اور کشمیر کے سلسلہ میں خود کو ہندوستان کا مساوی فریق قرار دے کر یہ دعویٰ کرتا رہا ہے کہ کشمیر سے فوجوں کے انخلاء کے ہر منصوبہ میں دونوں ملکوں کی مساوات کو مد نظر رکھا جانا چاہیئے۔

جہاں تک ریاست سے فوجوں کے انخلاء کے بعد وہاں باقی رکھی جانے والی فوجوں کی تعداد و امان کی نوعیت کا تعلق ہے اگرچہ یہ سوال تکنیکی حیثیت رکھتا ہے لیکن درحقیقت یہ ہی سوال سب سے زیادہ اہم بھی ہے۔ ہندوستان کشمیر میں ۲۸ ہزار افواج رکھنے یا ڈاکٹر گرامر کی تجویز کے مطابق اسے وہاں ۱۱ ہزار فوج رکھنے کا حق دیا جائے یا پاکستان کو ریاست میں ۵ ہزار سے ۶ ہزار تک فوج رکھنے کی اجازت دی جائے یا پھر ہند اور پاکستان دونوں ہی چار چار ہزار کی تعداد میں اپنی افواج کو وہاں رکھیں، یہ سوالات ایسے نہیں ہیں جنہیں حل نہ کیا جاسکے اور یہ استغواب رائے کے فیصلہ پر عمل درآمد کرنے میں بنیادی رکاوٹ کی حیثیت بھی نہیں رکھتے۔

کشمیر کے تنازعہ میں اصل اختلاف ان حبابی اختلافات سے کہیں سے زیادہ گہرا ہے اور یہ اختلافات، اس بنیادی اختلاف پر مبنی ہیں جو ہند اور پاکستانی کے درمیان، کشمیر کے تنازعہ کے ابتدائی اسباب، اس کے ارتقاء اور مفہوم پر اس سلسلہ میں اقوام متحدہ کے طرز عمل کے متعلق چلا رہا ہے

یہ اختلاف جیسا کہ جنوری ۱۹۴۸ء میں موجود تھا جون ۱۹۵۳ء میں بھی موجود ہے اور اگرچہ فریقین، عموماً افواج کے اتحاد اور استصواب رائے عام پر اتفاق رائے کا اظہار کرتے رہے ہیں لیکن ان کے درمیان کبھی بھی اقوام متحدہ کے نظر سے مطابق فوجوں کے اتحاد اور استصواب رائے پر اتفاق رائے نہیں ہو سکا اور اس وقت اس تنازعہ کا فیصلہ نہ ہو سکے کی وجہ بھی ان ہی اختلافات میں پوشیدہ ہے۔ اس لئے اگر اس خطرناک بین الاقوامی تنازعہ کا کوئی حقیقی اور مناسب حل دریافت کیا جاسکتا ہے تو اقوام متحدہ کو ان اختلافات کو سمجھنے اور دور کرنے کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے جو کشمیر کے معاملہ میں ہند اور پاکستان کے درمیان چلے آ رہے ہیں اور جب تک یہ نہیں کیا جائے گا یہ تنازعہ اپنی جگہ قائم رہے گا۔

ان حالات میں اقوام متحدہ کو ان بڑے بڑے بنیادی سوالات پر غور کرنا چاہیئے کہ — (الف) کیا ہندوستان کے ساتھ کشمیر کا الحاق قانوناً جائز تھا اور اگر جائز تھا تو کشمیر سے افواج کے اتحاد اور وہاں استصواب رائے کمرانے کے سلسلہ میں ہند اور پاکستان کی حیثیتیں کیا ہونی چاہئیں (ب) کیا پاکستان کشمیر یا ہندوستان کے خلاف جارحانہ حملہ کا مرتکب ہوا ہے؟ اگر ہوا ہے تو اقوام متحدہ کو بجا طور پر اس کے اس اقدام کی مذمت کرنی چاہیئے اور اسی حقیقت کے پیش نظر ریاست سے افواج کے اتحاد استصواب رائے اعلان میں پاکستان کے کردار سے متعلق اپنی حکمت عملی پر نظر ثانی کرنی چاہیئے لیکن اگر پاکستان جارحانہ حملہ کا مرتکب نہیں ہوا تو مجلس تحفظ کو علی الاعلان، پاکستان کے خلاف ہندوستان کے اس سب سے اہم الزام کو مسترد کر کے یہ اعلان کر دینا چاہیئے کہ چونکہ فریقین میں سے

کوئی بھی جارحانہ حملہ کا ترکیب نہیں ہوا اور دونوں ملک جغرافیائی لحاظ سے کشمیر کے ساتھ ملتے ہیں اس لئے، اقوام متحدہ کی طرف سے استصواب رائے کے لئے جو منصوبہ بھی بنایا جائے گا اس میں دونوں ملکوں سے مشورہ کیا جائے گا (رج) کیا ریاست میں کوئی جائز آئینی حکومت موجود ہے۔ اگر ہندوستانی کشمیر کی حکومت چاہو آئینی حکومت ہے تو کیا استصواب رائے سے پہلے اسے پوری ریاست کو اپنے زیرِ استقام لے آنے کا حق حاصل ہے؟ اور دوم جیسا کہ ہندوستان کا دعویٰ ہے کیا دنام نہاد (آناڈ کثیر کی فوج پاکستان کی تخلیق ہے یا پاکستانی کے قول کے مطابق وہ ایک ایسی خود مختار فوج ہے جسے ان کشمیریوں نے منظم اور مسلح کیا ہے جنہوں نے ہمارے خلاف بغاوت برپا کی تھی؟ اور میرا خیال ہے کہ کشمیر کے تنازعہ کا حل ان ہی سوالات کے جواب میں پوشیدہ ہے۔

مسٹر مائیکل بریجر نے ۱۹۵۳ء کے وسط تک، کشمیر کے تنازعہ کے مختلف مراحل اور اقوام متحدہ کی مساعی مصالحت پر جو تبصرہ کیا ہے وہ کسی مزید تشریح اور تبصرہ کا محتاج نہیں اور اس سے جو دو بنیادی حقیقتیں واضح ہوتی ہیں وہ یہ ہیں کہ اول تو اقوام متحدہ نے اس معاملہ کو طے کرانے کے لئے صحیح طریقہ کار اختیار نہیں کیا تھا اور دوسرے ہندوستان نے ابتدا میں جو موقف طے کیا تھا وہ اس پر قائم رہا تھا اور اس موقف کے دائرہ میں رہتے ہوئے وہ ہمیشہ اس تنازعہ کو طے کرنے کے لئے صرف تیار ہی رہا تھا بلکہ ہر ممکن کوشش بھی کرتا رہا تھا۔

بارہ سوال باب

چار سال کی مدت

کشمیر کے تنازعہ میں ڈاکٹر گرامہ کی مساعی مصالحت ۱۹۵۳ء کے آغاز میں ناکامی پر ختم ہوئی تھی اور اس ناکامی کے چار سال بعد ۶۱ - فروری ۱۹۵۴ء کو مجلس تحفظ نے اپنی ایک قرارداد کی رو سے سویڈن کے نمائندہ مسٹر گنہارنگ کو جو اس وقت مجلس تحفظ کے صدر بھی تھے ایک مرتبہ پھر اس تنازعہ کے تصفیہ کے امکانات دریافت کرنے پر مامور کیا تھا۔

ڈاکٹر گرامہ کے مشن کی ناکامی اور اس تنازعہ کے فیصلہ کے امکانات دریافت کرنے کے لئے مسٹر گنہارنگ کے تقرر کے درمیان تقریباً چار سال کی جو مدت گزری تھی اس میں ایک جانب تو ہند اور پاکستان کی حکومتوں کے درمیان اس تنازعہ کے تصفیہ کے لئے گفت و شنید ہوتی رہی تھی، دوسری جانب خود کشمیر کے حالات میں جتنا ایسی تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں جنہیں ہندوستان کے ساتھ اس ریاست کے الحاق کے فیصلہ کے سلسلہ میں بے حد اہمیت حاصل ہے اور جنہیں منظر انداز کر دینا ممکن نہیں ہو سکتا اور تیسری جانب بین الاقوامی سیاست میں بھی بعض ایسے تیزات واقع ہوئے تھے جو کشمیر کے تنازعہ پر اثر انداز ہوئے بغیر

نہیں رہ سکے تھے۔

ڈاکٹر گرام کامشن مارچ ۱۹۵۳ء میں ناکامی پر ختم ہوا تھا لیکن ان کی آخری سفارش کے مطابق ہند اور پاکستان کی حکومتوں نے باہمی گفت و شنید پر آمادگی کا اظہار کیا تھا چنانچہ جون ۱۹۵۳ء میں جب لندن میں دولت مشترکہ کے وزراء اعظم کی کانفرنس منعقد ہوئی تو ہند اور پاکستان کے وزراء اعظم نیٹ جواہر لال نہرو اور مسٹر محمد علی کے درمیان کشمیر کے سوال پر بھی تبادلہ خیالات ہوا اور یہ بات قرار پائی کہ اس معاملہ پر مزید بات چیت کراچی میں کی جائے گی۔

اس قرارداد کے مطابق ۲۵ سے ۲۷ جولائی ۱۹۵۳ء تک ہر دو وزراء اعظم کے درمیان کراچی میں جو مذاکرات ہوئے ان کے نتیجے میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ انھیں انجم کو پہنچانے کے لئے پاکستان کے وزیر اعظم کو دہلی آنا چاہیئے۔ لیکن ابھی یہ مذاکرات اسی مرحلہ پر تھے کہ ۹ اگست ۱۹۵۳ء کو کشمیر نیشنل کانفرنس کے رہنما اور ریاست کے وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ کی اس عہدہ سے استعفیٰ اور خطر بندی کی اطلاع موصول ہو گئی اور اگرچہ دفعۃً تبدیلی ہو جانے والے ان حالات میں کشمیر کے سوال پر دونوں ملکوں کی حکومتوں کے درمیان مزید گفت و شنید کو کچھ مدت کے لئے ملتوی کر دینا ہی مناسب معلوم ہوتا تھا اس کے باوجود وزیر اعظم پاکستان کے اصرار پر حکومت ہند مزید تبادلہ خیالات پر رضامند ہو گئی اور اس طرح ۱۶ اگست ۱۹۵۳ء کو وزیر اعظم پاکستان مسٹر محمد علی کے دہلی ہونے کے بعد دونوں ملکوں کے وزراء اعظم کے درمیان جو تبادلہ خیالات ہوا اس کے دوران میں ہندوستان کی طرف سے ایک مرتبہ پھر اس بات کی توثیق کی گئی کہ:-

یہ سوال ریاست کے باشندوں کی خواہشات کے مطابق ہی طے کیا جانا چاہیئے

اور وزراء اعظم کی اس کانفرنس میں پہلی بار یہ بھی طے ہوا تھا کہ استصواب رائے کے ناظم کو اپریل ۱۹۵۴ء سے پہلے آجانا چاہیے۔ اور جو مسائل اس وقت تک طے نہیں ہو سکے ہیں انہیں ماہرین کی کمیٹیوں کے سپرد کر دیا جانا چاہیے۔

ہند اور پاکستان کے وزراء اعظم کی مذکورہ بالا کانفرنس کے بعد حکومت ہند کی جانب سے جو قریطاس بعض دو ماٹ پیپر شائع کیا گیا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک استصواب رائے کا تعلق تھا یہ بات طے کی گئی تھی کہ تقریباً سرائون ڈکسن کے تصور کے مطابق استصواب رائے علاقہ وار کرایا جائے گا اور ایڈمرل نمٹن کی بجائے کسی ایسے ملک کے نمائندہ کو استصواب رائے کا ناظم مقرر کیا جائے گا جسے اقتدار پسند ملکوں کے دونوں گروہوں سے علحدہ اور بے تعلق کہا جاسکے۔

اس فیصلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے لارڈ برڈوڈ نے لکھا ہے کہ :

بلاشبہ مسٹر نہرو کی دونوں باتیں عقلمندی پر مبنی تھیں۔ بیرونی ممبر یہ ہمیشہ صرف وادی میں استصواب رائے کرائے جانے کو لازمی سمجھتے رہے ہیں لیکن علاقہ وار استصواب رائے اور صرف وادی میں استصواب رائے کو ملنے کی تجاویز میں فرق صرف یہ تھا کہ علاقہ وار استصواب رائے کے ذریعہ سے ان علاقوں کے باشندوں کی رائے کی توثیق ہو سکتی تھی جن کے باشندوں کی رائے پہلے ہی سے معلوم تھی اور اس طرح علیٰ طور پر علاقائی استصواب رائے کے ذریعہ سے صرف وادی کے باشندوں ہی کی رائے معلوم ہو سکتی تھی۔۔۔۔۔ اسی طرح (پنڈت جواہر لال نہرو کی) یہ بات بھی درست تھی کہ جو مالک اقتدار پسندی کے تصور کے ماتحت گروہوں میں منقسم ہیں انہیں دیکھ کر تنازعہ سے علحدہ رکھنا چاہیے کیونکہ جہاں جہاں اقوام متحدہ کو امن برقرار

دیکھنے کی ضرورت نہ لگتی ہے، ہاں اسی صورت کو مدنظر رکھا گیا ہے۔

لیکن ابھی ہندو اور پاکستان کے وزراء اعظم کے مذکورہ بالا فیصلہ کی سیاہی بھری نکتہ نہ ہونے پائی تھی کہ ایک طرف تو پاکستانی اختیارات اور رہنماؤں نے نہ صرف اس فیصلہ کی مخالفت ہی شروع کر دی بلکہ پاکستان میں ہندوستان کے خلاف جنگ اور چوہدری کے قتل بھی جہنم ہونے لگا اور دوسری جانب پاکستان کی جانب سے مذکورہ بالا فیصلہ کے نفاذ کے سلسلہ میں چند ایسے مطالبات بھی کئے جانے لگے جو ہندوستان کے بنیادی موقف کے خلاف تھے اور جنہیں ہندوستان ابتدا ہی سے نامنظور اور مسترد کرتا رہا تھا۔ مثلاً دہلی کی کانفرنس کے بعد، دونوں وزراء اعظم کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی اس میں پاکستان کی طرف سے یہ کہا گیا تھا کہ:

استقرار رائے کی غیر جانبداری کو برقرار رکھنے کی غرض سے یہ باہمی اتفاقیت (حکومت کشمیر) کی نگرانی ضروری ہے اور اس کام کے لئے یا تو کسی غیر جانبدار (مستقل) شخص کو، یا تقریباً ہونا چاہیئے یا ہندو اور پاکستان کا ایک مشترکہ کمیشن مقرر کیا جانا چاہیئے۔

لیکن بات ظاہر ہے کہ حکومت ہندو اول تو ابتدا ہی سے یہ راستی انتظامیہ کے کاموں میں مداخلت کی مخالفت ہی تھی اور دوسرے اس نے کسی مرحلہ پر بھی پاکستان کو ایک فریق کی حیثیت نہیں دی تھی اس لئے ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے مکتوب مورخہ ۲۵ ستمبر ۱۹۴۷ء میں اس مطالبہ اور تجویز کو منظور کرنے سے انکار کر دیا۔

صلو بلا لائیں یہ بات بتائی جا چکی ہے کہ ہندو اور پاکستان کے وزراء اعظم کی مذکورہ کانفرنس کے بعد حکومت ہند نے جو تقریریں امین (روٹاٹ پیس) شارل کیڈ، تو اس میں

1. Two Nations and Kashmir P.117

2. " " " " P.118

بتایا گیا تھا کہ دونوں وزراء اعظم کے درمیان علاقہ دار استقواب رائے کو ملنے اور ایڈمرل منٹز کی بجائے کسی غیر جانبدار ملک کے نمائندہ کو استقواب رائے کا ناظم مقرر کرنے پر اتفاق رائے ہو چکا ہے لیکن پاکستان کے وزیر اعظم کے مکتوب مورخہ ۳۱- اکتوبر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان فیصلوں سے بھی پوری طرح متفق الراء نہیں تھے۔ انھوں نے اپنے مکتوب میں لکھا

نہجی کہ :-

علاقہ دار استقواب رائے کے متعلق میرا تصور پبلک ٹبر کے تصور سے بہت زیادہ مختلف ہے اس لئے میں اس پر مزید غور کرنا نہیں چاہتا۔ اسی طرح میں ایڈمرل منٹز کے بجائے کسی اور کے ناظم استقواب رائے مقرر کئے جانے کو بھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ بلکہ

دہلی کانفرنسی کے بعد استقواب رائے کے سلسلے میں مسٹر محمد علی نے ایک اور سوال بھی اٹھایا تھا، انھوں نے وزیر اعظم ہند کے نام اپنے مکتوب مورخہ ۲۷- اگست میں لکھا تھا کہ کشمیر کے بجاہ گزنیوں کو جو ان کے علاقوں میں رائے دینے کی اجازت دی جائے لیکن جب پٹوٹ جواہر ل نہرو نے اس تجویز کو عملی رشتہ اداریوں کے پیش نظر اسے مسترد کر دیا تو مسٹر محمد علی نے اپنے مکتوب مورخہ ۳۱- اکتوبر ۱۹۵۳ء میں اپنی اسی تجویز کو دہراتے ہوئے لکھا تھا کہ :-

ہم دہلی میں اس بات پر متفق الراء ہو گئے تھے کہ استقواب رائے کے لئے کشمیری پناہ گزنیوں کی نوآباد کاری کے انتظار کی ضرورت نہیں ہے لیکن اس مطلب پر بھی نہیں اور مزید ہونا ہی چاہیئے کہ ان پناہ گزین (سراسق) شہریوں کو استقواب رائے کے موقع پر رائے دینے کے حق سے محروم کر دیا جائے۔

سچی کہ مسٹر محمد علی کے اس طرزِ عمل پر لارڈ وڈو کو بھی یہ لکھنا پڑا تھا کہ :-

ہیں اس بات پر تعجب ہے کہ اس سوال کو دہلی میں کہوں نہیں اٹھایا گیا تھا۔

مذکورہ بالا حوالوں سے اہلِ تہذیب و ادب کو جانتی ہے کہ پاکستان علاقہ دارا مستصواب رائے

اور ایڈمرل نمٹز کی جگہ کسی دوسرے شخص کے تقرر کے فیصلہ پر بھی قائم نہیں رہتا چاہتا تھا

اور دوسرے وہ ان ریاستی باشندوں کے حق رائے دہندگی کے سوال اٹھا کر جو پناہ گزین

کہلاتے تھے ان فیصلوں سے انحراف کی ایک نئی راہ پیدا کرنا چاہتا تھا حالانکہ خود مسٹر محمد علی

انحراف کے مطابق دہلی میں اس بات پر اتفاق رائے ہو چکا تھا کہ ان پناہ گزینوں کی نوآباد کاری

کو مستصواب رائے کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنایا جائے گا۔

پھر یہی نہیں بلکہ چند ہی روز بعد مسٹر محمد علی علاقائی مستصواب رائے کے فیصلہ سے بھی

دست کش ہو گئے تھے اور جہاں تک دہلی کے فیصلہ کے مطابق ایڈمرل نمٹز کی جگہ کسی دوسرے

شخص کو ناظم مستصواب رائے مقرر کرنے کا تعلق تھا، لارڈ وڈو کے الفاظ میں

یہ اطلاع موصول ہوئی تھی کہ مسٹر محمد علی نے اپنی پریس کانفرنس میں کہا ہے کہ

پاکستان ایڈمرل نمٹز کی بجائے کسی دوسرے شخص کے تقرر کو منظور نہیں کر سکتا۔ بلاشبہ

مسٹر محمد علی کا یہ بیان ان کے سابقہ فیصلہ کی کھلی ہوئی خلاف ورزی کی حیثیت رکھتا

تھا۔ مسٹر نہرو نے اپنے ہائی کمشنر مقیم کراچی مسٹر مونس سہاہی کی معرفت اس

بیان کے خلاف احتجاج کیا۔ وہ مسٹر محمد علی سے ملے لیکن مسٹر محمد علی نے یہ کہہ کر

بات کو ٹال دیا کہ اخبارات نے میری صحیح تہجیبی نہیں کی ہے۔

اور یہ بات ظاہر ہے کہ ان حالات میں ہندوستان تہذیبی کانفرنس کے فیصلوں کو عملی جامہ نہیں

پہنا سکتا تھا۔

پاکستان کی طرف سے دہلی کانفرنس کے فیصلوں کو ناکام بنانے کی جو سلسل کوشتیش کی گئی تھیں اور آخر میں مسٹر محمد علی نے ان تمام فیصلوں سے جس طرح انحراف کیا تھا اس کے پیش نظر اگر ہندوستان آئندہ کشمیر کے سوال پر پاکستان کے ساتھ گفت و شنید سے انکار کر دیتا تو بھی اس پر کسی قسم کا اعتراض نہیں کیا جاسکتا تھا لیکن دہلی کانفرنس کے فیصلوں سے پاکستان کے انحراف کے علاوہ کچھ اور ایسے حالات بھی رونما ہوئے تھے جنہیں حکومت ہند کے لئے نظر انداز کر دینا ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ ان نئے حالات کی بدولت کشمیر کے سوال کی نوعیت بالکل ہی بدل گئی تھی۔

سلطوبہ بالا میں بتایا جا چکا ہے کہ دہلی کانفرنس میں یہ بات بھی طے کی گئی تھی کہ جن مسائل کا ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا ہے انہیں ماہرین کی کمیٹیوں کے سپرد کر دیا جائے۔ اور اگرچہ اس فیصلہ کے بعد کے واقعات سے یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ پاکستان دہلی کانفرنس کے تمام فیصلوں سے انحراف کر رہا ہے اس کے باوجود جب دسمبر ۱۹۵۳ء کے شروع میں پاکستان کی طرف سے اس کمیٹی کے تفتیشی قریب کی گئی تو ہندوستان نے اسے حائل کر لیا اور مسٹر محمد علی کے مکتوب مورخہ یکم دسمبر ۱۹۵۳ء کے مطابق اس کمیٹی کو

۱۔ (الف) ریاست جموں اور کشمیر کو افواج سے خالی کرانے

(ب) نانم استصواب رائے کے باقاعدہ تقرر کے سلسلہ میں پیش آنے

والے مسائل کو طے کرنے اور

۲۔ ۲۰۔ اگست ۱۹۵۳ء کے مشورہ اعلانیہ (دہلی کانفرنس کے فیصلوں) کو

عمل میں لانے کے لئے دفعہ (۱) کے سلسلہ میں دوسرے ضروری اقدامات کرنے

کا کام سپرد کیا گیا اور اس کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا۔

ابھی ریاست جموں اور کشمیر کے سوال کو طے کرنے کی یہ کوششیں جاری ہی تھیں کہ پاکستان اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے درمیان قومی امداد کے معاہدہ کی بات چیت شروع ہو گئی اور اگرچہ اس معاہدہ کی ٹیکس مئی ۱۹۵۵ء کے تیسرے ہفتہ میں ہوئی تھی لیکن کشمیر کے سوال پر اس معاہدے کا جواز پڑ سکتا تھا اس کا اندازہ گفت و شنید کے آغاز ہی میں کر لیا گیا تھا۔ چنانچہ ہندوستان کے وزیر اعظم نیڈت جواہر لال نہرو نے اپنے مکتوب مورخہ ۲۱- دسمبر ۱۹۵۳ء میں مسٹر محمد علی کو معاہدہ کی اس بات چیت کی نوعیت واضح کرنے کے لئے لکھا تھا مگر انھوں نے اس کے جواب میں یہ کہہ کر معاملہ کو دست و گزشت کرنے کی کوشش کی تھی کہ قومی امداد لینے اور باقاعدہ قومی معاہدہ کرنے میں بہت زیادہ فرق ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ جواب ہندوستان کو مطمئن نہیں کر سکتا تھا۔

بہر حال اس ماحول میں جپ دہلی کانفرنس کے فیصلہ کے مطابق دسمبر ۱۹۵۴ء کے اواخر میں ریاست کو افواج سے خالی کرانے اور ناظم استصواب رائے کے باقاعدہ تقرر کے سلسلہ میں پیش آنے والے سوالات کو طے کرنے کی غرض سے دہلی میں ہند اور پاکستان کی طرف سے مقرر کی ہوئی مشترکہ کمیٹیوں کا اجلاس شروع ہوا تو ان میں امریکی امداد کا سوال بھی زیر بحث آیا اور مسٹر محمد علی نے اپنے خط مورخہ ۱۱- جنوری ۱۹۵۵ء کو اس معاملہ کو زیر بحث لانے پر اپنی تائید کی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ

اس معاملہ پر بحث کرنا کمیٹیوں کی حدود اختیارات سے باہر ہے۔

لیکن جیسا کہ آئندہ سطور سے واضح ہو جائے گا ہندوستان اس نئی صورت حال کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا اور پاکستان اس صورت حال کے سلسلہ میں کوئی اطمینان بخش جواب دینے کے لئے تیار نہیں تھا اس لئے ان کمیٹیوں کا کام جاری نہیں رہ سکتا تھا چنانچہ

جنوری ۱۹۵۴ء کے وسط میں ان کمیٹیوں کے کام کو غیر متین مدت کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔

باہمی گفت و شنید کے اس مرحلہ پر بھی ہندوستان تصفیہ سے متعلق اپنے تمام تر سابقہ فیصلوں اور پاکستان کے ساتھ کئے ہوئے تمام تر سمجھوتوں پر عمل درآمد کرنے کے لئے تیار تھا چنانچہ فروری ۱۹۵۴ء کے آغاز میں اجپ ریاست جموں اور کشمیر کے وزیراعظم بختی علام محمد نے دہلی میں ایک بیان دیتے ہوئے اس توقع کا اظہار کیا کہ کشمیر کی مجلس آئین ساز ہندوستان کے ساتھ ریاست کے الحاق کی تصدیق کر دے گی تو اخبار ڈیلی بزنسز اور لندن کے نامہ نگار مسٹر فلیس ڈیالے لکھا تھا کہ

جیسا کہ مجھے تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے ہندوستان کا زاویہ نظریہ ہے کہ مسٹر نہرو اب تک اپنے ۲۴ جولائی ۱۹۵۲ء والے بیان پر عمل درآمد کرنے کے لئے تیار ہیں..... بشرطیکہ اس بیان پر عمل درآمد کے سلسلہ میں ابتدائی باتوں کے متعلق بات چیت سے کوئی فیصلہ ہو جائے لیکن اب یہ بات چیت اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتی جب تک ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی طرف سے پاکستان کو ملنے والی امداد اور اس سلسلہ میں ان دونوں ملکوں کے درمیان ہونے والے معاہدہ کی تفصیلات معلوم نہ ہو جائیں۔

اور مسٹر ڈیالے کے مذکورہ بالا بیان کی تصدیق ہندوستان کے وزیراعظم نیپٹ جواہر لال نہرو کے ان بیانات سے بھی ہوتی ہے جو انھوں نے ۱۹ اور ۲۲ فروری ۱۹۵۴ء کو پارلیمنٹ میں دئے تھے اور جس میں انھوں نے کہا تھا کہ کشمیر سے متعلق

ہندوستان نے جو وعدے کئے ہیں وہ ان پر قائم ہے لیکن ان وعدوں کو روکنا ہو
والے دوسرے واقعات کی روشنی میں ضروری تبدیلیوں کے ساتھ پورا کیا جائے گا۔

پھر اسی قدر نہیں بلکہ ۲۴- فروری ۱۹۵۴ء کو جب مسٹر محمد علی نے اپنے ایک مکتوب میں وزیر اعظم کشمیر بخشی غلام محمد کے بعض بیانات اور ریاست کی مجلس دستور ساز کی طرف سے ہندوستان کے ساتھ ریاست کے الحاق کے فیصلہ کی تصدیق پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا کہ یہ باتیں اس سمجھوتہ کے خلاف ہیں جو دہلی میں ہمارے درمیان ہوا تھا تو وزیر اعظم ہند پینڈت جواہر لال نے ۵- مارچ ۱۹۵۴ء کو اس خط کا جواب دیتے ہوئے لکھا:

..... کشمیر کی آئین ساز اسمبلی کے سلسلہ میں ہماری پوزیشن بالکل صاف رہی ہے اور ہم مجلس تحفظ کے روبرو اور دوسرے مواقع پر اپنی اس پوزیشن کو واضح کرتے رہے ہیں۔ اس وقت (کشمیر کی آئین ساز اسمبلی کے قیام کے وقت) ہم نے کہا تھا کہ دستور ساز اسمبلی ریاست کے الحاق اور دوسرے معاملات سے مستقل فیصلہ کرنے میں بالکل آزاد ہے لیکن جہاں تک ہمارا تعلق ہے۔ ہم نے بین الاقوامی طور پر جو وعدے کئے ہیں ہم ان پر قائم نہیں گے۔ ہمارے ریاست کی آئین ساز اسمبلی کے فیصلوں کی تردید کرنے کا کسی وقت بھی کوئی سوال پیدا نہیں ہو سکتا ہے۔ ہمیں ایسا کرنے کا حق بھی نہیں پہنچتا۔ اس نتیجہ اسمبلی کو جس طرح وہ چاہے گی کی خواہشات کے اظہار کا حق حاصل ہے۔ ہمارے نقطہ نظر سے ہندوستان کے ساتھ ریاست کے الحاق کا اکتوبر ۱۹۵۳ء والا فیصلہ قانونی اور دستوری اعتبار سے بالکل مکمل ہے اور اب اس کی تصدیق و توثیق کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ان باتوں کے باوجود ہم نے کہا تھا کہ کشمیر کے باشندوں کو اپنی مرضی کے مطابق اپنا مستقبل طے کرنے کے لئے موقع دیا جانا چاہیئے اور ہم مناسب حالات میں استعما واپائے کرنے پر رضامند ہو گئے تھے۔ ہم اس تمام مدت میں اس شرط کے ساتھ اپنی بات پر قائم رہے ہیں کہ وہ مناسب حالات پیدا ہو جائیں جن میں ایسا مذاکرہ

اور پرامن استصواب رائے گرایا جاسکے اور چوں کہ ان شرائط پر اتفاق رائے

نہیں ہو سکا اس لئے اس دستصواب رائے میں دیر ہو رہی ہے۔

وزیراعظم نے مکتوب مورخہ ۵- مارچ ۱۹۵۴ء کے مذکورہ بالا اقتباس سے یہ جذباتیں بالکل صاف ہو جاتی ہیں کہ تغصیر کی راہ میں پاکستان کی طرف سے مسلسل رکاوٹیں ڈالے جانے کے باوجود ہندوستان براہ راست وعدوں پر قائم رہا تھا۔ ریاست کے الحاق کے فیصلہ کو قانونی اور دستوری طور پر صحیح اور آخری سمجھنے کے باوجود ہندوستان نے اپنی طرف سے مناسب حالات اور سازگار ماحول میں ریاست کے مستقبل کے متعلق عوام کی خواہشات معلوم کرنے کی جو پیش کش کی تھی ریاست کی مجلس آئین سازی کی جانب سے الحاق کی تصدیق کی شکل میں ان خواہشات کے اظہار کے بعد بھی اس نے اپنی اس پیش کش کو واپس نہیں لیا تھا اور یہ کہ ہندوستان کی مذکورہ بالا پیش کش جن شرائط کے ساتھ مشروط تھی وہ نہ صرف پوری ہی نہیں ہو سکی تھیں بلکہ ریاست متحدہ امریکہ کی طرف سے پاکستان کو فوجی امداد دینے کی جو بات چیت ہو رہی تھی اس نے ماحول کو اور بھی نا سازگار بنا دیا تھا اور ان حالات میں ہندوستان کے اس فیصلہ کو کسی زاویہ نظر سے بھی غیر مناسب قرار نہیں دیا جاسکتا کہ جب تک اسے پاکستان کو امریکہ کی طرف سے ملنے والی امداد کی تفصیلات معلوم نہ ہو جائیں مزید بات چیت کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکے گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کشمیر کے سلسلہ میں ہندوستان کی طرف سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور پاکستان کے درمیان فوجی امداد کی اس بات چیت کو جو بعد میں باقاعدہ معاہدہ کی شکل اختیار کر گئی تھی اس درجہ اہمیت کیوں دی گئی تھی ؟

اس بات کو تفصیل کے ساتھ دہرانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ اس وقت تک

کشمیر کے تنازعہ کو حل کرنے کے راستے میں واحد رکاوٹ یہ رہی تھی کہ ہندوستان ریاست کے

تحفظ کی ان ذمہ داریوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہتا تھا جو اکتوبر ۱۹۷۱ء میں ریاست کے اہل حق کے بعد اس پر عائد ہو گئی تھیں اور وہ ابستدہی سے اپنی ان ذمہ داریوں کو محسوس کرتا اور مجلس تحفظ کی اس طرف توجہ دلاتا رہا تھا اور اب جبکہ پاکستان بے کشمیر کے معاملہ میں غیر آئینی طور پر ایک فریق بنا دیا گیا تھا اور جو ہر حال میں ریاست جموں اور کشمیر کا اپنا حصہ بنا لینے پر تیار ہوا تھا، دیا کے ایک عظیم ملک سے فوجی امداد لینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ کیا ریاست جموں اور کشمیر کے تحفظ کے سلسلہ میں ہندوستان کی ذمہ داریاں پہلے سے کہیں زیادہ نہیں ہو گئی تھیں اور اس نے اس نئی صورت حال کے رد نہا ہونے سے پہلے پاکستان کے ساتھ تصفیہ کی جو بات چیت شروع کی تھی کیا ان نئے حالات میں اس بات چیت کو پرانی بنیادوں پر جاری رکھ سکتا تھا؟ خصوصاً اس حال میں تو بات چیت کو جاری رکھنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا جب کہ ہندوستان گفت و شنید کے ہر مرحلہ پر اس امر کو واضح کرتا رہا تھا کہ وہ فیصلہ کے سلسلہ میں ان نئے حالات کو نظر انداز نہیں کرے گا جو رونما ہوں گے اور ان نئے حالات کے مطابق وہ ضروری تبدیلیوں کے ساتھ اپنے وعدوں کو پورا کرے گا۔

ریاست اٹے متوہ امریکہ کی طرف سے پاکستان کو ملنے والی فوجی امداد کی وجہ سے ہندوستان کو جو خطرہ لاحق ہو سکتا تھا الارڈرڈ ووڈ جیسے پاکستان کے حامی نے اس کا اعتراف ان الفاظ میں کیا :-

میں کسی گزشتہ باب میں پاکستان کی اس فوجی برتری کی طرف اشارہ کر چکا ہوں جو ۱۹۷۱ء کی مختصر سی فوجی ہم میں ان حالات کی بدولت اسے حاصل ہو گئی تھی جن حالات میں ہندوستان 'جموں کے مغرب کی طرف سے گزرنے والے ناقابل استہمال اور ایسے راستے سے جس پر آسانی کے ساتھ حملہ کیا جاسکتا تھا، محاذ جنگ تک اپنی فوج بھیجنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس کے برعکس پاکستان

اپنی افواج کو بہت دورے چلنے بغیر متعدد متبادل مقامات میں سے کسی مقام کو بھی حملہ کے لئے منتخب کر سکتا تھا۔ اس صورت حال میں پاکستان نے امریکہ سے جو فوجی امداد لی تھی اس کے متعلق (پنڈت) نہرو کے اندیشوں کو ایک حد تک بجا کہا جاسکتا ہے۔ بلاشبہ (پنڈت جی کے) فوجی مشیروں نے اس صورت حال کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی تھی اور اس میں شک نہیں کہ اگر وہ ایسا نہ کرتے اور اس مسئلہ کو اپنے تحفظ کے نقطہ نظر سے نہ دیکھتے تو وہ اپنے فرض کو نظر انداز کر دینے کے جرم کے مرتکب ہوتے۔

لارڈ برٹ وڈ کی طرف سے ہندوستان کے اندیشوں کی اس تصدیق کے بعد یہ کہنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ پاکستان کو امریکہ سے فوجی امداد ملنے کے بعد ہندوستان نے نصفیہ کی بات چیت کو ملتوی کر کے اپنے کسی اصول یا وعدہ سے انحراف کیا تھا۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور پاکستان کے درمیان مذکورہ بالا فوجی امداد کی بات چیت سے قبل اور اس کے بعد کشمیر کے تنازع کو طے کرنے کے سلسلہ میں ہندوستان کا نقطہ نظر اوپر طرز عمل کیا رہا تھا؛ ہندوستان کے وزیر اعظم نے اپنے ایک بیان میں اس مضمون پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

ایوان کو یہ بات فراموش نہ ہو سکی ہوگی کہ ہم گزشتہ تین سال سے پاکستان کو یہ پیشکش کرتے رہے ہیں کہ ہمیں ایک دوسرے سے جنگ نہ کرنے کا ایک اعلامہ کر دینا چاہیے۔ . . . ہم برابر یہ پیشکش کرتے رہے اور اسباب خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہوں پاکستان برابر ہماری اس پیشکش کو نامنظور کرتا رہا ہے۔ اگر جنگ نہ کرنے کا یہ اعلان یا ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کا یہ معاہدہ ہو گیا ہوتا

تو ظاہر ہے کہ اس سے دونوں ملکوں اور گروہ پیش کے علاقوں میں کشیدگی کم ہو جاتی اور دونوں ملکوں میں سلامتی کا احساس بڑھ جاتا۔ اب پاکستان کی طرف سے ہماری اس تجویز (جنگ نہ کرنے کے اعلان کی پیشکش) کی نامنظوری کے پس منظر میں ہمیں اس امداد کا جائزہ لینا چاہیے جو ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی طرف سے پاکستان کو دی جا رہی ہے۔ میں یہ کہنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ آج کے حالات میں اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ چین یا ہندوستان کی طرف سے پاکستان پر حملہ کیا جائے گا۔

پھر امریکہ سے فوجی امداد لینے کے سلسلہ میں پاکستان حملہ کے اندیشے کا جو وعدہ پیش کر رہا ہے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا..... جہاں تک میرا تعلق ہے میں عام حالات میں پاکستان کے اقتصادی اور فوجی استحکام کا استقبال کروں گا اور اگر پاکستان اپنی تعمیر کرتا ہے تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا لیکن موجودہ صورت حال عام اور معمولی نہیں بلکہ غیر معمولی ہے۔ اس کی بدولت معمولی حالات میں انتشار پیدا ہو گیا ہے اور اسی لئے یہ صورتحال امن کی راہ سے انحراف ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر نے کہا ہے کہ اگر پاکستان نے امریکہ کی دی ہوئی امداد کو غلط طریقے سے استعمال کیا اور اس امداد سے دوسرے ملک پر جارحانہ حملہ کیا تو وہ اس حملہ کو ناکام بنانے کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ امریکہ کے صدر جارحانہ حملوں کے مخالف ہیں۔ لیکن ماضی کے تجربہ نے ہمیں بتایا ہے کہ جارحانہ حملے ہو جاتے ہیں اور انہیں ناکام بنانے کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا جاتا۔ چنانچہ آج سے ساڑھے چھ سال پہلے

کشمیر پر بھی جارحانہ حملہ ہو چکا ہے اور اس کے نتائج بے حد نقصان رساں برآمد ہوئے ہیں۔ لیکن اس وقت ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے صرف اس کی مذمت کرنے ہی سے گریز کیا ہے بلکہ امن کے نام پر ہم سے کہا جا رہا ہے کہ ہمیں پاکستان کی مذمت کے سوال پر زور نہیں دینا چاہیئے۔ اُسندہ بھی جارحانہ حملہ ہو سکتا ہے اور جب تک اس کا پوشیدہ رکھنا ناممکن نہ ہو جائے ماضی کی طرح اس جارحانہ حملہ سے بھی انکار کیا جاسکتا ہے۔ اگر جارحانہ حملہ کے لئے قصداً وہ حالات پیدا کر دئے جائیں تو ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی اس خواہش کے باوجود کہ جارحانہ حملہ نہ ہو یہ حملہ ہو کر رہے گا۔ اس کے بعد اس بات پر لمبی بحث کی جاتی رہے گی کہ یہ مسئلہ جارحانہ حملہ تھا یا نہیں اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی طرف سے پاکستان کو جو فوجی امداد دی گئی ہے اس سے ایسے حالات پیدا ہو سکے ہیں جن سے جارحانہ حملہ میں سہولتیں پیدا ہوں اور اس کی ہمت افزائی ہو سکے۔

جیسا کہ میں یاد رکھتا رہا ہوں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی طرف سے پاکستان کو دی جانے والی اس فوجی امداد نے ہندوستان میں ہمارے ہی لئے نہیں بلکہ یورپ کے ایشیائی ممالک کے لئے ایک خطرناک صورت حال پیدا کر دی ہے۔ اس کی وجہ سے ہماری کشیدگیوں بڑھ گئی ہیں اور اس کی بدولت ان سوالات کو حل کرنا اور بھی دشوار ہو گیا ہے جو ہند اور پاکستان کو درپیش ہیں۔ ہند اور پاکستان دونوں کے لئے ان سوالات کو حل کرنا اور ان دوستانہ تعلقات اور اس اشتراک عمل کو ترقی دینا بے حد ضروری ہے جو دو ہمسایہ ملکوں کی جغرافیائی پوزیشن اور مشترک تاریخ کے تقاضوں پر مبنی ہیں۔ ان سوالوں کو خود دونوں ملک اپنی اپنی طرف سے حل نہیں کر سکتے ہیں انھیں دوسروں کی مداخلت کے ذریعہ سے حل نہیں کیا

جاسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ماضی میں دوسرے ملکوں کی اس مداخلت کے باعث اب تک یہ سوالات طے نہیں ہو سکے۔ حال ہی میں ہندو اور پاکستان کے درمیان ایک نیا دوستانہ ماحول پیدا ہو گیا تھا اور دونوں ملکوں کے وزراء اعظم کی براہ راست گفت و شنید کی بدولت ان مسائل کو حل کرنے کے سلسلہ میں پیش رفت ہو رہی تھی۔ لیکن اب یہ پیش رفت رک گئی ہے اور نئی دشواریاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی طرف سے پاکستان کو جو فوجی امداد دی جا رہی ہے (ہندو اور پاکستان کے) ان مسائل میں ایک قسم کی مداخلت ہے اور اس کی بدولت سابقہ اقسام کی مداخلتوں کے مقابلے میں زیادہ دُور رس نتائج برآمد ہو سکے ہیں۔ پاکستان کے وزیر اعظم نے کہا ہے کہ..... یہ فوجی امداد کشمیر کے سوال کو حل کرنے میں مدد دے گی۔ اس (بیان) سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ان کا ذہن کس سمت میں کام کر رہا ہے اور وہ اس فوجی امداد کو کس طرح کام میں لانے کی بات سوچ رہے ہیں۔ فوجی امداد صرف جنگ کے لئے یا جنگ کی دھمکی دینے ہی کے لئے استعمال کی جاسکتی ہے۔

کشمیر کے متعلق ایک بات اور بھی ہے۔ ایوان کو اس تنازعہ کی طویل تاریخ یاد ہوگی اور یہ بات بھی فراموش نہ ہونی ہوگی کہ پچھلے دو سال سے جن سوالات پر بات چیت ہوتی رہی ہے ان میں یہ سوال بھی شامل رہا ہے کہ استصواب رائے کرانے سے پہلے کشمیر میں رکھی جانے والی اور وہاں سے واپس بلائی جانے والی افواج کی تعداد کیا ہونی چاہیئے۔ اس سوال پر اب تک کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکا۔ اب جبکہ سرحد کے پار، خطہ جنگ بندی کی دوسری جانب، انہجوں کی ایک بہت بڑی تعداد باہر سے پاکستان میں بھیجی جا رہی ہے۔ اور ان فوجوں

کہ پاکستان کی مرضی پر چھوڑا جا رہا ہے۔ اس تمام سوال کو ایک بالکل مختلف زاویہ نظر سے دیکھا جانا چاہیئے۔ اس نئی صورت حال نے معاملہ کی نوعیت میں بہت بڑا فرق پیدا کر دیا ہے۔

کشمیر کے سلسلہ میں ہندو اور پاکستان کی گفت و شنید کو ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور پاکستان کے درمیان فوجی امداد کی مذکورہ بالا بات چیت اور اس کی بنیاد پر ہونے والے معاہدے ہی نے متاثر نہیں کیا تھا بلکہ اس تنازعہ کے شروع ہونے کے بعد سے بین الاقوامی حالات میں جو عظیم تبدیلیاں رونما ہوتی رہی تھیں تصفیہ کی کسی بات چیت میں انہیں بھی منظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ مثلاً ۱۹۴۹ء میں ناٹو (North Atlantic Treaty Organization) کا قیام عمل میں آیا تھا اور اس میں ان تمام بڑی طاقتوں کے علاوہ جن کی بدولت اس وقت تک کشمیر کا سوال حل نہیں ہو سکا تھا، ترکی بھی شامل تھا۔ پھر جب ۱۹۵۴ء میں ناٹو کی طرح جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں کی ایک تنظیم سیٹو (South East Asia Treaty Organization) کے نام سے قائم کی گئی تو اس میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور برطانیہ کے ساتھ پاکستان بھی شامل ہو گیا اور جب ۱۹۵۵ء میں مغربی ایشیا کے ملکوں کی تیسری فوجی تنظیم بنسداد پیکٹ (Central Treaty Organization) کے نام سے عالم وجود میں آئی تو یہ محض پاکستان، ایران، ترکی اور عراق پر مشتمل تھی اور اس طرح پاکستان ایک طرف تو براہ راست سیٹو کا رکن ہو چکا تھا دوسری طرف وزیراعظم کے اس بیان کا اقتباس جو انہوں نے یکم مارچ ۱۹۵۶ء کو پارلیمنٹ میں دیا تھا۔

2. North Atlantic Treaty Organization
3. South East Asia Treaty Organization
4. Baghdad Pact

(نوٹ: اس تنظیم کا نام سنٹرل ٹریٹی آرگنائزیشن {Central Treaty

Organization) کر دیا گیا ہے۔ لیکن عراق اس میں شامل نہیں رہا۔

طرت ترکی، برطانیہ اور امریکہ کی وساطت سے ناٹو کے ساتھ بھی اس کا تعلق قائم ہو گیا تھا اور
تیسری طرت بغداد پیکٹ پر مبنی تنظیم میں اسے ایک ممتاز حیثیت حاصل تھی اور ان تمام باتوں نے
اس فوجی امداد کو خصوصیت کے ساتھ قابلِ توجہ بنا دیا تھا جو اسے ریاست ہائے متحدہ امریکہ
اسے مل رہی تھی اور ہندوستان کے لئے جو ابتداء ہی سے فوجی معاہدوں اور فوجی گروہ بندیوں
کا مخالفت رہا ہے کشمیر کے تنازعہ کے سلسلہ میں ان اہم واقعات کو نظر انداز کر دینا ممکن نہیں
ہو سکتا تھا۔

باب کے آغاز میں اس اس بات کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ گواہم مشن کی ناکامی
کے بعد خود کشمیر کے حالات میں بھی بعض ایسی تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں جنہیں ہندوستان کے
ساتھ اس ریاست کے فیصلہ کے سلسلہ میں بے حد اہمیت حاصل تھی اور جنہیں نظر انداز کر
دینا ممکن نہیں ہو سکتا تھا اور اس باب کو ختم کرنے سے پہلے انجمن کے ساتھ ان تبدیلیوں
کا تذکرہ کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

گزشتہ اوراق میں اس بات کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا جا چکا ہے کہ اکتوبر
۱۹۴۷ء میں ریاست جموں اور کشمیر پر چار حادہ حملہ کے بعد ریاست کی سب سے بڑی عوامی
سیاستی تنظیم نیشنل کانفرنس کی حمایت سے ریاست کے حکمران ہماراجہ ہری سنگھ نے اپنے ان
اختیارات سے کام لے کر جو ہندوستانی ریاستوں کے حکمرانوں کو، ۱۹۴۷ء کے انڈین انڈپنڈنس
اکٹ کے ماتحت دئے گئے تھے، ریاست جموں اور کشمیر کا اطلاق ہندوستان کے ساتھ کیا تھا
اور اس کے بعد یہ ریاست ہندوستان کا ایک ملایفک حصہ بن گئی تھی۔ اس صورت میں ہندوستان
اپنی فوجی طاقت کو کام میں لا کر حملہ آوروں کو ریاست سے نکال سکتا تھا لیکن اس نے
اپنی فوجی طاقت کے استعمال کو صرف دفاعی اور حفاظتی حدود تک ہی محدود رکھا تھا اور اس
امر کے پیش نظر کہ اقوام متحدہ کی اخلاقی مداخلت کی بدولت ایک جانب تو دو ہمسایہ ملکوں

— ہند اور پاکستان — کے تعلقات زیادہ خوش گو اور پائدار اور محفوظ ہو سکیں گے اور دوسرے کشمیر کے مستقبل پر بین الاقوامی تصدیق کی ہر ثبوت ہو سکے گی۔ کشمیر کے سوال کو مجلس تحفظ میں پیش کر دیا تھا۔ لیکن مجلس تحفظ میں اس سوال کو جس طرح بین الاقوامی سیاست اور اختلافات کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا تھا اس کی بدولت یہ سوال طے ہونے کی بجائے پیچیدہ تر ہو گیا تھا۔ تھا اور یہ بڑھتی ہوئی پیچیدگیاں خود ریاست کے باشندوں کے مستقبل کو نقصان پہنچا رہی تھیں۔

ریاست جموں اور کشمیر کے باشندے ابتداء ہی سے اس صورت حال اور اس کے نتائج کو محسوس کر رہے تھے۔ انھیں بجا طور پر اس بات کا احساس تھا کہ مجلس تحفظ کشمیر کے الحاق کے متعلق کسی مناسب فیصلہ پر پہنچنے میں جو نا واجب تاخیر کر رہی ہے اس کی بدولت ریاست کی سماجی اور اقتصادی ترقیاں رک گئی ہیں اور وہ اپنی آنکھوں سے یہ بات دیکھ رہے تھے کہ ہندوستان کی دوسری ریاستیں جمہوری ترقیوں کے تمام میدانوں میں آگے بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ ہندوستان کی طرف سے جب کشمیر کے سوال کو مجلس تحفظ میں پیش کیا گیا تھا تو نیشنل کانفرنس اور ریاست کے باشندوں کی اکثریت کو اس بات کا یقین تھا کہ ہندوستان کے اس اقدام کی بدولت انھیں اپنے مستقبل کے متعلق اپنے سابقہ فیصلہ دہندوستان کے ساتھ الحاق کے فیصلہ کی توثیق کا موقع مل سکے گا۔ چنانچہ اس الحاق کے پورے ایک سال بعد اکتوبر ۱۹۴۸ء میں انھوں نے نیشنل کانفرنس کے ایک اسپیشل کنونشن میں جو قرارداد منظور کی تھی اس میں کہا تھا کہ :

..... اس لئے ان حالات میں یہ کنونشن ہندوستان کے ساتھ عارضی الحاق

کی تصدیق کرتا ہے اور اس بات کا عہد کرتا ہے کہ 'نیا کشمیر' کی بنیاد پر جس کا

عہد کشمیر کی تعمیر اور ترقی کا وہ اعلامہ جسے نیشنل کانفرنس نے نومبر ۱۹۴۷ء میں اپنا نصب العین قرار دیا تھا

نفاذ اور تکمیل ہمارا سب سے پہلا کام ہو گیا۔ ہم ہندوستان کے ساقی رہا
کے قطعی الحاق کی حمایت کریں گے۔ یہ کنونشن بدلیتیں تک اس امر کا اہم حصہ
کہتا ہے کہ ہندوستان کی حکومت اور عوام کی جانب سے اکثریت کے باشندوں
ان کی اقتصادی تعمیر کا نصب العین اور سیاسی آزادی کا مقصد حاصل کرنے
میں تمام تر مادی، اخلاقی اور سیاسی امداد دی جائے گی۔^۱

اور کنونشن کے مذکورہ بالا فیصلہ پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے، نیشنل کانفرنس کے سابق رہنما شیخ محمد
نے کہا تھا:

حقوں اور کثیر نیشنل کانفرنس کے بلائے ہوئے اسپیشل کنونشن نے ملک کے بعد
ایک واضح راہ کھول دی ہے۔ ایک سال تک سخت مصیبتوں میں مبتلا رہنے
تبع تجربات کرنے اور غور و فکر کرتے رہنے کے بعد انجام کار ہم نے ایک ایسا
فیصلہ کر لیا ہے جو ریاستی باشندوں کی آنے والی نسلوں پر بھی اثر انداز ہوگا
ہم اپنے اس فیصلے پر خوش ہیں کیونکہ ہمارا یہ فیصلہ اسلام کے اصول کے بھی
مطابق ہے۔^۲

پھر انھوں نے نیشنل کانفرنس کے اسی فیصلہ کی اصابت پر زور دیتے ہوئے دہلی میں ایک
اخباری نمائندہ سے کہا تھا کہ:

ہم جموں اور کشمیر کے باشندوں نے ہندوستانیوں کے ساتھ اپنے مفاد
کو جذبات کی زد میں نہ کر لیا۔ پھر بالواسطہ کی حالت میں وابستہ نہیں کیا بلکہ
ہم نے جو کچھ کیا ہے پوری طرح سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ ہمارے عوام کا یہ اند
ہمارے نظریات کی یکسانیت اور آزادی کے حصول کی جدوجہد میں ایک قدم ہے۔

کے دوش بدوش بیٹیں جھیلے کا نتیجہ ہے۔ ہندوستان نے غیر مذہبی جہود

کے قیام کا جھد کیا ہے اور ہمارا مقصد بھی یہ ہی ہے یہ

جہوں اور کشمیر کشمیر کا نعرہ ہندوستان کے ہندو ریاست کے الحاق کے متعلق چورائے رکھتی تھی

اس کے پیش نظر قدتی طور پر اس کی خواہش یہ ہی ہو سکتی تھی کہ ریاست کے باشندوں کو

جلد از جلد ان کے فیصلہ الحاق کی توثیق کا موقع دیا جائے اور اس طرح ہندوستان کے ساتھ

ریاست جہوں اور کشمیر کے الحاق پر اقوام متحدہ کی ہر تصدیق بھی ثابت ہو جائے۔ لیکن

جب انھوں نے محسوس کیا کہ مجلس تحفظ میں کچھ ایسے طاقت ور عوامل کام کر رہے ہیں

جن کی بدولت ریاستی عوام کی خواہشات کے مطابق اس سوال کو طے کرنے میں غیر ضروری

تماخیر جاری ہے اور جب انھیں اس بات کا یقین ہو گیا کہ جب تک مجلس تحفظ کے

اراکین کے ذہن اور دماغ میں اقوامی کشمکش کے اثرات سے پاک نہ ہوں گے مجلس تحفظ

عوام کی خواہشات کے مطابق کشمیر کے سوال کا کوئی اطمینان بخش حل دریافت نہ کر سکے گی تو

انھوں نے بے یقینی کی اس حالت کو غم کرنے کا ارادہ کر لیا۔

نتیجہ مہر عید انڈیٹے جو اس وقت ریاست کے باشندوں کی حیرتزدہ جانی کر رہے تھے

نیشنل کانفرنس کے انیسویں اجلاس میں اسی صورت حال کا احاطہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ :

اقوام متحدہ کے منشور میں اقوام کی بنیادی آزادیوں کے اعلان کے

بعد ہی ہمارے ملک کو کسی اشتغال کے بغیر وحشیانہ حملہ کا نشانہ بنایا گیا تھا

ہم نے اس جارحانہ حملہ کو جس کے نتیجے میں ریاست کے ہزار ہا باشندوں کو

ناقابل بیاہی مہیتوں کا شکار ہونا پڑا ہے، ختم کرانے کے لئے ادارہ اقوام متحدہ

کی توجہ دلائی لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ ہمارے لئے یہ بات بے حد

تجربہ آئین ہے کہ حملہ آور کے جرم کے متعلق کوئی واضح فیصلہ صادر کرنے کی بجائے ہمارے حق (الحاق) اور ہندوستان کی نیک نیتی کا ثبوت طلب کیا جا رہا ہے اور مندرجہ سے ان ہی بنیادی اصولوں کو نافذ کرنے سے انکار کرنے کی بدولت ادارہ اقوام متحدہ کشمیر کے سوال کو پرامن طریقہ پر طے کرنے کے سلسلہ میں اپنی تمام کوششوں میں برابر ناکام ہو رہا ہے۔ ریاست کے مستقبل کے سوال کو ریاستی حوام کی خواہش کے مطابق طے کرنے کے پردہ میں مجلس تحفظ ایسے ایسے عجیب و غریب طریقے اختیار کرتی رہی ہے جن کا الحاق کے سوال کے ساتھ کوئی دور کا تعلق بھی نہیں تھا۔ ہم نہایت غلوں اور ایمان داری کے ساتھ بار بار یہ تجویز پیش کرتے رہے ہیں کہ چون کہ ریاست کے باشندوں کے مستقبل کا سوال خود ان ہی سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اس اہم سوال پر انھیں ان کی رائے ظاہر کرنے کا موقع دیا جائے اور اس کے لئے ہمارا مطالبہ یہ رہا ہے کہ ریاست میں حملہ سے پہلے جیسے حالات پیدا کئے جائیں اور اس بات کی ضمانت دی جائے کہ آئندہ کوئی حملہ نہیں ہوگا۔ اس تمام مسئلہ کا چوڑی یہ ہے کہ اگر مجلس تحفظ ہماری اس بنیادی تجویز کو مان لیتی تو اس کی بدولت اس سوال کا پرامن حل دریافت ہو سکتا تھا، لیکن مجلس تحفظ نے عملہ آور کے دعووں کو تسلیم کر کے اسے اس حملہ سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا ہے۔

اور انھوں نے بنگلور میں منعقدہ آل انڈیا کانگریسی کمیٹی کے اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ

کشمیر اقوام متحدہ سے انصاف حاصل کرنے کے لئے تین سال تک نہایت

ممبر کے ساتھ منتظر گزار رہا ہے لیکن یہ جماعت کشمیر کے ساتھ انصاف کرنے میں ناکامیاب ثابت ہوئی ہے اور مفاد پرست طاقتوں کو کشمیر کے سوال کے حل پر پوری قوت کے ساتھ اثر انداز ہونے کا موقع دیتی رہی ہے۔

حالات کے اس پس منظر میں نیشنل کانفرنس اس نتیجہ پر پہنچی تھی کہ اول تو ہندوستان کے ساتھ ریاست جموں اور کشمیر کا الحاق 'قانونی' اخلاقی اور سیاسی طور سے بالکل درست ہے اور دوسرے ہندوستانیوں کا ایک حصہ ہونے کے باعث ریاست کی ترقی کو زیادہ مدت تک مسدود نہیں رکھا جاسکتا۔ اس لئے اگر مجلس تحفظ کشمیر کے باشندوں کو ان کی خواہشات کے اظہار کا کوئی مؤثر طریقہ اختیار کرنا چاہیے، چنانچہ اس نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے شیخ محمد عبداللہ نے امریکہ کے رسالہ 'لک' کے نمائندہ سے کہا تھا کہ:-

اگر مجلس تحفظ مستقبل قریب میں کسی فیصلہ پر پہنچے جس میں کامیاب نہیں ہو سکتی تو پھر یہ عوام کا کام ہے کہ وہ تذبذب اور بے یقینی کی موجودہ صورت حال کو ختم کرنے کے سلسلہ میں اپنی رائے کے اظہار کی غرض سے نو کوئی طریقہ کار اختیار کریں۔ اس حال میں وہ مجلس امین ساز طلب کریں گے۔ یہ دستور ساز اسمبلی ان کے موقف کا فیصلہ کرے گی اور وہ سب سوالات کے ساتھ ریاست کے الحاق کے سوال کو بھی لے کر آئے گی۔

ان حالات میں نیشنل کانفرنس کی جنرل کونسل نے اکتوبر ۱۹۵۱ء میں ایک قرارداد منظور کر کے کانفرنس کو ہدایت کی تھی کہ وہ بے یقینی کی موجودہ صورت حال کو ختم کرنے کی غرض سے ریاست سے متعلق تمام ترامیم سوالات کو طے کرنے کے لئے دستور ساز اسمبلی طلب کرے۔ اسی طرح ستمبر ۱۹۵۱ء میں انتخابات کے بعد جموں اور کشمیر کی مجلس دستور ساز عالم وجود

1. The Hindu, July 5, 1951 (Look)

2. Kashmir Decides its Destiny Pp. 9, 10

ہیں آئی تھی اور اس کا پہلا اجلاس ۱۳- اکتوبر ۱۹۵۱ء کو سری نگر میں منعقد ہوا۔ اس دستور ساز اسمبلی کا مقصد جہاں ریاست اور اس کے باشندوں کے مستقبل کو آخری طور پر متین کر دینا تھا وہاں اسے ریاست کا آئین مرتب کرنے کا کام بھی سپرد کیا گیا تھا۔

کشمیر کی یہ اسمبلی ساز اسمبلی ابھی اپنے فرائض کی ادائیگی میں مصروف ہی تھی کہ جولائی ۱۹۵۲ء میں حکومت ہند اور اس اسمبلی کے درمیان 'معاہدہ دہلی' کے نام سے ایک سمجھوتہ عمل میں آیا جس کی رو سے (۱) کشمیر کی حکومت کے داخلی اختیارات (۲) شہریت کی شرائط (۳) بنیادی حقوق (۴) ریاست جموں اور کشمیر پر سپریم کورٹ آف انڈیا کے اختیارات (۵) بینش فلیگ (۶) صدر جمہوریہ ہند (۷) ریاست کے صدر (۸) مالی الحاق (۹) ہنگامی صورت حال سے متعلق قانونی اختیارات اور ہند پارلیمنٹ کے دونوں ایوانات میں ریاست کی نمائندگی جیسے امور کا فیصلہ کیا گیا۔ اس سمجھوتے کے متعلق شیخ محمد عبداللہ نے جو کشمیر کی طرف سے سمجھوتہ کرنے والے وفد کے سربراہ تھے، دہلی سے واپس آنے کے بعد جموں کے ایک عام جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ

یہ معاہدہ صرف کاغذی معاہدہ نہیں بلکہ دونوں کا ایک ایسا اتحاد ہے جسے دنیا کی کوئی طاقت بھی مجزور نہیں کر سکتی۔

اس طرح ایک جانب تو مجلس تحفظ کے غیر حقیقت پسندانہ طرز عمل اور پاکستان کے غیر صلح پسندانہ رویہ کی بدولت ڈاکٹر گرامم کا مشن ناکامیابی کی منزل تک پہنچتا جا رہا تھا اور دوسری طرف خود کشمیر کے باشندے آہستہ آہستہ اپنے مستقبل کے تعین اور تعمیر کے راستہ پر چل رہے تھے اور گرامم مشن کی ناکامیابی کے بعد جیجپ، انجیب، اس بات کا کامل یقین ہو گیا کہ ادارہ اقوام متحدہ ان کے مسئلہ کو حل نہیں کر سکتا تو، انھوں نے ۶- جنوری ۱۹۵۴ء کو اپنی

مجلس دستور ساز کے توسط سے ہندوستان کے ساتھ ریاست کے الحاق کے اس فیصلہ کی تصدیق کر دی جو اکتوبر ۱۹۴۷ء میں کیا گیا تھا۔

اسی قدر نہیں بلکہ ریاست جموں اور کشمیر کی دستور ساز مجلس کی طرف سے الحاق کی تصدیق سے پہلے ہی اس الحاق کے متعلق کشمیر کے باشندوں کے جو احساسات تھے ان کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ ٹائمز آف انڈیا کی ایک رپورٹ کے مطابق ریاست کے وزیر اعظم بنٹی غلام محمد نے بارہ مولا میں ایک تقریر کرتے ہوئے ۲ ستمبر ۱۹۵۳ء کو کہا تھا کہ استعواب رائے ہو یا نہ ہو کشمیر میں عام احساس یہ ہے کہ ہم ہندوستان کے ساتھ رہ کر بالکل محفوظ ہیں۔ اقتصادی، کچل اور سماجی حالات نے ہماری تقریر کو ہندوستان کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے اور اب کوئی طاقت بھی اس رشتہ کو نہیں ٹوڑ سکتی۔

اور ٹریبون مورنہ ۳۰ ستمبر ۱۹۵۳ء کی ایک رپورٹ کے مطابق انھوں نے لیگن میں ایک تقریر کے دوران میں ان احساسات کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا کہ:

پاکستان کشمیریوں کی لاشوں پر سے گزر کر ہی کشمیر پر قبضہ کر سکتا ہے اور ہندوستان کے ساتھ ہمارے الحاق کا فیصلہ ناقابل شکست ہے۔

اس طرح ۱۹۵۴ء کے آغاز میں کشمیر کے سوال کی نوعیت یہ ہو گئی تھی کہ اول تو پاکستان کی طرف سے دونوں ملکوں کے وزراء اعظم کے اس معاہدہ کی پابندی نہیں کی گئی تھی جو انھوں نے دہلی میں کیا تھا، دوسرے امریکہ کی طرف سے پاکستان کو دی جانے والی فوجی امداد نے کشمیر کی صورت حال کو بالکل بدل دیا تھا اور تیسری جانب خود کشمیر کے باشندوں نے اپنی منتخب دستور ساز اسمبلی کے توسط سے صرف ہندوستان کے ساتھ ریاست کے الحاق کی تصدیق

ہی کر دی تھی بلکہ وہ کسی حال میں بھی اپنے اس فیصلہ کو بدل لینے کے لئے تیار نہیں تھے اور ان حالات میں خود ہندوستان کے لئے بھی یہ بات ممکن نہیں ہو سکتی تھی کہ ریاست کے باشندوں نے اس پر جو اعمتا دیکھا تھا وہ ان کے اس اعمتا کو برقرار نہ رکھے کیونکہ جیسا کہ ہندوستان کی جانب سے بار بار اعلان کیا جاتا رہا تھا وہ اس وقت بھی ان تبدیل شدہ حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے کثیر کے سوال پر بات چیت کرنے اور کسی قابل عمل فیصلہ پر پہنچنے کے لئے تیار تھا۔

ان حالات میں مئی ۱۹۵۵ء میں ایک مرتبہ پھر مسٹر محمد علی اور نڈت جواہر لال نہرو کے درمیان دہلی میں ملاقات اور گفت و شنید ہوا اور اس ملاقات کے بعد دونوں وزراء اعظم کی طرف سے جو مشترکہ بیان شائع کیا گیا تھا وہ بجائے خود اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندوستان نے اس مرحلہ پر بھی کثیر کے سوال پر بات چیت کرنے اور کسی سمجھوتہ پر پہنچنے سے انکار نہیں کیا تھا۔ چنانچہ اس مشترکہ اعلان میں کہا گیا تھا کہ

گفت و شنید کے دوران میں کثیر کے سوال کے تمام پہلوؤں پر پوری طرح غور کیا گیا اور یہ بات لے ہوئی کہ اس گفت و شنید کے دوران میں جو نکات زیر بحث آئے تھے دونوں ملکوں کی حکومتوں کو ان پر بھی طرح غور کرنے کے بعد کسی دوسرے موقع پر پھر گفت و شنید کرنی چاہیے۔

لیکن دونوں ملکوں کے وزراء اعظم کی اس ملاقات اور بات چیت کے سلسلہ میں لارڈ برڈوڈ نے اپنے جس اندازہ کو قلم بند کیا ہے یہاں اسے نقل کر دینا اس لئے خصوصیت کے ساتھ ضروری معلوم ہے کہ اس سے ہندوستان کے موقف پر روشنی پڑتی ہے۔ لارڈ برڈوڈ نے لکھا ہے کہ۔

..... یہ بات بالکل واضح ہے کہ استعمارِ برائے کے بنیادی منصوبہ میں کسی

تغیر کے معاملہ پر بحث کی گئی تھی۔

اور ۱۸- مئی ۱۹۵۵ء کو ٹائمز (لنڈن) کے نامہ نگار مہتمم نئی دہلی نے اپنے اخبار کو جو اطلاع بھیجی تھی اس میں لکھا تھا کہ:

ایک حقیقت واضح ہو گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ کشمیر کے باشندوں کو الگ کی خواہش کے اظہار کے لئے استصواب رائے کی جو تجویز مبنی وہ بھی ماضی کی دوسری جمہوریت کی طرح مردہ ہو چکی ہے اور اب یہ بات طے ہوئی ہے کہ اگرچہ ریاست کا مستقبل اس کے باشندوں ہی کے فیصلہ پر منحصر ہے لیکن اب اس معاملہ میں ان کی خواہشات معلوم کرنے کے لئے کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔

اور مندرجہ بالا سوالوں سے یہ بات سمجھ میں کوئی دشواری باقی نہیں رہتی کہ ہندوستان کشمیر کے تنازعہ کو طے کرنا چاہتا تھا اس سے طے کرتے ہوئے وہ بین الاقوامی صورت حال اور کشمیری عوام کی خواہشات اور اقدامات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہتا تھا اور اس معاملے میں اس کا نقطہ نظر اس درجہ صاف اور واضح تھا کہ لارڈ برٹ و وڈ جیسے پاکستان کے دوست کے اعتراف کے مطابق مئی ۱۹۵۵ء میں پاکستان کے وزیر اعظم مسٹر محمد علی کو بھی ہندوستان کے زاویہ نظر کی احاطیت کو تسلیم کرنا پڑا تھا لیکن خود لارڈ برٹ و وڈ کے الفاظ میں:

یہ معلوم ہوتا تھا کہ مسٹر محمد علی نے مئی ۱۹۵۵ء میں جو ردش اختیار کی تھی

وہ ان کی کابینہ کی نمائندگی نہیں کرتی تھی۔

اور لارڈ برٹ و وڈ ہی نے مئی ۱۹۵۵ء کی گفت و شنید کے متعلق تیا س آرائی اور اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

1. Two Nations & Kashmir P. 202-203
2. " " P. 202
3. " " P. 204

یہ بات صاف تھی کہ استقواب رائے کے بنیادی منصوبہ میں کسی تبدیلی کے سوال پر ضرورتاً دلخیزا لیا گیا ہے۔ اس تبدیلی کی تجویز کے ساتھ (مٹر) محمد علی نے اتفاق رائے کیا تھا یا نہیں؟ اس کے متعلق کچھ کہنا ممکن نہیں ہو سکتا لیکن اس معاملہ میں (کوئی صاف بات کہنے سے) وزیراعظم پاکستان کا گریز دیکھنے والوں کے لئے تعجب خیز ضرور تھا۔ ممکن ہے کہ اس وقت ان کی کابینہ اس نتیجہ پر پہنچی ہو کہ یہ وقت کشمیر کے معاملہ میں کوئی جرات مندانہ موقف اختیار کرنے کے لئے موزوں نہیں ہے۔ اس وقت پاکستان میں دستوراً بحران اپنے نقطہ عروج پر پہنچا ہوا تھا اور خود ریاست کے وجود کو عدالتوں میں چیلنج کیا جا رہا تھا اس لئے اس امر کا اندیشہ ہو سکتا تھا کہ اگر کشمیر کے معاملہ پر دہلی میں کوئی جرات مندانہ موقف اختیار کیا گیا تو یہ نہ کہا جائے کہ پاکستان کی حکومت کشمیر سے متعلق ذمہ داریوں کو قبول کرنے کی اہل نہیں ہے بلکہ

اور اس کے بعد لاڈلہ برڈ ووڈ نے اس رائے کا اظہار بھی کیا ہے کہ

پاکستانیوں کے ہاتھ سے جو میدان نکل گیا تھا ایسا معلوم ہوتا ہے وہ اسے

دوبارہ حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں۔

مذکورہ بالا اقتباسات سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں وہ یہ کہ مئی ۱۹۵۵ء کے مذاکرات میں یہ بات زیر بحث آئی تھی کہ استقواب رائے کے بنیادی منصوبہ میں تبدیلی کی جائے اور چونکہ ان مذاکرات کے بعد مٹر محمد علی اس مضمون معاملہ سے متعلق سوالات کا کوئی صاف جواب دینے سے گریز کرتے رہے تھے اس لئے یہ سمجھ لینا بے جا نہ ہوگا کہ وہ تبدیلی کی اس تجویز کے ساتھ متفق نہ تھے۔ ان کی کابینہ ان کے اس موقف کے ساتھ اتفاق رائے نہیں رکھتی تھی یا

پھر وہ خود اور ان کی کابینہ پاکستان کے دستوری بحران کے پیش نظر اس وقت کشمیر کے معاملہ میں کوئی جرات مندانہ موقف اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں تھے لیکن وہ دہلی میں جو فیصلہ کر گئے تھے اس پر قائم بھی نہیں رہنا چاہتے تھے اور اس سے فرار کے لئے مناسب وقت کے منتظر تھے۔

یہ بات ظاہر ہے کہ اگر پاکستان کے وزیراعظم اور ان کی کابینہ کے درمیان اس موقف کے متعلق جو مسٹر محمد علی نے دہلی میں اختیار کیا تھا کوئی اختلاف رہے موجود تھا تو اس کی ذمہ داری ہندوستان پر عاید نہیں ہو سکتی تھی۔ یا اگر مسٹر محمد علی اور ان کی کابینہ نے داخلی حالات سے مجبور ہو کر یہ موقف اختیار کیا تھا اور وہ اس پر قائم نہیں رہنا چاہتے تھے تو اس کے لئے بھی ہندوستان کو مورد الزام نہیں قرار دیا جاسکتا۔ لیکن اس موقف سے پاکستان کا گریز اس امر کا ایک تازہ ثبوت ضرور تھا کہ اس کے ارباب اختیار کشمیر کے سوال کو طے کرنا نہیں چاہتے تھے۔

بہر حال جولائی ۱۹۵۵ء میں جب ہندوستانیوں کے وزیر داخلہ پیٹل گو وند بھیر پست نے ایک پریس کانفرنس میں کشمیر کے سوال پر ہندوستان کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بات کہی کہ

ہندوستان کے ساتھ کشمیر کے افاق کے وقت حکومت ہند نے چند بیانات دیئے تھے اور یہ بات کہی تھی کہ ریاست کا مستقبل استصواب رائے کے ذریعہ سے طے کیا جائے گا۔ لیکن اس وقت کے حالات مختلف تھے اور اس وقت سے اب تک بہت سے (نئے) واقعات رونما ہو چکے ہیں۔

تو پاکستان نے اس بیان کو دہلی کے فیصلہ سے انحراف کا ایک عذر بنا کر یہ مطالبہ کیا کہ

اس بیان کی تردید کی جائے اور ہندوستان غیر مبہم الفاظ میں اس بات کی توثیق کرے کہ وہ کثیر سے متعلق اپنی بین الاقوامی ذمہ داریوں کو جن میں استعمار پر رائے عامہ بھی شامل ہے پورا کرے گا۔

لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ ہندوستانیوں کے وزیر داخلہ نے کثیر کے متعلق اپنے بیان میں کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی جسے ہندوستان کے موقف کے خلاف کہا جاسکے لیکن جیسا کہ لارڈ برڈ وڈ نے اعتراض کیا ہے پاکستان چونکہ خود اپنے موقف پر قائم رہنا نہیں چاہتا تھا اس لئے اس نے اس بیان کو اپنے انحراف کے لئے عذر بنا لیا لیکن ظاہر ہے کہ اُسے 'عذر لنگ' سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی تھی۔

گزشتہ سطور میں گراہم مشن کی ناکامی کے بعد سے ۱۹۵۶ء کے اواخر تک روٹنڈام والے جن حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے ان سے یہ باتیں بالکل صاف ہو جاتی ہیں کہ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں نیشنل کانفرنس کے ایک اسپیشل کنونشن نے، ہندوستان کے ساتھ ریاست جموں اور کثیر کے الحاق کے فیصلہ کی تصدیق کر دی تھی۔ پھر اکتوبر ۱۹۵۰ء میں نیشنل کانفرنس کی جنرل کونسل نے اپنی ایک قرارداد میں نیشنل کانفرنس کو اس بات کی ہدایت کی تھی کہ وہ ریاست سے متعلق تمام تر اہم معاملات کو طے کرنے اور ریاست کا آئین بنانے کے لئے دستور ساز اسمبلی طلب کرے۔ جنرل کونسل کی اس واضح ہدایت کے مطابق عام انتخابات کے بعد ۱۳ ستمبر ۱۹۵۱ء کو ریاست کی مجلس دستور ساز عالم وجود میں آئی تھی۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو اس مجلس کا پہلا اجلاس منعقد ہوا تھا اور ۶ فروری ۱۹۵۲ء کو اس مجلس نے ہندوستان کے ساتھ ریاست جموں اور کثیر کے الحاق کی تصدیق اور توثیق کر دی تھی۔

پھر ان سطور کے مطالعہ سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ نپیت جواہر لال نہرو اور مسٹر محمد علی

کی ملاقات مئی ۱۹۵۵ء میں اس وقت ہوئی تھی جب ریاست جموں اور کشمیر کی مجلس دستور سازہ کو قائم ہوئے چار سال سے زیادہ اور اس کی طرف سے الحاق کے فیصلہ کی توثیق پر ایک سال سے زیادہ مدت گزر چکی تھی اور اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ پاکستان ان مقامات سے بے خبر نہیں تھا جن کے حصول اور تکمیل کے لئے کشمیر کی مجلس دستور سازہ کا قیام عمل میں لایا تھا اور مئی ۱۹۵۵ء کی ہندو، محمد علی ملاقات اور گفت و شنید کی تفصیلات میں ایسی کوئی بات نہیں ملتی جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکے کہ پاکستان ریاست کی مجلس آئین سازہ کے کاموں کی نوعیت سے بے خبر تھا۔ اس کے باوجود جیسا کہ مختلف ہتھاندوں سے ثابت ہو چکا ہے وہ استصواب رائے کے پڑانے منسوب کو بدلنے پر بھی رضا مند ہو گیا تھا لیکن وہ اپنے اس فیصلہ پر بھی قائم نہیں رہا تھا اور اس نے جولائی ۱۹۵۵ء میں ہندو نین کے وزیر داخلہ پنڈت پنٹ کی ایک تقریر کے بعض جملوں کو بہانہ بنا کر جن کا مطلب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ — ہندوستان، پاکستان کے ساتھ کشمیر کے سوال پر بات چیت کرتے ہوئے اپنے قدیم موقف کے مطابق ان حالات کو نظر انداز نہیں کر سکتا جواب تک روٹا ہوتا رہے ہیں — اس سمجھوتے کو بھی توڑ دیا تھا جو مئی ۱۹۵۵ء میں دو دونوں ملکوں کے وزراء اعظم کے درمیان ہوا تھا۔

اس کتاب میں کشمیر کے سوال کے پیدا ہونے اور طے نہ ہو سکے کی جو تاریخ بیان کی گئی ہے اس کی روشنی میں پاکستان کی طرف سے مئی ۱۹۵۵ء کے سمجھوتے کو توڑ دیا جانا کوئی اتفاقی بات نہیں کہی جاسکتی بلکہ ۱۹۵۶ء میں پاکستان کی حکومت اور اس کے رہنماؤں کی سرگرمیاں اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ پاکستان نے مئی ۱۹۵۵ء میں ہندوستان کے ساتھ جو سمجھوتہ کیا تھا وہ بھی پہلے تمام سمجھوتوں کی طرح توڑنے ہی کے لئے کیا گیا تھا۔ چنانچہ جولائی ۱۹۵۵ء میں مئی ۱۹۵۵ء کے سمجھوتے کو توڑ دینے کے بعد صدر اسکندر مرزا، وزیر اعظم محمد علی، پاکستانی پارلیمنٹ میں حزب اختلاف رپوزیشن کے رہنما مسٹر سہروردی اور دوسرے پاکستانی

رہنما کثیر کے سوال پر جن خیالات کا اظہار کرتے رہے ان سے یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ وہ کسی ایسے سمجھوتے کے لئے تیار نہیں تھے جس کی بدولت ریاست جموں اور کثیر ان کے قبضہ میں نہ آ سکے۔ چنانچہ ۳۱ مارچ ۱۹۵۶ء کو پاکستانی پارلیمنٹ میں وزیراعظم مسٹر محمد علی نے جو تقریر کی تھی اس میں کہا تھا کہ

کثیر کے سوال کو بات چیت کے ذریعے سے حل کرانے کے تمام دروازے بند ہو گئے ہیں۔

اور حزب اختلاف کے رہنما مسٹر سہروردی نے کثیر کے سوال کو "قومی سوال" قرار دے کر

مسٹر محمد علی کے خیالات کی پوری پوری تائید کی تھی۔

۲۔ اپریل ۱۹۵۶ء کو صدر اسسٹنٹ رمرز نے لاہور میں ایک تقریر کرتے ہوئے حاضرین کو

یقین دلایا تھا کہ

کثیروں کا مفاد ہمارا مفاد ہے۔ ہم کسی حال میں بھی اسے نظر انداز نہیں کریں گے۔

مسٹر محمد علی نے ۲۰ اپریل ۱۹۵۶ء کو کراچی میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر اقوام متحدہ

کثیر کے سوال کو حل کرانے میں کامیاب نہ ہو سکی تو

کثیر میں لب و لہجہ برپا ہو جائے گی۔

لیکن پاکستان کی حکومت اور رہنماؤں نے ان خیالات کے اظہار ہی کو کافی نہیں سمجھا تھا بلکہ

۱۹۵۶ء کے آغاز میں ایک جانب تو پاکستان کی طرف سے کثیر کی سرحد پر مسلح چھڑپیں شروع

ہو گئی تھیں اور دوسری طرف پاکستان کی حکومت نے مسٹر سہروردی کو مغربی ملکوں میں ہندوستان

کے خلاف پروپیگنڈا کے لئے بھیج کر باہمی بات چیت کے ذریعے سے اس سوال کو حل کرنے کا

دروازہ بند کر دیا تھا اور یورپ کے اس دورے میں مسٹر سہروردی نے

1-2. Times of Karachi 1.4.56

3. " " 3.4.56

4. " " 26.4.56

یوگو سلاویہ، اسپین، پرتگال، فرانس، جرمنی، سوئٹزرلینڈ، اٹلی اور برطانیہ

کے رہنماؤں اور حکومت کے ارکان سے مل کر کشمیر کے معاملہ میں انھیں اپنا

ہم خیال بنانے کی کوشش کی جتی ہے۔

اور یہ بات ظاہر ہے کہ پاکستان کی حکومت اور اس کے رہنماؤں کی یہ تمام تر سرگرمیاں

اس بنا پر تھیں کہ وہ ہندوستان کے ساتھ براہ راست بات چیت کا دروازہ بند کر کے کشمیر کے

سوال کو ایک مرتبہ پھر اقوام متحدہ میں پیش کرنا چاہتے تھے۔

جون ۱۹۵۶ء میں جب لندن میں وزراء اعظم دولت مشترکہ کی کانفرنس منعقد ہوئی تو

پینڈت ہنر اور مسٹر محمد علی کے درمیان غیر رسمی طریقہ سے کشمیر کے سوال پر بھی بات چیت ہوئی۔ لیکن

چونکہ پاکستان اس سوال کو ایک مرتبہ پھر اقوام متحدہ میں لے جانے کا فیصلہ کر چکا تھا اس لئے اس

بات چیت کا بھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا۔ چنانچہ انھوں نے نہ صرف اس سوال کو از سر نو

اقوام متحدہ میں پیش کرنے کے فیصلہ کا اعلان نہیں کر دیا بلکہ اقوام متحدہ پر دباؤ ڈالنے کے لئے

یہ اعلان بھی کیا کہ

”اٹنڈہ پاکستان کی خارجہ پالیسی کشمیر کے سوال پر مبنی رہے گی۔“

اور ۱۴ اگست ۱۹۵۶ء کو انھوں نے پاکستان کے نوین یوم آزادی کے موقع پر ایک عام جلسہ

میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ

”میں کشمیر کے سوال کو اقوام متحدہ میں لے جانے ہی پر اکتفا نہیں کروں گا بلکہ اس

سلسلہ میں میں نے جو دھڑے کئے ہیں انھیں پورا کرنے کے لئے خواہ کوئی راستہ بھی

کیوں نہ اختیار کرتا پڑے میں اسے ضرور اختیار کروں گا۔ اگر ضرورت پیش آئے گی

1. Dawn, Karachi 12.5.56

2. Times of Karachi, Karachi 14.7.56

تو میں اس مقصد کے لئے اپنی جان بھی قربان کر دوں گا اور وقت آتے پر

آپ مجھے صفتِ اول میں کھڑا ہوا پائیں گے۔ لے

اسی تقریر میں انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ

ہم محسوس کرتے ہیں کہ کشمیر کے بغیر پاکستان کی آزادی مکمل نہیں ہو سکتی۔ لے

اگست ۱۹۵۶ء کے انتخابات کی بدولت پاکستان میں مسلم لیگ کی حکومت کی بجائے عوامی لیگ کی حکومت قائم ہو گئی تھی اور مسٹر محمد علی کی جگہ مسٹر حسن ہشید سہروردی پاکستان کے وزیر اعظم مقرر ہوئے تھے اور انھوں نے اکتوبر میں لاہور میں ایک تقریر کرتے ہوئے پاکستان کے باشندوں کو دعوت دی تھی کہ

انھیں کشمیر کو آزاد کرانے کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہیئے۔ لے

اور ٹائمز آف کراچی کی ایک اطلاع کے مطابق جب مسٹر سہروردی اکتوبر ۱۹۵۶ء میں کشمیر کے متعلق تمام سیاسی پارٹیوں کو ایک زاویہ نظر پر متفق الرائے بنانے کے لئے کوشش کر رہے تھے تو یہ بات لے سبھی گئی تھی کہ

ہندوستان کے ساتھ براہ راست بات چیت کا کوئی امکان باقی نہیں رہا ہے۔ لے

پھر اسی قدر نہیں بلکہ اس زمانہ میں کشمیر کے متعلق پاکستان نے ہندوستان کے خلاف جو رویہ اختیار کیا تھا اس کا اندازہ اس بات سے اچھی طرح لگایا جاسکتا ہے کہ پاکستان کے وزیر خارجہ مسٹر فیروز خان لون نے کشمیر کے سلسلہ میں ایک بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ

ہندوستان فرانس کے ساتھ کشمیر اور الجزائر کے سلسلہ میں سودا بازی کرنے کی

-
1. Civil & Military Gazette, Lahore 15.8.50
 2. Times of Karachi, Karachi, 16.8.50
 3. Indian Express, Delhi 6.10.56
 4. Times of Karachi 10.10.56

موشیوں کو رہا ہے۔

ان کے اس بیان کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان انگریزوں کی حکومت کی تائید کے لئے تیار ہے بشرطیکہ فرانس کشمیر کے سوال پر ہندوستان کے موقف کی تائید پر تیار ہو جائے اور مسٹرون کے اس بیان سے یہ بات بالکل ہی واضح ہو جاتی ہے کہ پاکستان اس سلسلہ میں ہندوستان کے ساتھ نہ تو کوئی بات سمیت کرنا چاہتا تھا اور نہ وہ کوئی باعزت سمجھوتہ کرنے ہی کے لئے تیار تھا اور جیسا کہ آئندہ واقعات سے معلوم ہو سکے گا اس مرحلہ پر پاکستان کا منصوبہ یہ تھا کہ کشمیر کے سوال کو از سر نو مجلس تحفظ میں پیش کر کے جس طرح بھی ہو سکے اقوام متحدہ کی فوج کے لئے کشمیر میں داخلہ کی راہ ہموار کر لے۔

ایک طرف تو پاکستان کسی ایسے سمجھوتہ کے لئے تیار نہیں تھا جس کی رو سے اُسے ریاست جموں اور کشمیر پر قبضہ کرنے کا موقع نہ مل سکے اور دوسری طرف اس مسئلہ کے متعلق اقوام متحدہ کی روش نے ریاست کے باشندوں کی اس توقع کو مایوسی میں بدل دیا تھا کہ وہ اقوام متحدہ کے توسط سے ہندوستان کے ساتھ ریاست کے الحاق کی تصدیق کر سکیں گے اس لئے انھوں نے جو مجلس امین ساز منتخب کی تھی اس نے ۱۷ نومبر ۱۹۵۴ء کو ریاست کے لئے اس آئین کی منظوری کا اعلان کر دیا جس کی ترتیب کے لئے اس کا انتخاب کیا گیا تھا اور اس طرح اس بات کی تصدیق مزید کر دی کہ

اکتوبر ۱۹۵۴ء میں ہندوستان کے ساتھ ریاست جموں اور کشمیر کا جو الحاق کیا گیا تھا وہ جائز اور ریاست جموں اور کشمیر ہندوستان کا ایک لازمی ملک حصہ ہے۔

1. Tribune, Ambala Cantt. 22.11.56

۱۷ نومبر ۱۹۵۴ء (اردو ترجمہ) صفحہ ۱۷۰ دہلی کے ڈائریکٹ آف انفارمیشن جموں و کشمیر

یہ حالات تھے جو ۱۹۵۵ء کے وسط سے شروع ہو کر ۱۹۵۶ء کے اواخر تک قائم رہے تھے۔ ان کے مطالعہ سے یہ اندازہ کر لینا کچھ مشکل نہیں کہ اس زمانہ میں بھی پاکستان کا رویہ غیر مصالحانہ ہی نہیں بلکہ معاندانہ ہی رہا تھا اور ان ہی حالات کی بنا پر ۱۹۵۷ء کے آغاز میں پاکستان کی تحریک پر ایک مرتبہ پھر کشمیر کا سوال مجلسِ تحفظ میں زیرِ بحث آیا تھا۔

تیرھواں باب

ہندوستان کے موقف کی تصدیق اور استصواب رائے کا سوال

گزشتہ باب میں یہ بات تفصیل کے ساتھ بتائی جا چکی ہے کہ دسمبر ۱۹۵۲ء میں کشمیر کے سوال پر مجلس تحفظ میں بحث ہونے کے بعد سے ۱۹۵۶ء کے اواخر تک ایک طرف تو پاکستان یا اسی بات چیت کے ذریعہ سے اس سوال کو حل کرنے کے سلسلے میں برابر گریز کرتا اور اپنے تمام وعدوں اور سمجھوتوں کو توڑتا رہا تھا، دوسری طرف خود کشمیر کے باشندے اپنی تعمیر اور ترقی کئے جے پین تھے اور وہ الحاق کے متعلق اقوام متحدہ کے فیصلہ کے انتظار میں تعمیر اور ترقی کے راستے پر آگے بڑھنے کو طوعی رکھنا نہیں چاہتے تھے اور تیسری جانب نو سال کی اس مدت میں بین الاقوامی طاقتوں کے توازن میں زبردست تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں اور چون کہ ہندوستان ابتداء ہی سے اس بات کا اعلان کرتا رہا تھا کہ وہ کشمیر کے متعلق کوئی بات چیت کرتے ہوئے ان کے لئے واقفیت اور حالات کو نظر انداز نہیں کر سکتا اس لئے وہ ۱۹۵۶ء کے اواخر میں بھی اپنے اسی موقف پر قائم تھا۔

ان حالات میں جب جنوری ۱۹۵۷ء میں یہ سوال از سر نو مجلس تحفظ میں پیش کیا گیا تو پاکستان کے اس وقت کے وزیر خارجہ مسٹر فیروز خان نون نے کشمیر کے سوال کے لئے نہ ہونے

کا تمام تر الزام ہندوستان پر عائد کرتے ہوئے اس بات کا مطالبہ کیا کہ کشمیر کے مستقبل کے فیصلہ کے لئے وہاں استصواب رائے گرایا جائے۔

اس بحث کے دوران میں ہندوستانی وفد کے قائد سر کرشنا مینن نے جو طویل تاریخی تقریر کی تھی وہ کشمیر کے مسئلہ پر آخری اور مستند دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے لیکن جن بین الاقوامی رجحانات کی بدولت مجلس تحفظ پچھلے دو سال تک اس سوال کو طے کرنے سے قاصر رہی تھی ان ہی رجحانات کے ممانعت اس نے ۲۶-جوزی ۱۹۵۷ء کو اپنی وہ قرارداد بھی منظور کی تھی جو ”فرینڈز ریفرنڈمیشن اور کشمیر“ کے نام سے موسوم ہے۔ یہ قرارداد امریکہ، برطانیہ، آسٹریلیا، کولمبیا اور کیوبا نے متفقہ طور پر پیش کی تھی اور سوویت یونین کی عدم موجودگی میں عراق، فرانس، نیشنلٹ چین، فلپائن اور سوئیڈن کے اتفاق رائے سے منظور ہوئی تھی لیکن ہندوستان نے اسے قبول نہیں کیا تھا۔ اس قرارداد کا مقصد یہ ہے کہ مجلس تحفظ

کشمیر کے تنازعہ پر ہند اور پاکستان کے مندوبین کے بیانات سننے کے بعد متعلقہ حکومتوں اور حاکم کو وہ اصول یاد دلاتے ہوئے جو اس نے (مجلس تحفظ نے) اپنی ۲۱-اپریل ۱۹۵۷ء، ۲۱ جون ۱۹۵۷ء، ۱۷ ستمبر ۱۹۵۰ء اور ۳ مارچ ۱۹۵۰ء کی قراردادوں میں منضبط کیے تھے۔ نیز اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہند اور پاکستان کی ان قراردادوں کو یاد دلاتے ہوئے جو اس نے ۱۱-اگست ۱۹۵۸ء اور ۱۹ جنوری ۱۹۵۹ء کو منظور کی تھیں اور جن کا مقصد یہ تھا کہ ریاست جموں اور کشمیر کا آخری فیصلہ عوام کی رائے سے ایسے آزادانہ اور غیر جانبدارانہ استصواب رائے کے ذریعہ سے ہوگا جو ادارہ اقوام متحدہ کی نگرانی میں گرایا جائے گا اپنی اس توثیق

کی مزید تفصیلی کرتی ہے جو اس نے اپنی - ۳۰ مارچ ۱۹۵۱ء کی قراردادیں
کی تھی اور اعلان کرتی ہے کہ — آل جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس کی سفارش
پر مجلس دستور ساز کی طبعی اور اس کا کوئی اپنا اقدام جو اس نے پوری ریاست
یا اس کے کسی حصہ کے مستقبل کی تشکیل اور وابستگی کے لئے کیا ہو یا اسٹاپ کرنے
کی کوشش کرے یا متعلقہ فریقیتیں میں سے کسی فریق کی طرف سے اس مجلس آئین ساز
کے ایسے اقدام کی تائید میں کیا ہوا اقدام مذکورہ بالا اصول کے مطابق ریاست
کے متعلق آخری فیصلہ نہیں سمجھا جائے گا۔

اور اسی مرتبہ سمیت کے خاتمہ پر مجلس تحفظ نے ۲۰ فروری ۱۹۵۷ء کو یہ قرارداد بھی منظور

کی تھی کہ وہ

ہند اور پاکستان کے درمیان کشمیر کے سوال پر اپنی ۲۴ جنوری ۱۹۵۷ء کی
قرارداد اپنی سابقہ قراردادوں اور اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہند اور
پاکستان کی قراردادوں کو پیش منظر رکھتے ہوئے ۱۱، مجلس کے صدر سویڈن کے
ہندوستان سے درخواست کرتی ہے کہ وہ مجلس تحفظ اور اقوام متحدہ کے کمیشن برائے
ہند اور پاکستان کی قراردادوں کا لحاظ رکھتے ہوئے ہند اور پاکستان کی حکومتوں
کے ساتھ مل کر ایسی تجاویز پر غور کریں جو اس تنازعہ کو طے کرانے میں مدد
سکتی ہوں۔ وہ اس مقصد کے لئے برصغیر ہندوستان اور زیادہ سے زیادہ
۱۵۔ اپریل ۱۹۵۷ء تک مجلس کے صورت حال سے مطلع کریں (۲۰) مجلس تحفظ
ہند اور پاکستان کی حکومتوں کو دعوت دیتی ہے کہ وہ اس سلسلہ میں ان کے
ساتھ تعاون کریں اور (۳) سیکرٹری جنرل نیز اقوام متحدہ کے لئے مامور

ہند اور پاکستان کے مندوبین سے درخواست کرتی ہے کہ وہ انہیں پیش آنے والی ضرورتوں میں ہر ممکن مدد دیں۔

ہندوستان نے مجلس تحفظ کی اس قرارداد کو بھی منظور نہیں کیا تھا لیکن اس نے مجلس تحفظ کے نمائندہ مسٹر گنزیارنگ کو ان کے کام میں ہر ممکن مدد دی تھی اور انہوں نے برصغیر ہند آنے اور حالات کا جائزہ لینے کے بعد اپنی رپورٹ میں ہندوستان کے اس موقف کی تائید کی تھی کہ ۱۹۵۷ء کے مقابلہ میں ۱۹۵۷ء کے حالات بہت زیادہ بدل چکے ہیں اور یہ کہ کشمیر کے سوال کے کسی فیصلہ میں بھی ان نئے حالات کو متناظر نہیں کیا جاسکتا لیکن مسٹر گنزیارنگ کی رپورٹ کو پیش کرنے سے پہلے اس بات پر غور کر لینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۵۷ء کے آغاز میں مسٹر فیروز خان نے کشمیر کے مسئلہ کو جس انداز میں مجلس تحفظ کے روبرو پیش کیا تھا کیا وہ حقائق پر مبنی تھا اور مجلس تحفظ نے کشمیر سے متعلق ہم ۲۔ جنوری ۱۹۵۷ء کو جو قرارداد منظور کی تھی کیا وہ کشمیر کی صورت حالات کی صحیح نمائندگی کرتی تھی۔

پاکستان، کشمیر میں استصواب رائے کا جو ملے بہ کرتا رہا ہے وہ اسے اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہند اور پاکستان کی ان دو قراردادوں پر مبنی قرار دیتا ہے جو اس کمیشن نے ۱۳۔ اگست ۱۹۴۸ء اور ۵۔ جنوری ۱۹۴۹ء کو منظور کی تھیں۔ ان قراردادوں میں ۱۳۔ اگست ۱۹۴۸ء کی قرارداد کے حصہ (الف) کی دفعہ (۱) میں یہ غیر مبہم الفاظ موجود ہیں کہ ۱۔

پاکستان کی حکومت، ریاست سے اپنی افواج کو واپس بلا لینے پر رضامند ہے۔

اور اسی قرارداد کے حصہ (ب) میں یہ تشریحات موجود ہیں کہ

(۱) جب اس بات کا اطمینان ہو جائے گا کہ قرارداد کے حصہ (ب) کی تعمیل

ہو چکی ہے اور پاکستانی افواج ریاست سے واپس جا رہی ہیں تو حکومت ہند

بھی اپنی بیشتر افواج کو ریاست سے واپس بلائے گی اور افواج کی یہ تبدیلی دہائی

کمیشن کے اتفاق رائے سے عمل میں آئے گی۔ اور

(۲) جب تک کشمیر کے سوال کو طے کرنے کی آخری شرطیں منظور نہیں کر لی جائیں گی

اس وقت تک حکومت (ہند) خط جنگ بندی کے اندر کمیشن کے اتفاق رائے

سے نظم و نسق برقرار رکھنے کی غرض سے مقامی حکام کو مدد دینے کے لئے اپنی

کم سے کم افواج ریاست میں رکھے گی۔

پھر اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہند اور پاکستان نے ۵۔ جنوری ۱۹۴۹ء کو جو قرارداد منظور

کی تھی اور جسے ۱۳۔ اگست ۱۹۴۹ء کی قرارداد کے فیصلہ کی حیثیت دی گئی تھی اس کی دفعہ (۲)

میں صاف طور پر کہا تھا کہ

استصواب رائے اس وقت کرایا جائے گا جب کمیشن کو اس بات کا اطمینان

ہو جائے گا کہ اس کی منظور کی ہوئی ۱۳۔ اگست ۱۹۴۹ء کی قرارداد کے حصہ اول

اور دوم میں جنگ بندی اور عارضی مسلح کے لئے جو تجاویز طے کی گئی ہیں ان پر عملدرآمد

ہو چکا ہے۔

اسی قرارداد کی دفعہ ۳۔ (الف) اور (ب) میں یہ تجویز بھی موجود ہے کہ

اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل، کمیشن کے اتفاق رائے سے ناظم استصواب رائے

کو نامزد کریں گے لیکن اس کارروائی تقریر قبول اور کشمیر کی حکومت کی طرف سے کیا

جائے گا اور ناظم استصواب رائے کو اس کے فرائض کی انجام دہی کے لئے جن

اختیارات کی ضرورت محسوس ہوگی وہ اختیارات بھی اسے 'ریاست قبول اور کشمیر

ہی دے گی۔

مذکورہ بالا قراردادوں کے علاوہ، ڈاکٹر گراہم نے ستمبر ۱۹۵۱ء میں ہوتا جاپوز مرتب

کی تعمیل ان میں سے ساتویں تجویز کا خلاصہ یہ ہے کہ

قبائلی اور وہ پاکستانی جو ریاست جموں اور کشمیر کے باشندے نہیں ہیں اور صرف

راڈی کی غرض سے وہاں آئے ہیں واپس چلے جائیں گے۔ پاکستانی افواج کو ریاست

سے واپس بلالیا جائے گا (برائے نام) آزاد کشمیر کی فوجوں کو وسیع پیمانہ پر غیر مسلح

اور منتشر کر دیا جائے گا اور ہندوستان اپنی بیشتر افواج کو واپس بلا لے گا۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان نے، اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہند اور پاکستان

کی ۱۳- اگست ۱۹۴۷ء اور ۵- جنوری ۱۹۴۹ء کو منظور کی ہوئی قراردادوں کو منظور کر لیا تھا۔

لیکن انہیں منظور کرتے ہوئے اس نے کمیشن پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ ہندوستان کی طرف سے

ان کی منظوری، ان کی درست توضیح اور تشریح پر منحصر ہے اور انہیں منظور کرتے ہوئے اس

نے یہ شرائط پیش کی تھیں کہ

(۱) کشمیر کا جو علاقہ پاکستان کے قبضہ میں ہے اس پر ریاست جموں اور کشمیر (کی حکومت)

کی بالادستی کو تسلیم کیا جائے گا اور اس علاقہ کو خالی کر دیا جائے گا۔

(۲) ہندوستانی افواج کو جن مرحلوں پر ریاست سے واپس بلایا جائے گا وہ مرحلے

حکومت ہند اور کمیشن کے باہمی مشورہ سے طے کئے جائیں گے اور اس معاملہ سے

پاکستان کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔

(۳) پوری ریاست (مقبوضہ اور غیر مقبوضہ کشمیر) کو تمام بیرونی مملوں سے محفوظ

اور اس کے داخلی امن کو برقرار رکھنے کی تمام ترقی دہ دہی خود ریاست جموں

اور کشمیر پر غائد ہوئی۔

(۴) استصواب رائے کا سوال، حکومت ہند اور استصواب رائے کے حکام آپس میں طے کریں گے اور اس معاملہ میں پاکستان کی رائے کو فی دخل حاصل نہ ہوگا اور

(۵) استصواب رائے کرانے کے لئے پاکستان کو پورا من فضا قائم رکھنی پڑے گی۔

اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہند اور پاکستان کی ۱۳- اگست ۱۹۴۷ء اور ۵- جنوری ۱۹۴۹ء کی قراردادوں اور ان دونوں قراردادوں کو تسلیم کرنے کے لئے ہندوستان کی طرف سے پیش کی ہوئی واضح شرائط اور ڈاکٹر گراہم کی تجاویز کی روشنی میں مسٹر فیروز خان لون کی تقریر کا جائزہ لینے کے بعد اس سے علاوہ اور کوئی نتیجہ برآمد نہیں کیا جاسکتا کہ انھوں نے اپنی تقریر کے ذریعہ سے مجلس تحفظ کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے کی کوشش کی تھی۔ ورنہ جہاں تک حقائق کا تعلق ہے وہ یہ ہیں کہ اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہند اور پاکستان نے اپنی ۱۳- اگست ۱۹۴۷ء اور ۵- جنوری ۱۹۴۹ء کی قراردادوں میں پاکستان کو اس بات کی ہدایت کی تھی کہ وہ ریاست جموں اور کشمیر سے اپنی افواج کو واپس بلا لے اور (برائے نام) آزاد کشمیر کی افواج کو برٹس پیمانہ پر غیر مسلح اور منتشر کر دیا جائے۔ اس نے ہندوستانی فوج کی ایک مناسب تعداد کو ریاست میں مقیم رکھنے کے حق کو تسلیم کیا تھا اور ناظم استصواب رائے کے رسمی تقریریں اسے تفویض اختیارات کا حق ریاست یعنی ریاستی حکومت کو دے کر ریاست جموں اور کشمیر کی قانونی حیثیت پر بھی تصدیق کی مہر لگا دی تھی۔ پھر کمیشن نے ہندوستان کی پیش کی ہوئی شرائط کو منظور کر کے اس امر کی مزید تصدیق بھی کر دی تھی کہ (برائے نام) آزاد کشمیر ریاست جموں اور کشمیر کا ایک لاینفک حصہ ہے۔ استصواب رائے سے پہلے اس کا انخلا

فوری ہے اور ریاست کے داخلی نظم و نسق و تحفظ کے معاملہ اور استصواب رائے کے سلسلہ میں پاکستان کو مداخلت کا کوئی حق نہ ہوگا۔ اب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ خود پاکستان نے اپنی ان بین الاقوامی ذمہ داریوں کو کس حد تک پورا کیا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ جنگ بندی کے بعد قبائلی حملہ آور واپس چلے گئے تھے لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ جنگ بندی کے بعد یہ حملہ آور کسی طرح بھی ریاست جموں اور کشمیر میں مقیم نہیں رہ سکتے تھے اور خود پاکستان انھیں اپنے علاقوں میں مقیم رہنے کی اجازت دے کر اپنے اقتصادی وسائل کو زبردبار نہیں کر سکتا تھا۔ اسی طرح پاکستانی افواج بھی جنگ بندی کے بعد ریاست جموں اور کشمیر سے واپسی پر مجبور تھیں لیکن جہاں تک ریاست نام آزاد کشمیر کا تعلق تھا۔ پاکستان نے اسے خالی نہیں کیا تھا بلکہ اسے ایک الگ حصہ بنالیا تھا۔ اس کی افواج میں برابر اضافہ کیا جاتا رہا تھا اور استصواب رائے کے لئے پُر امن فضا قائم رکھنے کی بجائے پاکستان اس تمام مدت میں کشمیر کے سوال پر جہاد اور جنگ کے رجحانات کو بھی تقویت دیتا رہا تھا اور اس طرح وہ خود اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہند اور پاکستان کی منظور کردہ قراردادوں کی خلاف ورزی اور اپنی بین الاقوامی ذمہ داریوں کو پورا کرنے سے گریز کرتا رہا تھا۔ اور اس نے اپنی ان ہی خلاف ورزیوں اور بین الاقوامی ذمہ داریوں کو پورا کرنے سے اپنے اسی گریز پر پردہ ڈالنے کے لئے کشمیر کے معاملہ میں اقوام متحدہ کو براہ راست مداخلت کرنے کی دعوت دی تھی۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے وہ اس وقت تک بھی کشمیر سے متعلق اپنی بین الاقوامی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے تیار تھا لیکن جس طرح وہ پہلے نو سال میں برابر اپنے ابتدائی موقف پر قائم رہا تھا اسی طرح وہ اس وقت بھی اپنے اس موقف کو ترک کر دینے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے اس تنازعہ کے کسی مرحلہ میں بھی پاکستان کو اس تنازعہ کا ایک

معاویہ فریق تسلیم نہیں کیا تھا۔ اس نے کسی موقع پر بھی ریاست کی حکومت کی قانونی خود مختار حیثیت سے انکار نہیں کیا تھا اور وہ ریاستی حکومت کے کسی فیصلہ اور اقدام کی راہ میں حائل ہونا نہیں چاہتا تھا اور وہ کسی ایسی تجویز کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتا تھا جس میں اس کے موقف اور ان اصولوں کو نظر انداز کیا گیا ہو جو اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہند اور پاکستان نے اپنی ۱۳- اگست ۱۹۵۷ء اور ۵- جنوری ۱۹۵۷ء کی قراردادوں میں منضبط کئے تھے اور چونکہ مجلس تحفظ نے ۲۴- جنوری ۱۹۵۷ء کو جو قرارداد منظور کی تھی اسے منظور کرتے ہوئے مجلس نے کشمیر کے تنازعہ میں پاکستان کے اس تمام رویہ کو نظر انداز کر دیا تھا جس پر وہ کمیشن کی مذکورہ بالا قراردادوں کے بعد بھی قائم رہا تھا اور اس کی منظور کردہ یہ قرارداد ہندوستان کے موقف کے خلاف بھی تھی اس لئے ہندوستان نے اسے تسلیم نہیں کیا تھا۔

اس موقع پر پاکستان نے سب سے زیادہ زور اس بات پر دیا تھا کہ ہندوستان نے پاکستان اور امریکہ کے فوجی معاہدہ کو بہانہ بنا کر استصواب لائے کرانے سے انکار کر دیا ہے لیکن جیہا کہ بتایا جا چکا ہے ہندوستان ابتداء ہی سے اپنے اس موقف پر قائم رہا ہے کہ وہ اس سوال کے فیصلہ کے وقت بدلے ہوئے حالات کو نظر انداز نہیں کرے گا۔

اس لئے قابلِ غور بات یہ ہے کہ ہندوستان کشمیر کے سلسلہ میں اپنے جس مذکورہ بالا موقف پر قائم رہا ہے اسے بین الاقوامی ناویہ نظر سے حق بجانب اور درست قرار دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اور معاملہ کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے ۸- فروری ۱۹۵۷ء کو مسٹر کرشنا مینن نے مجلس تحفظ میں جو کچھ کہا تھا اس سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ کشمیر کے سلسلہ میں ہندوستان نے اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہند اور پاکستان کی جن قراردادوں کو منظور کیا تھا اگر وہ ان کی منظوری کو بعض واضح شرائط اور اس وضاحت کے ساتھ مشروط نہ بھی کر دیتا کہ وہ ان پر عمل درآمد کے معاملہ میں بدلے ہوئے حالات کو مد نظر رکھے گا تب

بھی وہ بدلے ہوئے حالات میں ان پر عمل دنا کو ملتوی کر دینے میں خفیہ بجانب تھا۔

چنانچہ مسٹر کرشنا مینن نے مجلس تحفظ کے روبرو بین الاقوامی قانون کے امریکی ماہر مسٹر ہال کے یہ پہلے پیش کردہ تھے کہ

کسی معاہدہ میں شریک کوئی قریبی بھی ان حالات کے علاوہ جو معاہدہ میں شرکت کے وقت موجود ہوں، دوسرے (یعنی بدلے ہوئے) حالات میں معاہدہ کی شرائط کی پابندی کو لازمی قرار نہیں دے سکتا۔ دوسرے الفاظ میں معاہدہ اسی وقت تکمیل کی پابندی سے آزاد ہو جاتا ہے جب کوئی ایسی اضافی صورت حال پیدا ہو جائے جو معاہدہ کی بنیادی قوت پر اثر انداز ہو کر اسے تبدیل کر دے۔

پھر موصوف نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر مسٹر روز ویلٹ آنجہانی کا وہ بیان بھی مجلس کے روبرو پیش کیا تھا جو انھوں نے ۹۔ اگست ۱۹۴۷ء کو دیا تھا اور جس میں انھوں نے بعض معاہدوں کو ملتوی اور تکمیل کی پابندیوں سے آزاد قرار دینے کے اسباب بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ

پہلے کہ وہ حالات جن کے پیش معاہدہ ہوا تھا یا تو قطعاً تبدیل چکے ہیں یا ان میں جزوی طور پر تبدیلی آچکی ہے اور (موجودہ حالات میں) معاہدہ کی تکمیل سے حملہ کے شکار (ان) لوگوں کو نقصان پہنچے گا جن کی مدد کرنا امریکہ کا فرضِ اولیٰ ہے۔ پھر معاہدہ کا اصل مقصد بھی یہ ہی ہے کہ اس میں جن حالات کا ذکر کیا جائے ان میں قائم رہنا چاہیے۔

اور مسٹر کرشنا مینن ایک اور ممتاز ماہرِ قانون مسٹر اوپن ایم کی یہ رائے بھی پیش کی تھی کہ

۱۔ مسئلہ کشمیر۔ کے کرشنا مینن کی مکمل تقریر (ترجمہ اردو ماسٹری کونسل میں - صفحہ ۷۷۸)

۲۔ مسئلہ کشمیر۔ وی کے کرشنا مینن کی مکمل تقریر (ترجمہ اردو) صفحات ۷۷۸ تا ۸۱۱۔

حالات میں بنیادی تبدیلی اس نوعیت کی (بھی) ہو سکتی ہے کہ (کسی معاہدہ کا) ایک فریق ایسے معاہدہ کی ذمہ داریوں سے گلو خلاصی کی درخواست کرے جو ایک طرف فیصلہ سے ختم نہ کیا جاسکتا ہے بہت سے اہل قلم حالات کے بدل جانے پر معاہدوں کے ناکارہ ہو جانے کے اصول کو تسلیم کرتے ہیں اور زور دے کر کہتے ہیں کہ تمام معاہدے وقتی حالات کے مطابق ہوتے ہیں ہر معاہدہ اس شرط کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے کہ اگر حالات میں بنیادی تبدیلی کے بدولت معاہدہ سے متعلق ذمہ داریوں کی ادائیگی کسی فریق کی اہم ترقی کے لئے تباہ کن معلوم ہو تو اس فریق کو یہ حق حاصل ہونا چاہیئے کہ وہ متعلقہ ذمہ داریوں سے گلو خلاصی کی درخواست کرے کئی ملکوں کے قوانین بھی اس اصول کو تسلیم کرتے ہیں کہ اگر حالات کی تبدیلی کی وجہ سے کسی معاہدہ کی تعمیل ناممکن ہو جائے تو اس معاہدہ کو منسوخ یا فریق متعلقہ کو اس پر عمل کرنے کی پابندی سے آزاد کر دیا جائے۔

مذکورہ بالا حوالوں میں معاہدوں پر حالات کی تبدیلی کے اثرات کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے۔ وہ نظریات اور اصول ہیں تاکہ محدود نہیں بلکہ اس پر عمل درآمد بھی کیا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ مسٹر کرشنا مینن نے اس پر عمل درآمد کی مثالیں پیش کرتے ہوئے بتایا تھا کہ جنوری اور فروری ۱۹۵۷ء میں جرمنی کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے برطانیہ، فرانس، امریکہ اور سوویت یونین کے وزراء خارجہ کی جو کانفرنس برلن میں منعقد ہوئی تھی اس میں سرانقہونی ایڈلر، موسیو بید و مسٹر جان فوسٹر ڈلز اور مسٹر مولوتوف نے اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ

پوسٹلیم کے معاہدے کے نئی نکتہ بعد از وقت ہو چکے ہیں۔

۱۔ ۲۔ ۳۔ ۴۔ ۵۔ ۶۔ ۷۔ ۸۔ ۹۔ ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵۔ ۱۶۔ ۱۷۔ ۱۸۔ ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱۔ ۲۲۔ ۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵۔ ۲۶۔ ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱۔ ۳۲۔ ۳۳۔ ۳۴۔ ۳۵۔ ۳۶۔ ۳۷۔ ۳۸۔ ۳۹۔ ۴۰۔ ۴۱۔ ۴۲۔ ۴۳۔ ۴۴۔ ۴۵۔ ۴۶۔ ۴۷۔ ۴۸۔ ۴۹۔ ۵۰۔ ۵۱۔ ۵۲۔ ۵۳۔ ۵۴۔ ۵۵۔ ۵۶۔ ۵۷۔ ۵۸۔ ۵۹۔ ۶۰۔ ۶۱۔ ۶۲۔ ۶۳۔ ۶۴۔ ۶۵۔ ۶۶۔ ۶۷۔ ۶۸۔ ۶۹۔ ۷۰۔ ۷۱۔ ۷۲۔ ۷۳۔ ۷۴۔ ۷۵۔ ۷۶۔ ۷۷۔ ۷۸۔ ۷۹۔ ۸۰۔ ۸۱۔ ۸۲۔ ۸۳۔ ۸۴۔ ۸۵۔ ۸۶۔ ۸۷۔ ۸۸۔ ۸۹۔ ۹۰۔ ۹۱۔ ۹۲۔ ۹۳۔ ۹۴۔ ۹۵۔ ۹۶۔ ۹۷۔ ۹۸۔ ۹۹۔ ۱۰۰۔

اور ان تمام حوالوں کے بعد اس بات کا فیصلہ کرنا باقی رہ جاتا ہے کہ کیا واقعی ان حالات میں کوئی تبدیلی رونما ہوئی تھی جن میں ہندوستان نے اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندوستان پاکستان کی ۱۳۔ اگست ۱۹۴۷ء اور ۵۔ جنوری ۱۹۴۹ء کی قراردادوں کو منظور کیا تھا؟

اس معاملہ میں جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے وہ ان حالات میں رونما ہوتی رہنے والی ہر تبدیلی کے وقت مجلس تحفظ کو اس کی طرف توجہ دلانا رہا تھا لیکن اگر صاحب معاملہ ہونے کی حیثیت سے کچھ دیر کے لئے ہندوستان کی رائے کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تب بھی ہمارے سامنے وہ اعتراف موجود ہے جو حالات کے بدل جانے کے متعلق خود اقوام متحدہ کے نمائندے کرتے رہے ہیں۔ مثلاً اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہندوستان پاکستان نے اپنی عبوری رپورٹ کے پیراگراف ۲۴۹ میں لکھا ہے کہ

ایک لحاظ سے تو جوں کی دایلی کا سوال اس حقیقت پر مبنی ہے کہ ریاست کی لام بندی کو ختم کرنے کا سلسلہ جس کا ذکر کمیشن کی ۱۳۔ اگست ۱۹۴۷ء کی تجویز میں ہے موجودہ صورت حال کو ختم کرنے کے لئے ناکافی ہے۔ ریاست میں حالت بدل گئی ہے لیکن تجویز جوں کی توں ہے۔ ان حالات میں کمیشن نے ایک بار پھر یہ کوشش کی کہ تجویز کی شرطوں کو نوٹ سے بغیر کوئی سمجھوتہ ہو جائے لیکن حالات میں ہر تبدیلی جو پیش ہے اس کے پیش نظر اسے اندازہ ہوا کہ حکومت اس وقت پر جو اس کے موقف کے مطابق ہے وقف بحرف عمل کرنا چاہتی ہے۔

اور کمیشن نے اپنی اسی تیسری عبوری رپورٹ کے پیراگراف ۲۸۳ میں اعتراف کیا ہے کہ

تغیر پذیر اور متحرک حالات کی بدولت وہ توضیحات جو بہت دن پہلے کی تھیں سمجھوتہ کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہو رہی ہیں اور ۱۳۔ اگست ۱۹۴۷ء کی

لہذا شکہ کشیدہ وی۔ کے کرشنا مہین کی مکمل تقریر (ترجمہ اردو) سلامتی کونسل میں صفحات ۱۸۱-۱۸۲۔

تجویز کا دائرہ ریاست کے حقیقی (موجودہ) حالات کی روشنی میں تنگ ہو گیا ہے۔

لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ کمیشن نے اپنا کام ۱۹۵۳ء کے آغاز میں ختم کر دیا تھا اور اس نے اپنی جو رپورٹیں مجلس تحفظ کے روبرو پیش کی تھیں ان میں ان ہی تغیرات کی طرف اشارہ کیا گیا تھا جو اس وقت تک رونما ہو چکے تھے لیکن ۱۹۵۷ء کے آغاز میں بین الاقوامی حالات عالمی قوتوں کے توازن اور خود کشمیر کے حالات میں وہ اہم تبدیلیاں واقع ہو چکی تھیں جن کا تذکرہ گذشتہ باب میں کیا جا چکا ہے اور اگر ۱۹۵۳ء کے آغاز تک رونما ہونے والے واقعات کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہو سکتا تھا تو ان تبدیلیوں کو نظر انداز کرنا تو قطعاً ناممکن تھا جو ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۷ء کے آغاز تک ہوئی تھیں۔ چنانچہ جب مجلس تحفظ کی ۲۱۔ فروری ۱۹۵۷ء کی منظور کی ہوئی قرارداد کے مطابق مسٹر گریڈنگ نے برصغیر ہند آکر حالات کا جائزہ لیا تو انھیں غیر مبہم اور واضح الفاظ میں اس بات کا اعتراف کرنا پڑا کہ اس خطہ ارض میں فوجی اور سیاسی قوتوں کا توازن بدل گیا ہے اور یہ آج کے بدلے ہوئے حالات میں ان تجاویز پر عمل دینا ممکن نہیں ہو سکتا جو

نوسال پہلے منظور اور طے کی گئی تھیں۔

اور اس طرح مسٹر گریڈنگ نے بھی اس بات کی تصدیق کر دی کہ کشمیر کے سوال کے اٹھنے کے بعد سے ۱۹۵۷ء کے آغاز تک حالات میں جو تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں ان کے پیش نظر ۱۹۵۷ء کی تجاویز کے مطابق استصواب رائے کا اہتمام ممکن نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس باب کو ختم کرنے سے پہلے یہ بتادینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کسی مسئلہ اور

۱۔ مسئلہ کشمیر۔ وی۔ کے کرشنا مینن کی مکمل تقریر (ترجمہ اردو) سلامتی کونسل میں صفحات ۱۸۱-۱۸۲

۲۔ مسٹر گریڈنگ کی رپورٹ (خلاصہ)

معاملہ پر ہر وقت استصواب رائے نہ کرانے کے بعد استصواب سے دست بردار ہو جانے کا طریقہ بھی کوئی نیا طریقہ نہیں ہے۔ اور استصواب رائے کی تاریخ میں اس کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ چنانچہ مجلس تحفظ کے روبرو ملٹر کرشنا مینن نے معاملہ کے اس پہلو کی وضاحت بھی کر دی تھی اور بتایا تھا کہ ۱۹۲۱ء میں وہاں میں رائے شماری کی تجویز طے ہوئی تھی، نیز چلی اور پیرو کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا اس میں بھی ایک علاقہ کے سلسلہ میں استصواب رائے کا فیصلہ کیا گیا تھا لیکن چوں کہ یہ استصواب رائے بروقت نہیں کرایا جاسکا اس لئے مجلس اقوام کی کونسل کے لئے اپنے اس فیصلہ پر عمل درآمد کرنا ناممکن ہو گیا اور اسے یہ بات معلوم کرنے پر مجبور ہو جانا پڑا کہ کیا متعلقہ فریق واقعی استصواب رائے کے خواہش مند ہیں؟ اور یہ کہ اگر استصواب رائے ممکن نہ ہو سکے تو کوئی دوسرا اور موثر طریقہ کار دریافت کیا جائے۔ ان تمام واقعات قانونی نظریات اور ان کی وضاحتوں، نیز تاریخی مثالوں کی روشنی میں کشمیر اور اس کے ساتھ ہندوستان کے تعلق کا سوال بالکل صاف ہو جاتا ہے اور اسے نہایت سادہ اور مختصر الفاظ میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ

ہندوستان کے ساتھ ریاست جموں اور کشمیر کا الحاق ریاست کے حکمران نے رضا کارانہ طور پر اپنے اس حق اور اختیار سے کام لے کر کیا تھا جو قانون ہندو ملتان انھیں اپنی ریاست کو ہند اور پاکستان میں سے ایک ملک کے ساتھ ملحق کر دینے کے سلسلہ میں حاصل تھا اور انھیں اپنے اس فیصلہ میں کشمیر کی سب سے بڑی سیاسی تنظیم، نیشنل کانفرنس، اور اس کے تمام رہنماؤں کی جن میں شیخ محمد عبداللہ بھی شامل تھے کامل تائید اور حمایت حاصل تھی۔ یہ الحاق قطعی اور غیر مشروط تھا لیکن ہندوستان نے اپنے جمہوری نظریات کے ماتحت خود اس بات کی پیش کش کی تھی کہ وہ الحاق کی مرید تصدیق کے لئے حالات معقول ہو جانے

کے برائے انتصواب رائے کرے گا لیکن پچھلے بارہ سال کی مدت میں ایک جانب تو پاکستان کے مسلسل عہد شکنیوں کی بدولت حالات اعتدال پر نہیں آ سکے اور دوسری طرف ریاست کی مجلس دستور ساز نے نہ صرف اس الحاق کی توثیق ہی کر دی بلکہ ہندو نہیں کی دوسری ریاستوں کی طرح ریاست جموں اور کشمیر میں بھی دو عام انتخابات ہو چکے ہیں۔ پھر سرگزیدہ نگ کے الفاظ میں اس خطہ ارض میں فوجی اور سیاسی قوتوں کا توازن بھی بدل چکا ہے اور سرگودین مہم کی رائے کے مطابق کشمیر کے باشندوں کو یہ حق بھی پہنچا ہے کہ وہ اپنی اہم ترقیوں پر انتصواب رائے کے کھلے ہوئے نقصان رسالہ اثرات کے پیش نظر اس تجویز کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیں اور ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انتصواب رائے کے فیصلوں کو صرف اس بناء پر ترک کیا جاتا رہا ہے کہ ان کی تعمیل میں دیر ہوئی تھی اس لئے اگر آج کشمیر کے باشندے انتصواب رائے کی تجویز پر عمل کر سنے کے لئے تیار نہیں ہیں تو ہندوستان ان کے اس فیصلہ کے احترام پر مجبور ہے اور انتصواب رائے کے معاملہ میں ہندوستان پر یہ عہدہ اور وعدہ شکنی سہا کوئی الزام عائد نہیں کیا جاسکتا۔

تعلیٰ نامہ

صفحہ	سطر	تعلیٰ	صفحہ
۹	۱۴	اسوقی کما بعی	۱۰۰
۹	۲۰	تات رام	۱۰۲
۱۹	۱۱	دوشیزہ	۱۱۰
۹۴	فٹ نوٹ	The Nations	۱۱۴
۱۰۲	۲	نہیں جاسکتی	۱۱۶
۱۱۰	۱	ثابت ہو جاتی ہے	۱۲۴
۱۱۴	فٹ نوٹ	Kashmir	۱۲۸
۱۱۶	فٹ نوٹ	Kashmin	۱۳۴
۱۲۴	فٹ نوٹ	in the making	۱۳۸
۱۲۸	فٹ نوٹ	to Hari Singh	۱۴۱
۱۵۴	۵	حملہ آوروں سے	۱۵۸
۱۶۸	۱۱	مقدمات کی جماعت	۱۶۱
۱۶۱	۱۳	مسٹر باتوں	۱۶۳
۱۶۳	فٹ نوٹ	Alfredo Lozano	۲۱۲
۱۶۳	۳	حکومت کشمیر نے	۲۳۴
۲۱۲	۱۱	انخلا کو	۲۵۵
۲۳۴	۱۵	مقرعہ	۲۵۶
۲۵۵	۱۲	برخواستگی	۲۵۶
۲۵۶	۹	ریاستی طاقت	
۲۵۶	۱۰	غیر جانبدار...	
۲۶۱	فٹ نوٹ	Two Nations and Kashmir	
۲۶۱	۹	رسالہ لک	
۲۶۱	فٹ نوٹ	(Look)	
۲۸۸	فٹ نوٹ	Ambala	
۲۹۹	۱۸	مترکشنا بینین نے	

